اُٹھتے ہیں حجاب آخر

پروفیسر احمد رفیق اختر

اُٹھتے ہیں حجاب آخر

پروفیسر احمد رفیق اختر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

297.4 Ahmad Rafiq Akhtar, Prof.
Utathay Hain Hijab Akhar/ Prof.
Ahmad Rafiq Akhtar.- Lahore : Sang-e-
Meel Publications, 2004.
247pp.
1. Islam - Sufism. 1. Title.

2004
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1655-9

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

زمان ومکاں اور انسان

پروردگارِ عالم نے زمانے کو تقسیم کا آلہ کہا ہے بلکہ عرب میں مشہور روایت ہے الوقت شیف قاطع کہ وقت ایک کاٹتی ہوئی تلوار ہے۔ مقدراتِ زمان ومکاں اور اس میں تمام رنگ و روغن اس تقسیمی اوقاتِ لحات سے ہیں۔ ورنہ بحیثیت مجموعی تمام زندگی ایک عالم میں یکساں ہے۔ جب اس کو کاٹ دیا گیا' تو یہ زمانے میں ڈھل گئی اور پروردگار نے اسے ہمیشہ اپنے ساتھ منسوب کیا اور فرمایا کہ زمان اور مقدر کو برا مت کہو۔ زمانہ اور مقدر میں خود ہوں۔

تکنیکی اعتبار سے ہمارے پاس اس وقت زمان ومکاں کا جو فلسفہ ہے' میں نہیں کہتا کہ یہ قرآن سے لیا گیا ہے مگر قرآن ہی اس کی بنیادی اساس ہے۔ اگر کوئی ہم میں سے مسلمان ہوتا اور وہ نظریۂ اضافیت پر تحقیق کے ساتھ قرآن بھی پڑھ رہا ہوتا' تو وہ اس آیت سے ضرور زماں ومکاں کا نظریہ استنباط کر رہا ہوتا کہ والسماء بیننھا بایدیھم ہم نے آسمانوں کو اپنے زور بازو سے بنایا' وانا لموسعون اور ہم انہیں وسیع تر کر رہے ہیں۔

کائنات اور مکاں کی رواں توسیع مذکورہ آیت سے پوری طرح واضح ہے۔ نظریۂ اضافیت یا آئن سٹائن کی کائنات میں وسعت کی نظریہ بہت پہلے سے قرآن حکیم میں بڑے سادہ سے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ تخلیق کار پیچیدگیاں نہیں جانتا۔ وہ بڑے عام سے اصول میں ان ساری چیزوں کو واضح کر دیتا ہے۔ جیسے اس نے یہ کہا کہ شروع میں ساری کائنات ایک تھی۔ پھر ہم نے اسے پھاڑ کر جدا کر دیا۔ اب زماں ومکاں پر بگ بینگ کے تھیسز اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

میری رائے میں زمانے میں مکاں ایک سجاوٹ کی سکیم ہے۔ زماں کے لحاظ سے جب اشیاء کو فاصلے عطا کیے گئے تو یہ فاصلے اللہ تعالیٰ نے داخلی سجاوٹ' حسن تناسب اور ان کی باہمی رگڑ اور ٹکراؤ کو بچانے کے لیے سیٹ کیے۔ ان فاصلوں کے درمیان کی جگہ کو ہم مکاں (Space) کہتے ہیں۔

اصل آلہ خدا کے ہاتھ میں صرف اور صرف زمان اور مکاں اس کی آ گہی ہے۔ اگر مکاں نہ ہو تو ہم زمانے سے آزاد نہ ہوتے۔ اگر مکاں ہے تو ہم زمانے سے آزاد ہیں۔ اگر نہیں ہے' تو ہم زمانے سے آزاد نہیں ہوتے۔ مکاں محدود ہے کیونکہ پروردگار نے کا اقطار السموات والارض کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مکاں کی ایک حد ہے۔ مکاں پر حد لگانے والا وقت ہے۔ مغرب میں جتنے بھی تصورات زمان و مکاں گئے ہیں' وہ سارے کے سارے تجریدی ہیں۔ کوئی فرد اس نظام کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرتا۔ اگر خدا کی طرف سے دیکھا جائے تو دونوں آلاتی عناصر ہیں اور ہماری سمجھ میں بڑی آسانی سے آجاتے ہیں۔

یہ زمین جس پر زمان و مکاں کی کوئی قدر جاری ہے اور زمین پر جتنے قوانین ہیں' وہ زماں و مکان کے قوانین سے انحراف سے بنے ہیں کیونکہ اس جگہ مخصوص شرائط اور مخصوص صورتحال کا احیاء کر کے ان تمام قوانین کو معطل کرنا پڑا' جو باہر مکاں میں ہے۔ اس لیے کہ اس زمین پر رہتے ہوئے ہم زمان و مکاں کو کسی بھی تعلیمی حد میں قید نہیں کر سکتے' مگر جب ہم باہر نکلتے ہیں تو تمام زمانہ مکاں کو متعین کرتا ہے اور تمام مکاں سجاوٹی مقاصد (Decorative Purposess) کے لیے جگہوں اور فاصلوں کو متعین کرتا ہے اور رگڑ کو بچاتا ہے۔ یہ سہولت زمانہ کے لیے ہے۔

اگر آپ اس حدیث اقدس کو پڑھیں تو خدا کے نزدیک زمانہ زمانہ نہیں ہے' مقدر ہے۔ قسمت اور مقدر کو برا مت کہو' کیونکہ جب تم یہ کہہ رہے ہو کہ وقت برا ہے یا وقت اچھا ہے تو تم وقت کو نہیں بلکہ مجھے برا کہہ رہے ہو' اس لیے کہ میں نے اسے بنایا۔ میں نے اسے عطا کیا۔ یہ میرا زعم ہے کہ جتنی بھی اشیاء ہیں' وہ میں نے وقت میں رکھیں۔ کسی نے پوچھا تھا کہ عدم کیا ہے؟ وجود کیا ہے؟ تو میں نے اسے کہا کہ خداوند نے جو سوچا' وہ وجود ہے جس کے بارے میں نہیں سوچا وہ عدم ہے۔

ایک صاحب کی وضاحت

اگر سائنسی اعتبار سے پوچھا جائے کہ زمان و مکاں کیا ہے' تو ایک جدید پی ایچ ڈی

فرسٹ' اپنی کتاب Parallel Universe میں لکھتا ہے کہ زماں اور مکاں دو مختلف چیزیں نہیں' بلکہ یہ ایک ہی چیز اور وجود ہیں۔ آئن سٹائن نے اس کو Time Space کا نام دیا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ ہماری کائنات ٹائم سپیس میں ایک جھول ہے۔ ایک چھوٹا سا جھول' جس سے ہماری کائنات وجود میں آ گئی۔

پھر زمان ومکاں میں حال' ماضی اور مستقبل مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی چیز ہے اور چونکہ ہمیں وقت کی قید میں مقید کر دیا گیا ہے' اس لیے ہم ان میں سے صرف ایک حالت میں رہ سکتے ہیں۔ حال سے ماضی میں نہیں جا سکتے اور نہ حال سے مستقبل میں جا سکتے ہیں۔

وقت کے مختلف تصورات

وقت کے مختلف تصورات کے حوالے سے ایک جگہ اللہ نے فرمایا۔ میرا فرشتہ ایک دن اور رات میں اتنا چڑھتا ہے کہ اگر تم پچاس ہزار سال بھی بلند ہوتے ہو' تو تم اس کے برابر نہیں ہو سکتے۔ خداوند کریم نے کہیں بھی کوئی زیادہ سے زیادہ رفتار متعین نہیں کی۔ ایک جگہ حضورؐ نے فرمایا کہ دنیا کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ کہیں ایک رات کو ایک ہزار سال کی عبادت قرار دے دیا۔ کہیں ایک سال کو ایک دن کے برابر فرمایا۔ میں نے صرف یہی کہا ہے کہ کائنات کی تخلیق میں جو خداوند کریم نے پیمانہ استعمال کیا ہے' وہ فی ستته ایام کا کیا ہے۔ سائنس کے جدید ترین انکشافات اور اکتشافات کی روشنی میں ہمیں پتہ چلا ہے کہ خدا نے وہاں جو چھ دن Constellation کی عمر کے لیے استعمال کیے ہیں' وہ چھ ارب سال ہیں۔ لیڈ کرسٹل جب زمین میں یورینیم میں ڈھلتی ہے تو اس کو دو ارب سال لگتے ہیں۔ اسی سے سائنس دانوں نے زندگی کو متعین کیا ہے مگر جب زمین دو ارب سال کی ہے' جیسے اللہ نے کہا ہے کہ دو دن' تو آپ دیکھتے ہیں کہ سائنس کوئی نئی دریافت نہیں کر رہی ہے۔ وہ الہیاتی بیان کو سپورٹ کر رہی ہے۔ اسی طرح سورج سے علیحدگی اور زمین کے درمیان جو وقفہ گزرا ہے' یہ بھی دو ارب سال پر محیط ہے۔ گویا اس Constellation کی سیٹنگ میں چھ ارب سال لگ گئے۔

کائنات کی تخلیق

(پروفیسر فہیم) کائنات کی تخلیق کے بارے میں جدید تھیوری جو آئن سٹائن نے دی' وہ یہ تھی کہ کائنات کی تخلیق بگ بینگ سے ہوئی۔ کائنات سے پہلے آگ کا ایک بہت بڑا بال تھا۔ Per ten days minus 39 seconds کے انٹرول میں جو کچھ ہوا' ہم اس کے بارے میں نہیں جانتے۔ Per ten days minus 39 seconds کا جو انٹرول ہے' کہہ سکتے تھے کہ اس دور میں فزکس کے قوانین' جواب میں موجود ہیں' وجود میں آئے۔ اس کے بعد اس نے وسعت پذیر ہونا شروع کیا۔ اس سے لے کر اب تک کائنات پھیل رہی ہے۔

مزید تھیوری یہ ہے کہ کائنات اس وقت تک پھیلتی رہے گی' جس وقت تک اس کو پہلی طاقت توسیع کے تحت ملی ہے اور جو آخر میں کشش ثقل ہے' اس کی وجہ سے واپس سکڑے گی اور امکانات کا دائرہ کئی دفعہ وجود کرے گا۔

جہاں تک مکاں کا تعلق ہے' یہ ایک ایسی جگہ ہے' جس میں چیزیں پڑی ہوتی ہیں۔ جب تک چیزیں نہ ہوں' اس وقت تک مکاں ہے ہی نہیں۔ مکاں میں جب تک ستارے اور سورج ہیں' اس وقت تک یہ مکاں رہے گا۔ آپ ستاروں اور سورج کو نکال دیں' تو اس وقت سپیس رہے گی ہی نہیں۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) جس کو ہم مقام اور جگہ کہتے ہیں وہ مسئلہ الجھن کا شکار رہا ہے۔ اللہ نے اس کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ **اللہ نور السمٰوات والارض** جہاں جہاں بھی توانائی کا انجماد ہے' وہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو سپیس کہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہمیں بہت ساری وضاحتیں حاصل تو نہیں ہیں' لیکن اس وقت جتنا کچھ تصدیق شدہ موقف سائنس دانوں نے بیان کیا ہے' اس کے مطابق ایک یکجا وجود اتنی شدت اور تیزی سے پھٹا کہ اس کے پھٹنے اور سُرعت میں جو مقامات پیدا ہوئے' اس کو سپیس کہتے ہیں۔ یہ ذرّات کے فاصلوں اور پیکیجز پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے۔ اس کو قرآن نے ان معنوں میں کہا کہ **والسماء بنینھا باییدٍ وانا لموسعون** ہم نے آسمانوں کو اپنے زور بازو سے بنایا اور ہم انہیں وسعت دے رہے ہیں۔

حضور گرامی مرتبتؐ سے پوچھا گیا کہ دنیا کی تخلیق سے پہلے عرش کہاں تھا' فرمایا' اس

سے پہلے اللہ کا عرش پانی پر تھا۔اس کے بعد ایک سوال پوچھا گیا کہ اس پوری کائنات کی تخلیق سے پہلے خدا کہاں تھا؟ فرمایا 'کان فی عماما تحته هوا وما ففرقه هوا.

(پروفیسر فہیم) اس میں جو پہلے چیز موجود تھی' وہ فائر بال تھا۔ انتہائی کثیف مادہ توانائی کی شکل میں موجود تھا۔ وہ ایٹم نہ مالیکیول تھے' بلکہ اس سے بھی چھوٹے ذرات تھے' جس پر مالیکیول اور ایٹم وجود نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح یہ مادے کا ایک حصہ تھا۔ اس کو ہم Quark کہتے ہیں۔ اس میں لیپٹانز اور الیکٹرانز وغیرہ ہیں۔ اس وقت ایٹم بھی فائر بال میں موجود نہیں تھے۔ جب ہم زیرو سیکنڈ سے سٹارٹ کرتے ہیں' تو اس مختصر گھڑی میں کائنات میں جو کچھ ہوتا رہا' ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا تھا؟ کیونکہ فزکس کے تمام قوانین اسی وقفے کے عرصے میں بننے شروع ہوئے۔ اس سے پہلے ہمارے پاس قوانین ہی نہیں ہیں' جن کی بنیاد پر ہم نے قوانین معلوم کرنے ہیں۔ جب وہ موجود ہی نہیں ہیں' تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے کیا تھا۔ فزکس اس کو جاننے کی کوشش میں ہے' جن کی بنیاد پر ہم نے قوانین معلوم کیے ہیں۔

قرآن یہ کہتا ہے' ہم نے کائنات کو وسعت دی۔ فزکس کے جدید نظریات کے مطابق جو لائٹ مختلف کہکشاؤں سے آ رہی ہے' اس کا جب تجزیہ کرتے ہیں سپیکٹرم کی صورت میں' تو ہم یہ پاتے ہیں کہ ریڈ شفٹ کی وجہ سے روشنی کا ویولینگتھ بڑھتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ اب جب کائنات پھیلتی ہے تو کشش ثقل' جس کی وجہ سے ہم زمین کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی بھی اس پر قوت لگا رہی ہے۔ ایک وقت آئے گا جب کائنات کی توسیع پر کشش ثقل حاوی ہو جائے گی اور دوبارہ ساری کائنات سکڑنا شروع کرے گی۔ یہی قرآن کہتا ہے۔ سائنس دانوں کے کچھ مفروضات ہیں' جن کے بارے میں ہمارے پاس شواہد نہیں ہیں کہ کائنات دوبارہ واپس فائر بال بن جائے گی اور فائر بال پھر بگ بینگ کی صورت میں توسیع کرے گا۔

اب ایک Law of Entropy ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تمام اشیاء کی بے ترتیبی بڑھتی ہے جیسے کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا اور پھر وہ بد سے بدتر کی طرف لوٹ گیا۔ اسی طرح کائنات میں چیزیں بے ترتیبی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ہر سسٹم ڈس آرڈر کی طرف پیش رفت کر رہا ہے۔ فزکس کا یہ قانون Entropy کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ

سے یہ جو دائرہ ہے' یعنی کائنات کی دوبارہ Formation کا' فائر بال بننے کا' وہ پھیلتا رہے گا اور آخر میں ایک وقت آئے گا کہ اس میں مزید توسیع نہیں ہوگی۔ اس کا عرصہ لامحدود ہو جائے گا۔ پھر لامحدود وقت موجود رہے گا۔ یہی قرآن کہتا ہے کہ اس میں جنت بھی ہوگی اور دوزخ بھی ہوگی اور یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

چھ دن یا کن فیکون

کن فیکون کا مطلب کائنات کا پیدا ہو جانا نہیں ہے بلکہ کُن فیکون کا مطلب ہے ماسٹر پلان کا آغاز ہو جانا۔ اس سے پہلے پروردگارِ عالم نے ایک ماسٹر پلان تیار کیا جو کچھ بھی اس میں زندگی' ارواح اور وفات کا ذکر ہونا تھا' وہ اس نے لوحِ محفوظ میں درج کیا اور اسے سیل کر دیا۔ لوح محفوظ دراصل ماسٹر پلان ہے۔ جب ماسٹر پلان میں ہر چیز درج ہو گئی تو اللہ نے اس کا آغاز کیا۔ اس آغاز کے وقت جو لفظ استعمال ہوا' وہ کُن فیکون ہے۔

آج ہم میں اللہ نے اتنی عقل ضرور دی ہے کہ ہم پیمانۂ خداوند سمجھ سکیں۔ زمین کی تخلیق میں اللہ نے جو پیمانۂ وقت استعمال کیا ہے' وہ ایک دن ایک ارب سال کے برابر ہے کیونکہ اللہ کے پاس نسبتی وقت کی بہت تخصیص ہے۔ چنانچہ کسی وقت کسی دن کو ہزار سال کے برابر کہا اور کسی دن کو پچاس ہزار سال کے برابر قرار دیا جبکہ زمین کی تخلیق کا جو اس نے پیٹرن بنایا' اس میں ایک دن مساوی ایک ارب سال ہے۔

سائنس اور قیامت

قیامت کیا ہے اور سائنسی طور پر کیسے وقوع پذیر ہوگی؟ میں تو یہاں قیامت کا ذکر نہیں کر رہا۔ قیامت ابھی دُور ہے۔ قیامت کوئی تقریباً ہزار سال کے فاصلے پر لگتی ہے۔ یہ پیشین گوئیاں اس بارے میں نہیں ہیں کہ قیامت آ رہی ہے۔ یہ پیشین گوئیاں دنیا کے خاتمے کے بارے میں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک دنیا کے انجام کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ دنیا استوار ہوگی اور بڑی خوبصورت دنیا ہوگی۔ اللہ کا دین غالب ہوگا۔ نسل انسان کو فروغ ملے گا۔ رفتہ رفتہ پھر بگاڑ پیدا ہوگا۔ حتیٰ کہ ہم قیامت تک پہنچیں گے۔ قیامت کا ذکر بڑی وضاحت سے قرآنِ حکیم

میں اللہ میاں نے خود کیا ہے۔ فتنہ آخر زماں قیامت نہیں ہے۔ وہ فتنہ ہے ہی نہیں۔ فتنے اور قیامت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

زمین کے اپنے کناروں سے گھٹنے کے حوالے سے جہاں تک بات ہے' وہ اصل میں پرانی پیشین گوئی کو میں نے دہرایا اور کہا کہ سائنسی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ زمین اپنے کناروں سے گھٹ رہی ہے۔ یہ خالی اس پیشین گوئی کی بات نہیں تھی بلکہ قرآن حکیم نے کہا کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹا رہے ہیں۔ میں نے صرف اتفاق کی بات کی ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ پرانی تہذیبی معاشرت میں یہ عقیدہ تھا اور قرآن نے اس کی تصدیق کی اور حیرت کی بات ہے کہ دورِ حاضر میں ویسے ہی ہو رہا ہے۔

میٹافزکس پر اعتراض

کسی نے لفظ میٹافزکس (مابعدالطبیعات) پر اعتراض کیا تھا۔ ہر سبجیکٹ اور مذہب میں ایک میٹافزکس وجود ہے۔ میٹافزکس سے کبھی فلسفہ مراد نہیں لیا گیا۔ اس سے ہمیشہ یہ چیز مراد رہی ہے کہ وہ خیالات اور وہ تجسّس' جس کے لیے طبیعاتی وجوہ موجود نہ ہوں۔ اس تمام عرصہ خدا' نبوت یہ تمام چیزیں میٹافزکس رہی ہیں۔ اس سے فلسفہ مراد نہیں ہے۔ مگر اس سے مراد وہ حقائق ہیں' جن کے ثبوت ہم مہیا نہ کریں۔ خارجی اور معروضی انداز میں ہم سب ان کو مابعدالطبیعات کہتے ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی میں پہلے بہت بڑا فرق تھا' مگر جب سے سائیکالوجی سائنس ہوئی ہے' انسانی تحقیق کے ادارے' جو پہلے پیراسائیکالوجی کے تھے' اب سائیکالوجی کی حدود میں آ گئے ہیں۔ جوں جوں وسعت فکر انسان بڑھ رہی ہیں اور وہ احساسات' جذبات اور پس پردہ محرکات و خیالات میں زیادہ بڑھتا جا رہا ہے' اسی انداز سے اس کے تمام مابعدالطبیعاتی خیال طبیعاتی تصورات بن اور ٹوٹ رہے ہیں' اس کے آگے بھی کوئی ایسا جہاں شروع ہو جاتا ہے' جس پر پھر کسی لفظ پیراسائیکالوجی اور میٹافزکس کا گمان شروع ہو جاتا ہے۔

آج تک کسی مغربی مفکر اور فلاسفر نے میٹافزکس میں تجرید کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔ آپ کبھی خود کو نہیں جانتے۔ آپ نے ہمیشہ سچائی' نیکی اور انصاف کو خدا جانا' اقدار کو خدا بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ ہم میں اور ان میں فرق ہے۔ ہم جب اپنے طبیعاتی جنگل سے نکلتے ہیں' تو ہم اصولی

طور پر ایک حقیقی مابعد الطبیعاتی وجود کو جا رہے ہوتے ہیں اور یہ خود خدا ہوتا ہے۔ ایک سیارہ، جو فضا کے بسیط میں بغیر کسی منزل کے بے نام و نشان منزل کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ اور وہ جو اپنی مستقل امید، ایک توقع اور ایک یقین کے ساتھ الگ متعینہ منزل کو جا رہے ہوں۔ اس سے بڑا مابعد الطبیعاتی کون ہوگا؟ یہ ہے خدا اور دوسری چیزوں میں فرق۔ مغرب اور اسلام کے میٹافزکس میں فرق۔ ہم یقیناً ایک حقیقی میٹافزکس کے مالک ہیں۔ ہماری مابعد الطبیعات کی بھی طبیعات ہے ہماری جہت کی بھی ایک جہت ہے۔ ہمیں قرآن میں اللہ نے بتایا ہے کہ ایک اور جہت بھی ہے۔ وہ چوتھی جہت، جو مدتوں بعد انسان نے دریافت کی، وہ قرآن حکیم میں ہمیں کتنی آسانی سے اللہ نے دے دی۔

اس لیے کہ وہ خالص اور ماسٹر ہے۔ لارڈ برٹرینڈ رسل کا مشہور جملہ ہے کہ ہم صرف اشیاء کے درمیان تعلق کو جانتے ہیں، ہم اشیاء کی فطرت سے آگاہ نہیں۔ بیسویں صدی کے انجام پر، جسے دنیا کا سب سے بڑا فلاسفر اور ریاضی دان کہا جاتا ہے، بڑی بے بسی سے کہتا ہے کہ ہم صرف اشیاء کے باہمی تعلق کو جانتے ہیں۔ بس اتنا ہی۔ اس کے برعکس پندرہ سو برس پہلے محمد عربیؐ کی دعا دیکھیے کہ اے پروردگار! مجھے اشیاء کی فطرت کا علم دے۔ کتنا تضاد ہے۔ قرآن جنرلیش کے لفظ کو پہلے دہراتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جو میرا انکار کرتے ہیں، ان کا عالم یہ ہے **مثلھم کمثل الذی استوقد نارا** ۔ وہ اندھیرے بیابان میں آگ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہوتے ہیں، اس لیے مزید اندھیروں میں چلے جاتے ہیں۔ ان کی مثال ایسے ہے، جیسے طغیانیوں میں کشتی ہو۔ فوج در فوج اندھیرے آ رہے ہوں اور تھوڑی دیر کے لیے بجلی چمکے اور پھر وہ چلی جائے۔ ان کو امید پیدا ہو کہ رستہ مل جائے اور پھر مزید اندھیروں میں چلے جائیں۔

لارڈ رسل کی ایک اور تحریر نقل کرتا ہوں۔ اس نے کہا، میں ایک ایسے آدمی کی طرح ہوں، جو ایک وسیع و عریض سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا ہے اور اس کے پاس چپو بھی نہیں ہے۔ بعض دفعہ روشنی آتی ہے۔ میں تھوڑا سا رستہ دیکھ لیتا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ مکمل تاریکی میں گم ہو جاتا ہوں۔ اندازہ کیجیے کہ وہ لفظ، جو اللہ نے رسل کے بارے میں کہے اور جو خود رسل نے اپنے بارے میں کہے، ان میں کتنا فرق ہے؟ خدا کا نکل آنا کافی نہیں ہے۔ یہ علم الیقین ہے۔ جب آپ اس کی طرف چلنا شروع کرتے ہیں اور اس کے مشاہدات آپ کو ثابت کرتے ہیں، تو یہ عین الیقین ہے۔ جب آپ اس کے ساتھ رہنا پسند کریں گے تو یہ حق الیقین ہے۔

کائنات میں حُسن

کائنات میں حُسن کا تصور بدصورتی کے بغیر نہیں ہے۔

چمن زرنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

اگر آئینے کے ایک طرف زنگ نہ لگا ہوا ہو تو دوسرا اشفاف نہیں ہو سکتا۔ آپ کو صورت نہیں دکھا سکتا اور چمک اور اجالا نہیں دے سکتا۔ بدصورتی اور خوبصورتی اپنے تئیں وجود نہیں رکھتی، بلکہ بہترین چیز، جو پروردگار نے زمانے میں تخلیق کی ہے، وہ اعتدال اور توازن ہے۔ تمام کائنات چونکہ توازن کے اصول پر کھڑی ہے، اس لیے خوبصورتی اور بدصورتی بھی اعمال کے توازن کے لیے ضروری تھی۔ ان کو آپ کے ایک سکے کے دو رُخ کہہ سکتے ہیں کہ بدصورتی کے بغیر خوبصورتی کے اخلاقی مراتب نہ پیدا ہو سکتے۔ حدیث قدسی ہے کہ اللہ جمیل و یحب الجمال، خوبصورت تو صرف اللہ ہے اور خوبصورتی سے اس کا اُنس ہے جو خدا کی عادات اپنائے گا، وہی حسین ہے۔

کائنات اور داخلی بدی

کائنات اور انسان کے اندر کی بدی ایک ہی چیز ہے۔ بدی یہ ہے کہ انسان کے باطن کی اکائی اور اس کے بکھرے ہوئے اعصاب، خیالات اگر ایک مرکزی نظریے کے گرد گھومتے پھرتے ہیں، تو وہ مجتمع ہوتا ہے، طاقتور ہوتا ہے۔ جب اس بنیادی شخصی رجحان سے انسان ہٹتا جاتا ہے، رفع ہوتا ہے تو اس کی شخصیت میں بکھراؤ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام کہکشائیں ایک مرکز اور

محور کے گرد گھومتی ہیں۔ اگر ان کا مرکز ثقل کسی وجہ سے ختم ہو جائے، تو یہ تمام کہکشائیں تباہ ہو جائیں، بکھر جائیں اور فضائے بسیط میں غائب ہو جائیں۔ انسان کی شخصیت کا بھی وہی اصول ہے اور کائنات کا بھی وہی اصول ہے۔ مجتمع ہونا، جمع ہونا اور ایک مرکزی محور کے گرد اپنے آپ کو قائم رکھنا۔

کائناتوں تک رسائی

اصل میں پوری کائنات کتابِ حکیم سے کُھلتی ہے۔ بہت ساری ایسی باتیں اور ایسے لوگ ہیں جو کتاب حکیم تک رسائی نہیں پا سکتے۔ بہت سارے پڑھنے والے آیات الٰہی کے مفاہیم کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ عالم اسلام میں ہمارے جتنے بھی فکری اور علمی نظریات ابھرے ہیں، انہوں نے مبادیاتِ مذہب اور عملیات مذہب پر تو بہت زیادہ زور رکھا، لیکن وہ قرآن کی اعلیٰ ترین رسائی تک لوگوں کو لے جانے کی بجائے انہیں پیچھے لے جانے لگے۔ ہم بہت زیادہ اکیڈیمک ہو گئے ہیں اور ہماری عملیت پسندی میں جارحیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہم اس کے پیچھے نیات، خلوص، محبت اور رجوع الی اللہ کے بنیادی فلسفے سے غفلت برت رہے ہیں، جو عمل کی بنیاد ہے۔ عمل اس کی بنیاد نہیں ہے، بلکہ نیات عمل کی بنیاد ہیں۔

انما الاعمال بالنیات ' رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی کام کے بارے میں تمہیں شبہ ہو کہ یہ اچھا ہے یا برا تو اسے دل پر رکھو۔ آج کا فلسفہ یہ ہے کہ ٹائم ہی نہیں ہے۔ ایک کمپیوٹر آج برین کا کام کرتا ہے مگر ایک برین، جس میں ہم نے ڈیٹا نہیں ڈالا ہوا، وہ کیا جواب دے گا۔ دماغ کی حیثیت ایک ڈیٹا کنٹرول اور ڈیٹا بیس کی ہے۔ اس میں صلاحیت یہ ہے کہ وہ مطلوب ڈیٹا سے اپنے نتائج بھی اخذ کر سکتا ہے۔ بدقسمتی سے کسی علامۂ اسلام، کسی سائیکالوجسٹ، پیرا سائیکالوجسٹ یا کسی مفکر مشرق و مغرب نے ابھی تک قلبی علوم پر ریسرچ نہیں کی۔ ایک مغربی مفکر نے کہا ہے کہ دل سوچتا ہے اور اس نے یہ ثابت کیا کہ دل سے ایک احساس، جو دماغ کے کمپیوٹر تک پہنچتا ہے، وہ صرف آدھا سیکنڈ لیتا ہے۔ پھر دماغ اس پوری کیفیت کو رنگ و بو کی شکل و صورت عطا کرتا ہے۔ ہمارے دماغ میں اگر اللہ کی پہچان کے لیے ایک خصوصی ڈیٹا اور خصوصی نیات نہ ہوں، تو شاید ہم قرآن حکیم کی اس گہرائی تک نہیں جا سکتے، جس کے لیے ایک بالاتر

انٹلکچوئل معیار چاہیے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت امام زین العابدینؑ کے پاس ایک شخص سورۂ حدید کی وضاحت کے لیے گیا کہ ''اللہ جانتا ہے' جو زمینوں میں اور جو آسمانوں میں ہے۔ جو زمینوں سے آسمان کو بلند ہوتا ہے یا آسمانوں سے زمینوں کی طرف ڈھلتا ہے۔ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔'' پوچھا' اے امام المتقین' یہ بتا کہ اس کی تفسیر کیا ہے؟ ان کے پراسیس کیا ہیں؟ حضرت امام نے فرمایا' نزلت للمتقمقین فی آخرزمان کہ تم آج کے لوگ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ زمانہ آخر میں' جو خدا پر غور و فکر اور غور و خوض کریں گے' جو لوگ خدا کی طرف متوجہ ہوں گے اور سمجھنے سوچنے کی کوشش کریں گے' ان کو یہ بات ضرور سمجھ میں آ جائے گی۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ بندۂ خدا کی نگاہ کہاں تک جاتی ہے۔

سب کے سامنے ہے کہ اب ایک سکائی لیب آسمان سے گزرتے ہوئے زمین کی چوٹی کی خبر لیتی ہے۔ اس وقت اس بندہ کی نگاہ میں یہ تھا کہ اتنی ترقی پذیری ہو جائے گی کہ زمین کے اندر اور زمین کے اوپر کی خبریں کوئی معجزانہ کام نہیں سمجھا جائے گا۔ یہ سائنسی آلات میں محیط ہو جائیں گی۔ ہم لوگوں کو آج کوئی تعجب نہیں ہے کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی باتیں کیسے سنتا ہے۔ ہمارے سامنے وہ سائنسی آلات آ چکے ہیں۔ اگر انسان ایسے آلات تخلیق کر سکتا ہے' تو اللہ تو اللہ ہے۔ اس کی بات کرنا ہی محال ہے۔ زندگی اور آسمان اور دنیا اس وقت تک ہیں جب تک قرآن کی تمام آیات کا اثبات نہیں ہو جاتا۔ قرآن حکیم میں ابتدائے کائنات سے اس کے انجام تک اور ان دونوں فاصلوں کے درمیان انسان نے جو کچھ پانا ہے' اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

آخری مرتبہ جب میں باہر گیا' تو میں نے ایک شخص سے کہا کہ ہمارے نزدیک سات کائناتیں ہیں اور سات زمینیں بھی ہیں۔ آپ کو اس کائنات میں کسی دوسری زمین کا سراغ اس لیے نہیں مل رہا کہ آپ سات آسمانوں کا جو تصور لیے بیٹھے ہیں' جبکہ ہم سات بگ بینگ کے قائل ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے زین السماء الدنیا بمصابیع ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے سجایا والشمس و ضحھا اللہ نے سورج کو کہا۔

وہ سورج کو چراغ کہتا ہے' مگر بیرونِ آسمان اربوں کی تعداد میں سورج موجود ہیں۔ وہ ایک چراغ کی بات نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ میں نے آسمان دنیا کو چراغوں سے سجایا۔ اربوں کی

تعداد میں کہکشائیں ہیں' جہاں سورج جل رہے ہیں۔ وہ آسمان دنیا کے ہیں۔ اس سے ماورا بھی ہوسکتا ہے۔ کئی ایسی کائناتیں ہیں جہاں سرے سے سورج وجود ہی نہ رکھتا' جہاں شعاعی منبع' شعاعیں اور روشنی بالکل مختلف ہو۔

(حضور مرتبتؐ نے جب قرآن کی اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ جنت کی چوڑائی ساتوں آسمانوں اور زمین کی طوالت کے برابر ہے تو آپ تصور کرسکتے ہیں کہ جس جنت کا تصور ہمارے نزدیک ایک چھوٹے سے باغ کا ہے' وہ اللہ کے حساب و کتاب میں ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کی لمبائی اور چوڑائی کے برابر ہے۔ یہ کتنی بڑی گلیکسی ہوگی' جس کو ہم جنت کہتے ہیں۔ اصحاب نے عرض کیا' یارسول اللہؐ! اگر جنت اتنی بڑی ہے تو دوزخ کہاں ہوتی ہوگی؟ فرمایا' جب دن طلوع ہوتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔ غور طلب بات ہے۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے جو رائے دی ہے' آپ کے جدید ترین علوم اس سے مطابقت رکھتے ہیں اس سے آگے نہیں جاسکتے۔)

مثال کے طور پر ابھی تک ہم نے کوئی ایسی اعلیٰ ترین گلیکسی دریافت نہیں کی' جسے ہم جنت کہہ سکیں۔ مگر رسول اللہؐ نے جو مثال دی ہے' اس میں ایک مثال زمین کی ہے اور ایک کیفیت کی ہے۔ یعنی عرض اور چوڑائی اور لمبائی زمین کی ساخت اور اس کے حدود اربعہ میں ہے' مگر اس کی جس کیفیت کے بارے میں حضورؐ نے جواب دیا ہے' وہ حدود اربعہ نہیں' بلکہ کیفیت ہے۔ یعنی جب رات طلوع ہوتی ہے' تو دن کہاں ہوتا ہے؟ ذرا سا غور کریں' تو حضورؐ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زمین پر دن اور رات سورج کی وجہ سے ہیں۔ رسول اللہؐ نے اشارتاً فرمایا کہ جنت اور دوزخ ایک ہی جگہ پر ہیں۔ جدھر جلال و جمالِ یزداں کی جھلک ہے' وہ جنت ہے اور جدھر سے خدا کا رخ پھر گیا ہے' وہ دوزخ ہے۔

ایک اور تکنیکی بات کہ آپ کی زمین جس پر آپ قائم ہیں اس کے اندر جا کے دیکھیں' تو آپ کو بالکل دوزخ کا سماں لگے گا۔ اسی طرح پگھلتے لاوے' جن کا ذکر آیا ہے' زقوم کے درخت میں نمک کے ستون اور بالکل وہی کچھ ہے جیسے قرآن حکیم میں اللہ نے Terrestrial World کا نقشہ بیان کیا ہے' بعینہٖ جہنم کا نقشہ ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جہنم ایک ایسی گلیکسی ہے' جو Under-Making ہے۔ جو ابھی تکمیل تک نہیں پہنچی اور جنت ایک ایسی گلیکسی ہے جو تکمیل تک

پہنچ گئی ہے۔ وہ قدرتی طور پر جہنم کا بالائی حصہ ہے۔ جہنم اس کا زیریں حصہ ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں، جو ابھی تک سائنٹفک اعتبار سے ہمارے سامنے نہیں آئیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فشن (Fission) اور فیوژن (Fusion) کی مثال تخت کی صورت میں دی ہے۔ آئن سٹائن کے Fission اور نظریۂ اضافیت کے مطابق ایٹم بم تو بن گیا، مگر اس کا دوسرا حصہ ابھی پورا نہیں ہوا، جسے ہم فیوژن کہتے ہیں۔ کیا حضرت انسان اس قابل ہو سکے گا کہ بکھری ہوئی توانائی کو دوبارہ کسی مادی شکل میں لے آئے؟ میں کہتا ہوں، یہ بالکل کھلا آپشن ہے کیونکہ خدا نے ایسا کہا ہے۔ آج سے کئی ہزار سال پہلے بغیر کسی سائنسی انسٹرومنٹ کی مدد کے ایک شخص نے تخت سبا کو توانائی میں بدلا اور بجلی کی رفتار سے مملکت سلیمان میں لا کر دوبارہ اسے ڈھال دیا۔ انسانیت اس پوزیشن تک پہنچے گی اور وہ لوگ جو اس کو ایک خیالاتی اور تصوراتی بات سمجھتے ہیں وہ قرآن کی اس آیت کا ثبوت لائیں گے کہ ایسا ہو سکتا ہے اور ایسا ہوگا۔

تازہ ترین انکشاف کے مطابق امریکہ میں فیوژن کنفرم ہو چکا ہے۔ آپ نے بہت ساری مووِیز دیکھی ہوں گی، جن میں سٹار ٹو سٹار حرکت اور مواصلات توانائی کے ذریعے نقل و حمل کرتی ہے۔ ایک آدمی کو توانائی میں تبدیل کیا گیا اور وہ دوسرے سٹار پر جا کر اپنے وجود میں دوبارہ ڈھل گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ مادہ اور توانائی کی تبدیلی اگلے برسوں میں کنفرم ہو جائے گی۔ اس وقت فیوژن کنفرم ہو چکی ہے اور اس کے تجربات آگے بڑھ رہے ہیں اور میرے خیال میں دو چار برسوں میں یہ بات آیات الٰہیہ اپنے مطالب کو پہنچیں گی۔

اسی طرح آیاتِ الٰہیہ کے مطابق ہی قرآن حکیم کی جب تک ہر متشابہ آیت محکم میں نہیں بدل جاتی، انسان زندہ ہے۔ جب یہ تمام آیات ثابت ہو جائیں گی اور اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی وقت دے دیا ہے تو پھر قیامت آ جائے گی۔ لیکن اسے ابھی کچھ اور کرنا ہے۔ آپ کو ایک دو سالوں میں ایسی دوسری زمین کے سگنل ملنے شروع ہو جائیں گے۔ مغرب میں تمام فزیشن اور حساب دان اس آپشن کو مانتے ہیں کہ ایک اور جگہ بھی زندگی ہو سکتی ہے۔ آخری مرتبہ جب میں امریکہ سے رخصت ہوا تو اس وقت ایک اور بگ بینگ دریافت ہو چکا تھا۔ اگر ہم سات زمینیں نہ بھی دریافت کر سکیں اور صرف ایک اور زمین کا بھی سراغ مل گیا تو یہ دوسری زمینوں کے وجود کا ایک اشارہ ہوگا اس لیے زندگی انسان قرآن کی ہر آیت کے استحکام تک ہے۔

میں کچھ باتوں میں عاجز ہوں مگر میں آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اچھا قرآن پڑھنے اور جاننے والا ہوتا تو قیامت تک جتنے واقعات آنے والے ہیں' ان کا نقشہ دے دیتا۔ سب کی باتیں لکھتا کیونکہ قرآن میں روزِ جزا تک کی ہر بات کا اندراج ہے۔ سائنس دانوں کے جتنے بھی دنیا کے خاتمے کے تخمینے ہیں' جیسے زمین کا کشش ثقل سے نکل جانا' کسی اور ستارے کی کشش ثقل کا اسے متاثر کرنا' اپنے بیلنس سے نکلنا' دوبارہ افلاک میں کلیتاً رجعت کا ہونا اور بگ بینگ کی طرف Retraction کا ہونا پہلے Centrifugal فورسز اور اب Centripetal کے تحت کائنات کے خاتمے کے عنوان قرآن بہت پہلے سے طے کر چکا ہے۔ قرآن نے لکھے نہیں ہیں' اللہ مقرر کر چکا ہے۔

معراج' سائنسی توجیہ

شب معراج کا واقعہ اس کے لیے کافی آسان ہے' جس نے Relative Times کے کانسپٹ پڑھے ہوں چونکہ خدا قدرتِ کاملہ اور قدرتِ مطلقہ کا مالک ہے' اب یہ نہیں معلوم کہ اس نے کوانٹم کو استعمال کیا' یا Relativity کو۔ ایک واقعہ ہوا جس کی ایک طرح سے نہیں' پانچ چھ طرح سے وضاحت ممکن ہے۔ جیسے عطاء اللہ شاہ بخاری نے اسی واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

تیرے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لے

دُور سے کسی ایسی صورت کو دیکھ کے یہ مصرعہ پڑھا گیا۔ اسی طرح جب رسول اللہؐ نے اوپر جانا تھا تو پوری کائنات کو منجمد کر دیا گیا۔ ممکن ہے کہ ارب ہا سال کا سفر ہوا ہو مگر چونکہ کائنات منجمد تھی اور اس میں کوئی حرکت نہیں تھی' اس لیے وقت شمار ہی نہیں ہوا' جس میں وہ گئے اور واپس آ گئے۔

دوسرا پہلو Compaction کا ہے کہ آپ کا ایک دو لمحے کا ٹائم وہاں اندازاً دو چار بلین کو کور کرتا ہو اور حقیقت میں یہ درست ہے۔ ارب اور کھرب ہا سال کی گلیکسیز کی زندگی کو جب ہم میں Compact کیا جائے' تو وہ ساٹھ ستر برس کی زندگی بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زندگی کے ساتھ نہ کوئی مناسبت ہے نہ کوئی قدر بنتی ہے۔ نہ یہ خیال ہمارے لیے خوش کن ہے کہ ہم اتنی بڑی

کائنات میں اتنی سی زندگی لے کر راہ گزاری کر رہے ہیں۔ وہاں بھی اسی قسم کا کانسپٹ ہے کہ ٹائم کو Relative کر دیا گیا ہے۔ ایک لمحہ یہاں کا وہاں کا اتنا طویل عرصہ بنتا ہے۔

مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ آپ پڑھے لکھے ہیں' سمجھ دار ہیں' کیا آپ واقعی مانتے ہیں کہ معراج ہوئی تھی۔ میں نے کہا' ہاں میں مانتا ہوں۔ اس نے کہا' کیا آپ کے پاس اس کی کوئی سائنسی توجیہ ہے؟ میں نے کہا' اس سے پہلے کہ میں جواب دوں' میں تجھ سے ایک سوال پوچھتا ہوں کہ کیا محمد رسول اللہؐ کو میں نے بھیجا تھا وہاں؟ کہنے لگا نہیں۔ میں نے کہا' تم نے بھیجا تھا؟ کہنے لگا نہیں۔ میں نے پوچھا' کیا کسی سول سروسز کے افسر نے بھیجا تھا؟ کہنے لگا نہیں۔ میں نے پوچھا کس نے بھیجا تھا؟ کہنے لگا' اللہ نے۔ تو میں نے اس سے کہا کہ کیا اللہ میں یہ طاقت ہے کہ نہیں کہ وہ اس طرح کسی کو بھیج سکتا ہے؟

اگر اللہ موجود ہے اور ہم اسے سب سے طاقتور' حاضر ناظر اور ہر وقت کا دیکھنے والا مانتے ہیں۔ خدا نے جو سوچا' وہ وجود ہو گیا۔ جو نہیں سوچا' وہ عدم ہے۔ اگر اللہ نے اپنے بندے کو وہاں تک لے جانے کا سوچا تو یہ حقیقت بن گیا۔ اگر نہ سوچتا' تو یہ واقعہ ہی نہ پیش آیا۔ سائنسی نظریات' نظریہ اضافیت اور زمان و مکاں کی ہر پہنچ سے اللہ کے رسولؐ کی معراج کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ اس میں کوئی غیر یقینی پہلو نہیں ہے مگر یقین واعتبار اسی میں ہے کہ اگر پروردگار عالم چاہے' تو وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

میں آپ کو تجویز دیتا ہوں' جس سے ساری بات واضح ہو جائے گی۔ فرض کریں' ایک فکر میں اللہ میاں بیٹھے یہ ساری باتیں سوچ رہا ہے' جو گزر رہی ہے۔ زندگی' موت' واقعات' پہاڑ سب کچھ سوچ رہا ہے۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے دفع کرو' کیا فضول سوچیں سوچ رہے ہو۔ تو پھر باقی کیا رہ جائے گا؟ اگر ہم غور کریں تو پوری کی پوری کائنات ایک واہمہ' ہیولا اور ایک تصور ہے۔ البتہ آپ کی اور خدا کی سوچ میں صرف ایک فرق ہے کہ آپ بھی اسی طرح سوچتے ہیں۔ جب آپ اٹھ جاتے ہیں تو تمام چیزیں فنا ہو جاتی ہیں۔ آپ بھی بیٹھے یہ منصوبہ بندی کر رہے ہیں کہ میں انگلینڈ گیا۔ مجھے مکان ملا۔ میرے بچے ہوئے۔ میں وہاں ٹھہرا۔ آپ ایسا سوچ سکتے ہیں مگر آپ میں اور خدا میں صرف یہ فرق ہے کہ آپ کا خیال ساتھ ہی عملی صورت میں نہیں ڈھلتا۔ مگر اللہ میں یہ قدرت ہے۔ وہ قدیر ہے' مزید اور متکلم ہے۔ قدرت والا اور ارادے

والا ہے۔ کلام والا ہے۔ مصور اور باری ہے۔ وہ سوچتا جا رہا ہے' چیزیں ہو رہی ہیں۔ کسی دن وہ کہے' بہت ہو گیا۔ اسی دن تمام کائنات وجود سے عدم ہو جائے گی۔

شہاب ثاقب اور سائنس

سائنس اس کو کوئی اور مظہر نہیں کہتی بلکہ سائنس آسمان میں ٹوٹنے والی روشنیوں کے مقصد کو پانے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکی۔ سائنس کو اس سسٹم سے آگاہی نہیں ہے کہ اوپر ایسا بالائی نظام موجود ہے جو اچھی طرح سے حفاظت میں ہے۔ شہاب ثاقب اینٹی ایئر کرافٹ گن کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ہم بھی اینٹی ایئر کرافٹ گن استعمال کرتے ہیں۔ اس کے گولے بھی شہاب ثاقب کی طرح اپنے ٹارگٹ کو لپکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے جہاز بھی اڑتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔

ہمیں کائنات کے بالائی سسٹم کا پوری طرح علم نہیں ہے مگر زمین پر ایک حکومت کی طرح شہاب ثاقب بھی آسمانوں اور فضاؤں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آسمان ایک بہت بڑی کائنات کی حفاظت میں ہے۔ یہاں تو آپ کو پتہ ہے کہ دشمن فلاں فلاں ہے۔ مگر فرض کیجیے شیاطین دنیا پر چڑھائی کر دیں اور وہ نظر نہ آئیں' تو آپ کی گنیں تو نہیں چل سکتیں مگر شیطان عالم بالا کو جاسوسی کے لیے چڑھتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک مقام سے دوسرے مقام تک صحراؤں اور سمندروں نے ہمیں تقسیم کر رکھا ہے اور ہماری سمندری حدود ہیں۔ وہاں ہو سکتا ہے' کسی گلیکسی کو کسی دوسری گلیکسی نے تحفظ فراہم کر رکھا ہو۔ جب کوئی شیطان اس گلیکسی کی حدود میں داخل ہوتا ہے' تو وہ اس پر شہاب بے انداز پھینکے جاتے ہوں۔

چاند کی سطح پر بہت شہاب گرتے ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ جنّات کی حدود پرواز چاند تک ہے۔ جنات تین ہزار سال کی زندگی رکھتے ہیں۔ یہ گیسز میں محدود بھی ہیں اور ایک قسم کا الیکٹرانک عنصر بھی ان کے پاس ہے۔ یہ شکل بدل لیتے ہیں۔ فضاؤں سے ہو سکتا ہے یہ بجلی کی رفتار سے گزرتے ہوں یا عالم بالا میں ان کی سیکرٹ سروسز موجود ہوں۔ اللہ کو اس کا بہتر علم ہے۔ اس لیے سائنس کے حوالے سے ہم اس پر اعتراض نہیں کر سکتے' کیونکہ سائنس کو اللہ کا پتہ ہے نہ اللہ کے نظام کا۔

خدا کی دید کا امکان

پروردگار نے بڑی وضاحت سے کہا کہ چونکہ تمہارے ویژن میں وہ انسٹرومنٹ نہیں جو مجھے دیکھ سکے' اس لیے تمہاری بصارت مجھے نہیں دیکھ سکتی' البتہ تمہاری بصیرت مجھے محسوس کر سکتی ہے۔ خدا کو ہوا کی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ ہوا کو دیکھ سکیں تو خدا کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر ہوا نہ دکھائی دینے کے باوجود اپنے پورے اثرات رکھتی ہے۔ وہ محسوس ہوتی ہے۔ چھوئے' تو پتہ لگتا ہے۔ تیز چلے' تو صرصر ہے۔ ہولے چلے' تو بادِ نسیم ہے۔ بہت تند و تیز ہو' تو یہ طوفان ہے۔ انسان ہوا کے ہر انداز کو محسوس کر سکتا ہے۔ اسی طرح پروردگار کو بغیر نظر شہادت آپ محسوس بھی کر سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں مگر پوری کائنات کی تاریخ میں صرف ایک انسان نے بشری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ واقعہ معراج میں رسول اللہؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہؐ نے شب معراج میں اپنے رب کو دیکھا اور یہی ایک ہمارے پاس اللہ کے ویژن کی شہادت مطلق موجود ہے مگر قیامت کے دن تو نہیں' البتہ جنت میں جمعہ کے روز سارے لوگ اپنے پروردگار کو دیکھ سکیں گے۔ خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد۔ پوچھا گیا' کہ یا رسول اللہؐ کیسے دیکھیں گے؟ فرمایا' جیسے ہلکے سے بادلوں کی اوٹ میں آپ چاند دیکھتے ہیں۔

قصۂ ابلیس و آدم

آدم تو وہی تھا' جسے خدا نے پیدا کیا اور شیطان جانتا تھا کہ یہ اس کا حریف ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس میں جو عقل اللہ کی طرف سے عطا ہوئی' یہ منفی اثرات کو قبول کرتی ہے۔ بابا نے کہاں غلطی کی؟ حضرت کو یہ پتہ چلا کہ میں ان ابدی مخلوقات کے مابین ایک فنا ہونے والی مخلوق ہوں۔ آدمؑ کو یہ گمان ہوا کہ میرے اردگرد ابدی مخلوقات ہیں۔ ابدی ہیں' ازلی ہیں۔ میں تو مرنے والا ہوں۔ مجھے تو پیدا بھی کیا گیا ہے' تو مرنے کے لیے۔ شیطان نے اسے بالکل وہی لالچ دیا' جو آج بھی ہمارا سب سے بڑا لالچ ہے۔

اگر آپ کو وہ لالچ دیا جائے کہ کیا آپ ابدی زندگی کو پسند کرتے ہیں؟ ایسی زندگی جس کو کبھی موت نہ آئے۔ ایسی زندگی' جس میں لامتناہی زندگی موجود ہو۔ آپ فوراً ہاں کر دیں گے۔ بدقسمتی سے اسی خواہش کا آج بھی ہم شکار ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے حضرت آدمؑ کو اچھی طرح پتہ ہو کہ میں یہاں کا مقامی نہیں ہوں۔ ان مخلوقاتِ ازلیہ کے درمیان ایک ایسا شخص ہوں' جو ان سے میل نہیں کھاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین پر بھیجا۔ وہاں بھی لفظ مستقر استعمال کیا۔ یہ جگہ مستقل نہیں تھی' مگر موت کے بدلے اللہ نے انسان کو ایک ابدیت دی۔

ارضی و سماوی آدم

یہ غلط بات ہے کہ انسان اس وقت نہیں پیدا ہوا تھا۔ انسان تو بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔

حضرت علی کرم اللہ سے پوچھا گیا کہ انسان سے پہلے کیا تھا' فرمایا آدم۔ پوچھا' آدم سے پہلے کیا تھا؟ کہا' آدم اور کہا آدم کے آنے سے پہلے ستر ہزار آدم گزر چکے تھے۔ زمانے پر چار برفانی ادوار گزرے ہیں۔ علم الانسانیات کے ساتھ ان کا مطالعہ کریں تو خدا نے انسان کے بارے میں یہ نہیں کہا' جو آدم کے بارے میں کہا۔ بلکہ خدا نے کہا' **هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شى مذكورا** ' بلاشبہ انسان زمانے میں طویل عرصہ تک کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آدم بڑا قابل ذکر ہے۔ یہ کون ہے جو قابل ذکر نہیں ہے؟ یہ ایک سیل' حقیر ذرّے یا کسی کائی کی حیثیت میں زمین کے کسی گوشے میں بے نقاب پڑا تھا۔ جیسے وِل ڈیورانٹ کہتا ہے: ''Perhaps it was a form of very primitive life.'' جس نے فیصلہ کیا کہ حیاتِ ابدی کے لیے زندگی و موت قبول کرلوں اور پھر اس کی افزائش شروع ہوگئی۔ آدم' جو جنت میں ایک روحانی پروٹو ٹائپ بن رہا تھا' وہ مکمل ہوگیا۔ نیچے انسان زمین پر ایک جبلی مخلوق کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ اس اسٹیج پر آیا' جسے Homosapian کہتے ہیں۔

جب یہ اس مقام تک آیا' تو کچھ انسان سے مشابہ لگا۔ پھر یہ Homo-erectus اور Homo-hablis بنا۔ اب یہ انسان تو لگتا ہے مگر عادات انسانی ابھی بھی نہیں ہیں۔ شعور انسان ابھی پختہ نہیں ہوا کہ دماغ کا حجم کم ہے۔ تفکر سے ابھی اس کا واسطہ نہیں ہے۔ ایک خطا کی وجہ سے روحانی وجود میں ایک جسمانی کوالٹی آ گئی۔ روحانی وجود مادی خواہش رکھنے لگ گیا۔ پہلے آدم کو یہ آرزو نہیں تھی۔ جنت میں گھومتا پھرتا تھا۔ عیش و عشرت کا سماں تھا۔ سکون و ثبات تھا۔ جب اس نے خطا کی' تو خطا کے پراسیسنگ کے ساتھ ساتھ جسمانی خواہشات کی ایک منفی عقل پیدا ہونا شروع ہوئی۔ Fore-brain کے بالکل نیچے جنسی طلب کا حصہ ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ انگیٹھی نیچے ہے اور دھواں اوپر اٹھ رہا ہے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوگئی تو روحال پروٹو ٹائپ میں خواہش نفس پیدا ہوگئی۔ تو کہا گیا: **اهبطو بعضكم لبعض عدو** ' جاؤ نیچے۔

ایک روحانی وجود کہاں جاتا ہے؟ روحانی وجود ایک مادی وجود میں گیا۔ برفانی دور کے بعد جس انسان کا ہمیں سراغ ملتا ہے' وہ ناگہاں سوچنے والا ہے۔ ایک عربی قول کے مطابق اللہ نے انسان کو بنایا۔ اس پر نظر کرتا رہا۔ پھر اچانک اس پر شعلہ برق گرا اور یہ سوچنے والا ہوگیا۔ ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ یہ جاہل انسان اسی طرح گھومتا پھرتا' قتل و غارت کرتا تھا۔ کہیں سے آیا۔ اس

کے دماغ کی مقدار میں اضافہ ہوا اور اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ زمین پر دماغ کے بڑھنے اور اس کے سوچنے کا اور کوئی فلسفہ رائج الوقت نہیں ہے۔ جب کہ ہوا یہ تھا کہ روحانی اور مادی وجود کو آپس میں جوڑ دیا گیا۔ یہی آخر میں ہوتا ہے۔ وجود یہاں رہ جاتا ہے اور روحانی وجود آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں آنے کے لیے اسے مادی وجود چاہیے تھا۔

یہ وجود جو زمین پر حرکاتِ نازیبا فرما رہا تھا' وہ تھا جسے فرشتے دیکھ رہے تھے اور اسی کے بارے میں اللہ کے حضور اپنے اعتراضات پیش کر رہے تھے۔ **اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک و نقدس لک** 'وہ اپنی تسبیح پر نازاں تھے۔ انہیں اپنی عبادات پر تفاخر تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ اللہ نے آخر کیا کیا؟ Homoerectus کو خلافت دے رہا ہے' جبکہ جنت کے روحانی وجود کو دنیا کے مادی وجود کے ساتھ ملا کر اسے خلافت ارضی کا مستحق ٹھہرایا گیا۔

حدیث یہ کہتی ہے کہ چالیس دن تک لوتھڑا ہے۔ پھر اس میں روحانی عناصر داخل ہوتے ہیں۔ سعادت' سخاوت اور رزق داخل ہوتا ہے۔ مائنڈ انٹر ہوتا ہے۔ اب بھی وہاں سے وجودِ روحانی زمین پر بنے ہوئے وجودِ مادیہ میں آ کے ڈھلتا ہے۔ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ قرآن کے نقطہ نظر سے' نہ سائنسی نقطہ نظر ہی سے۔ آپ کو Accomplishment کا فارمولا چاہیے۔ بدقسمتی سے اس فارمولے کی طرف مذہبی رہنماؤں کی نظر نہیں جاتی اور سائنسی لوگوں کی نظر اس روحانی فارمولے پر نہیں گئی۔ آج تک دنیا کا کوئی مفکر حیاتیات یہ نہیں بتا سکا کہ انسان نے اچانک کیسے سوچنا شروع کر دیا۔

مختلف رنگ اور نسلیں

ماشاء اللہ حوّا کے رنگ کا تو کسی کو نہیں پتہ' وہ کیا تھا مگر ایک روایت موجود ہے (میں اس کو کنفرم نہیں کہتا کہ اس کے پیچھے کوئی تصدیق حاصل نہیں ہے۔ اسے اسرائیلیات میں سے کہہ سکتے ہیں) حضرت آدمؑ آسمان سے بہت بوڑھے اترے تھے۔ پھر جب وہ زمین میں آئے تو ناسازگار حالات کی وجہ سے کالے ہو گئے۔ اپنا رنگ ایک دفعہ پانی میں دیکھا اور سیاہی دیکھی تو رونے لگے۔ بارگاہِ الٰہی میں درخواست کی کہ یہ میرے گناہ کی سیاہی ہے۔ جبرئیل امین تشریف لائے اور کہنے

لگے کہ نہیں یہ ناسازگار حالات کی وجہ سے آپ کا چہرہ ایسا ہو گیا ہے۔ اگر آپ ایامِ ابیض کے روزے رکھیں تو آپ پھر سفید ہو جائیں گے۔ چاند کی 13' 14' 15 کو ایامِ ابیض کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں تمام انبیاء ایامِ ابیض کے روزے رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جب وہ بوڑھے ہوں تو کوئی پیدا ہو گئے ہوں اور جب وہ کالے ہوں تو کوئی اور پیدا ہو گئے ہوں۔

تھوڑا بہت فرق حالات کا بھی ہے۔ رنگت کی تبدیلی کا قرآن میں اللہ نے ذکر کیا ہے اور کہا کہ یہ میں نے جان بوجھ کر اپنی حکمت سے تمہیں دیئے ہیں۔ اسی طرح اس نے پتھروں کے رنگوں کا ذکر کیا اور درختوں کا ذکر کیا۔ وہاں انسان کے رنگوں کا بھی ذکر اللہ نے پالیسی کے طور پر کیا ہے۔ ایک آدم سے پیدا ہونے کے باوجود ہم میں اور یورپ میں بہت سا فرق ہے۔

امانت کی بحث

خدا نے انسان میں ذہن کے موزوں استعمال کے سوا کبھی کوئی چیز نہیں کی' مگر آپ نے کیوں کا سوال کیا تو جہاں خدا نے یہ امانت عقل و شعور عطا کی' وہاں ایک فیصلہ بھی سنایا اور وہ یہ تھا انه کان ظلوماً جھولا ' کہ یہ ظالم بھی ہے اور جاہل بھی۔ اس کا آسان مطلب یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو برتر خیال کیا اور اپنے کام کو کمتر گردانا۔ وہ قضیہ اب تک چلا آ رہا ہے۔ ہم بہت پُراعتماد تھے کہ ہم یہ کام کر لیں گے' مگر ہم بھی اپنے کام کو سرانجام دینے کے قابل نہیں رہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے کمتر ترجیحات کو زیادہ اہم کر دیا اور ترجیح اول کو کم اہم بنا دیا۔ ہم واپس جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت دو چار دس انسان نہیں' پوری امت ترجیح اول کے بارے میں کنفیوژن میں مبتلا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کس کی پرستش کر رہے ہیں اور کیا پرستش کر رہے ہیں؟ خدا ہمارے لیے ایک Taboo اور ایک علامت ہو گیا ہے۔ اساطیر الاولین میں سے ایک داستان بن گیا ہے۔ چنانچہ ہم قرآن اور تعلیمات رسولؐ کے اصل معانی کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انسان' ظالم اور جاہل

یہ سب خدا کا فیصلہ ہے۔ انسان کی اس عجلت کے حوالے سے' جس میں اس نے یہ

خیال کیا کہ عقل کو حاصل کرنا اور خدا کا اقرار واعلان کرنا بڑی سادہ سی بات ہے۔ جب خدا کے حضور ہم کھڑے تھے اور اللہ نے پوچھا' الست بربکم ' تمہارا رب کون ہے؟ قالو بلیٰ ' ہم نے کہا' ہاں بالکل تو ہے۔ اس میں کیا تعجب کی بات ہے؟ سامنے تو ہم اسے مانیں گے۔ پھر اللہ نے ہمیں عقل ومعرفت سے نوازا اور کہا' میں اشارہ بھی کروں گا اور پیغمبر بھی بھیجوں گا۔ کتاب بھی دوں گا۔ اولیاء اللہ سے بھی زمین خالی نہ ہوگی۔ بار بار تمہیں رجائیت بھی دیں گے اور تمہیں اس پیغام کی طرف بھی بلائیں گے۔

انسان نے کہا' یہ کوئی مشکل امر نہیں۔ اگر آپ کو رہنما مل جائے اور اسماء بھی مل جائے اور ہر قدم پر آپ کو رہنمائی اور ہدایت کے مینار بھی روشن ملیں تو آپ کا دعویٰ ہو سکتا ہے کہ میرے لیے خدا کو جاننا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنے بنیادی کام کو بڑی آسانی سے پورا کرلوں گا۔ مگر اللہ کہتا ہے کہ انسان بدقسمت ہے کہ اس نے فیصلہ عجلت میں کیا' اس لیے کہ وہ تفاخر اور جاہ ومنصب چاہتا تھا' اذقال ربک انی جاعل فی الارض خلیفه ' اس منصب کے بالمقابل خلافت اور عزت وجاہ کا منصب مل رہا ہے۔

مگر اس بندے نے خطرہ مول لیا۔ بجائے احتیاط کرنے کے کہ اس کے منفی اثرات کیا ہیں اور اس کا عذاب کیا ہے' اس نے جلدی کے تحت یہ فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔ خدا یہ کہتا ہے کہ ظلوماً جهولا کا مطلب قطعاً ظالم اور جاہل نہیں ہے۔ اللہ یہاں عالمانہ فیصلہ دیتا ہے کہ اس نے اپنے کام کو کمتر خیال کیا جبکہ خود کو برتر خیال کیا۔ اس تعبیر سے آپ کو واضح ہو جانا چاہیے کہ اس نے جس کام کو آسان سمجھا وہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو Over-estimate کیا۔ ان دونوں الفاظ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے' جو ایک کام کرنے کا دعویٰ کرتا ہے' مگر جب وہ عملی طور پر اسے کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اسے نہیں کر سکتا۔ ہم اسے ظالم اور جاہل کہتے ہیں۔

خدا اور مردانِ کار

حدیث رسولؐ کے مطابق اس زمین پر کچھ افراد ہمیشہ ایسے موجود رہتے ہیں جو دنیا میں ایک کارساز رول ادا کرتے ہیں اور ان کا نام رجالِ غیب ہے۔ اسی طرح انڈیا میں بہت بڑے محدث نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے ایک حدیث پر اتفاق کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا' جب تم میں سے کوئی کھو جائے تو بلند آواز یہ کہے اعیو ننی یعباد اللہ' کہ اے اللہ کے بندو! میری مدد کو پہنچو۔

نواب صدیق حسن کا دیوبند اور اہل حدیث سکول سے تعلق واضح ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ایک دفعہ دریائے نربدا کے پار اتر رہا تھا تو میری بہلی پانی میں پھنس گئی۔ جب کوئی طریقہ نہ رہا تو میں دریا کے پار اترا۔ منہ اس طرف سے پھیر لیا اور بلند آواز میں کہا' اعیو ننی یعباد اللہ' جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو میری بہلی دریا کے پار تھی۔ میں اس کو عام آدمی نہیں سمجھتا۔ ایک بہت بڑے محدث کا یہ اپنا بیان ہے کہ جس حدیث پر وہ شبہ کر رہا تھا' اس پر ناطق ہے۔

اس دنیا و مافیہا میں خدا کی اتنی افواج ہیں اور اتنے قسم کے لائف پیٹرن ہیں' جن کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے' مگر کچھ لوگ اسی زندگی میں ترفع پا کر خدا کے ہاں اتنے مقبول ہو جاتے ہیں جس طرح حضرت برنباس کے بارے میں حدیث مشہور ہے کہ وہ قیامت تک زندہ اور پوشیدہ ہیں۔ جب عیسیٰ آئیں گے تو برنباس ان کے ساتھ ہوں گے۔ اس وادی کا نام دیا گیا ہے۔ بعد میں حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت بھی موجود ہے کہ انہوں نے برنباس سے ملاقات کی اور پھر

نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

میرے خیال میں یہ چوتھی اور پانچویں جہت کا سوال ہے۔ جب ہم اس جہت میں داخل ہوتے ہیں، جس میں روح ہے یا اس قسم کی باتیں ہیں' تو اس بارے میں پروردگار نے خود کہا' وما اوتیتم من العلم الاقلیلا' کہ ہم نے اس کا علم بہت مختصر لوگوں کو دیا ہے۔ ہمارے پاس ایک اور مثال موجود ہے۔ ایک بڑے سائیکک کی مثال نقل کر رہا ہوں۔ میں کمرے کے اندر تھا اور بیچ میں چار دیواریں حائل تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ باہر سے ایک شخص میری بات کرتے ہوئے گزر رہا ہے۔ میرا ان باتوں پر کوئی اعتقاد نہیں۔ میں بڑا ہی معروضی اور سائنسی آدمی ہوں۔ میں باہر نکلا' تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا اور پوچھا' ابھی تم میں کیا بات ہو رہی تھی؟ اس نے بتایا کہ ہم اس بارے میں بات کر رہے تھے تو میری تصدیق ہو گئی۔

ایک بیماری اور مرض کا ارتکاز ESP کو ابھار دیتا ہے یعنی Extra Sensory Perceptions کو اجاگر کر دیتا ہے۔ ہم ESP اسی کو کہتے ہیں کہ جب انسانی سیل کی تمام طاقت مساوی چارج نہ لے اور ایک خصوصی کیفیات کے سیل پر زیادہ مرتکز ہو جائے تو وہ یہ کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ واقعات چونکہ متعین ہیں تو وہ ان کو پڑھ لیتے ہیں۔ ہزاروں ایسے واقعات ہیں جن میں ہماری یہ جہت ڈیل نہیں کرتی۔ میتھوڈسٹ اس لیے ان پر اعتبار نہیں کرتا کہ اس کی زندگی میں اسے اس کا تجربہ نہیں ہوا ہوتا' مگر تجربہ نہ ہونے سے فنامنا کا نہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

فنامنا موجود ہوتا ہے۔ اس فنامنا کی قرآن مجید نے ہمیں خود خبر دی ہے کہ بعض واقعات اس روئے عالم پر ایسے ہوتے ہیں جو تمہارے قانون سے ملتے جلتے نہیں ہیں۔ جو اطلاق نہیں رکھتے۔ ہمیں سب سے پہلا واقعہ اس وقت ملتا ہے' جب حضرت سلیمانؑ کے دربار میں ایک جن نے فزیکل انجیکٹو پاور کا اظہار کیا اور کہا کہ اے پیغمبر میں ملکہ بلقیس کا تخت لا سکتا ہوں۔ اگر آپ دوپہر تک مجلس میں رہیں' مگر دوسرے صاحب نے کہا' کہ اے نبی اللہ! اگر مجھے اجازت ہو تو میں پلک جھپکنے میں تخت لا سکتا ہوں۔ یہ حضرت آصف بن برخیہ تھے۔ قرآن نے اس کو نقل کیا ہے اور تخت اسی وجہ سے پلک جھپکنے میں آیا۔ میرے پاس اس کی وضاحت موجود ہے کہ وہ کس طرح آیا؟ مگر وہ وضاحت سائنٹفک' سہل اور قابلِ فہم ہے کہ وہ شخص جو خدا کے اتنا قریب تھا اس میں اتنی لاجسٹکس موجود تھیں۔

بہت سارے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے زمانے کا بہت بڑا ولی تھا اور کوئی بھی ولی اپنے زمانے کے نبی پر شہادت بھی ہوتا ہے۔ اس نے اسم اعظم کی تلاوت سے اس تخت کو وہاں مادے سے توانائی میں تبدیل کیا اور توانائی کی صورت میں ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے تخت سفر کرتا ہوا حضرت سلیمانؑ کے دربار میں پلک جھپکنے کے اٹھارہویں ہزار حصے میں پہنچا۔

اگر آج دیکھا جائے تو انسانی ذہن بھی بالکل اسی قسم کے پراجیکٹس رکھتا ہے جتنے بھی نئے ہمارے پاس سائنسی امکانات آ رہے ہیں، فلمیں آ رہی ہیں، اس میں منتقلی کا عنصر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ آپ کبھی سٹار ٹریک موویز میں دیکھیں تو وہ اس تھیسز کو ممکن اور قابل فہم سمجھتے ہیں۔ اس پر عملی اعتبار سے تجربات بھی جاری ہیں اور شاید اس صدی کے دوسرے نصف میں انسان انرجی میں تبدیل ہو کر سفر کے قابل ہو سکے۔

فرشتوں کا کردار

فرشتوں کا رول وہی ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یعنی کارکنان قضا و قدر۔ مگر ہر مخلوق کو اپنی حیثیت کا کم علم ہوتا ہے جس کام میں ہم غیاب میں ہیں، وہ شہود میں ہیں جس کام میں وہ غیاب میں ہیں، کوئی اور شہود میں ہے۔ اس لیے مخلوق ارضی پر متمکن ملائکہ ہمارا بندوبست کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ جب لوحِ محفوظ سے اسکیم اترتی ہے، تو وہ ایک ہزار سال کی اترتی ہے۔ پھر ایک ہزار سال میں سے لوحِ محفوظ سے اتار کے ایک سو سال کا ٹکڑا آسمان اول کے ملائکہ کو دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جسے شب برات کہتے ہیں، یعنی شعبان کی پندرہویں کو ایک سال کا حساب ملائکہ دنیا کے حوالے کیا جاتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک شخص شادی کی تیاری کر رہا ہے اور ملائکہ کے حساب میں اس کی زندگی ختم ہے یا کوئی شخص حج کی تیاری کر رہا ہے اور اس کا حادثہ ہو جاتا ہے۔ یوں ایک سال کی سکیم اس شب کو اترتی ہے اور اس کی ہینڈلنگ ملائکہ کرتے ہیں۔

جیسے اللہ نے بدر میں کہا کہ ہم نے تمہیں پانچ ہزار ملائکہ سے مدد دی، مگر اگر ہم چاہتے تو اس کے بغیر بھی مدد کر سکتے تھے جو طریقہ کار اس نے وضع کیا، وہ یہی ہے کہ اس کے آگے کارکنان قضا و قدر اس کی دنیا کا بندوبست کریں۔ اسی طرح جب ہم سائنس دانوں پر غور کرتے ہیں اور ہم

کہتے ہیں کہ سائنس نے یہ کیا' وہ کیا۔ خدائے علیم و حکیم نے کچھ لوگوں کی محنت اور ان کی مسلسل جدوجہد کے باعث ان کو ایسی اصلاحات دیں' ترجیحات دیں کہ وہ انسانوں کے بندوبست میں خدا کے حکم کے ساتھ ان کی معاونت کرتے ہیں۔ یہ بڑی بڑی ایجادات اور بڑی بڑی اصلاحات ہیں' جو چھ ارب انسانوں کے کام آ رہی ہیں۔ اگر آج سے سو سال پہلے کا زمانہ ہوتا' تو ایک موچی' درزی' کاریگر کام کر رہا تھا' تو آج کی وہ ضرورت پوری نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سائنس دانوں کا کمال نہیں ہے بلکہ وقت کی ضرورت کے ساتھ ساتھ وقف لوگوں کو' جنہوں نے ارتکاز کیا' خدا نے صلاحیت فکر کے ساتھ وہ حل بخشے' جو ایک بڑی دنیا کو چلانے میں ان کے ممد و معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ ہر جگہ قضا و قدر کے کارکن موجود ہیں۔

معین وقت میں کمی بیشی

موت کا وقت ضرور مقرر ہے مگر موت کا جو وقت مقرر ہے' اس کا امکان ایک ہزار سال تک بھی ہے۔ ہمیں اپنے مطالعہ سے اس بات کا علم ہے کہ حضرت آدمؑ کی عمر ہزار برس ہے اور قرآن حکیم میں حضرت نوحؑ کی عمر 950 سال لکھی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی موت ضرور مقرر ہے۔ اس میں آپ اپنی نگہداشت' کاوش اور جدوجہد سے کتنا اضافہ کر سکتے ہیں' کتنی کمی بیشی کر سکتے ہیں' اس میں ضرور کوئی گنجائش ہوگی مگر یہ کہنا کہ خدا کوئی وقت تبدیل نہیں کر سکتا' سراسر غلط ہے۔ اس لیے کہ وقت بھی اللہ کا ہے' موت بھی اللہ کی اور وقت مقررہ بھی اللہ کا ہے۔ اللہ نے خود قرآن حکیم میں یہ ارشاد فرمایا' جب ہم کسی آیت کو تبدیل کرتے ہیں وما ننسخ من آیات او ننسھا ناتہ بخیر منھا او مثلھا...... تو ہم اس سے بہتر آیت دے دیتے ہیں۔

اگر ایک آیت ہمارے زوال کی وجہ سے ہم پر مسلط ہے اور ایک آیت ہماری ناقص دوا یا کم خوراکی یا برے آثار کی وجہ سے ہے تو جب اسباب کے ساتھ اس زندگی کا تعین ہوگا اور وہ بہتر ہو جائیں گے تو پروردگار اوسط عمر بھی بڑھا دیں گے۔ سب سے بڑا تخلیق کار تو یہ بھی کہتا ہے کہ میں چاہوں تو ایک آدھ دن میں تم سے نجات حاصل کر لوں' تم پر موت وارد کر دوں مگر میں نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وقت مقررہ تک تمہیں ڈھیل دوں گا' چنانچہ وہ جو کچھ کرتا ہے' وہ اس کے اپنے موڈ کا پرتو ہوتا ہے۔ یہ اس کی اپنی ماہرانہ سرگرمی یا غیر سرگرمی پر منحصر ہے۔ ہماری سب کی زندگیوں کا دارومدار

اسی پر ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں کہ دعا قضا کو بدل سکتی ہے۔ جب لوگ کسی کے لیے زندگی کی طوالت کی دعا کرتے ہیں' تو خدا اس کی زندگی بڑھا بھی دیتا ہے۔ جب کوئی چیز نہیں ہے تو کیا ہمیں خدا کو یہ کہنا چاہیے کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا؟ کیا ہمیں خدا کو یہ کہنا چاہیے کہ آپ تو عمر بڑھا ہی نہیں سکتے؟

کسی کا سوال آیا کہ اس کے خیال میں خدا ماضی نہیں بدل سکتا۔ آپ کا خیال کیا ہے؟ تو میں نے اس سے صرف یہ کہا کہ اس کا جواب دو باتوں میں دیتا ہوں اور وہ یہ کہ ماضی' حال اور مستقبل سب ہمارے لیے ہیں' خدا کے لیے نہیں ہیں۔ خدا کے لیے کوئی ماضی نہیں ہے۔

دوسرا میں نے کہا کہ ماضی بدلے گا وہ' جب اس نے اسے ادھورا بنایا ہو۔ خدا کو ماضی بدلنے کی ضرورت کیا ہے؟ کیا اس نے کوئی کمی یا بیشی چھوڑ دی تھی کہ اسے بنانے کے لیے واپس پلٹے؟ وہ کامل ہے اور اس سے کاملیت کا استخراج ہے۔ ماضی بھی اس نے ویسے ہی بنایا ہے۔ وہ اسے کیوں تبدیل کرے؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ سوال کہہ دے کہ کیا اللہ اپنے سے بڑا کوئی پتھر نہیں بنا سکتا۔ اس طرح کے بہت سے سوالات ہمارے رستے میں آتے ہیں' جو شاید الوہیت کے لیے ایک چیلنج ہوں' کم از کم میرے لیے نہیں ہیں۔ یہ براہِ راست اللہ کے لیے چیلنج ہے کہ وہ زندگی کو تبدیل کرسکتا ہے کہ نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ بہت مرتبہ ایسا ہوا بھی ہے کہ زندگی بڑھی ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت سعدؓ کی ہمارے پاس روایت موجود ہے۔ دونوں کیسوں میں اللہ کے رسولؐ نے ان کے لیے دعا کی اور انسؓ کے لیے خاص طور پر درازیٔ عمر کی دعا کی۔ انہوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ دوہتوں پوتوں کے وارث ہوئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ان کی درازیٔ عمر کی وجہ رسول کی دعا تھی۔

علمِ نجوم اور علمِ ہیئت

حضور گرامی مرتبت نے فرمایا کہ نجوم ایک پیغمبر کو عطا کیا گیا جس کی لائن اس سے مل جائے' وہ ٹھیک ہے۔ نجوم ایک سہولت انساں تھی۔ اس وقت کے لوگوں نے اسے انسانی ہدایت و رہنمائی کے لیے سیکھا۔ اس کا مقصد عادت کو منضبط کرنا اور اس کو قید میں لانا ہے۔ ستارے مسلسل ایک روٹین کے ساتھ چلتے ہیں۔ لوگوں نے مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ مریخ' مشتری کی جگہ پہنچے تو یہ

واقعات اور موسم مین یہ ردّ و بدل ہوتا ہے اور اگر مشتری مریخ کی جگہ یا زہرہ عطارد کی جگہ پہنچے تو صورت حال مین یہ تبدیلی آتی ہے۔ ایک سرکل سا بنا ہوا ہے' جیسے کوئی آسمانی گرڑھی ہو۔ ان کے ہیر پھیر میں جس وقت میں جو کیفیتیں محسوس کیں' انہیں لوگوں نے نوٹ کیا۔ یہ ماقبل سائنس تھیسز اور حساب کتاب ہے جو کبھی ٹھیک بھی نکلتا ہے مگر اس کا مقدر کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔

اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے یہ کہا کہ ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی' وہ مردود ہے اور جس نے یہ کہا کہ اللہ کی وجہ سے ہوئی' وہ مسیحا ہے۔ نجوم کی حیثیت ایک علمی تحقیق کے طور پر اب بھی موجود ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے کہا کہ خدا دو قسم کے علوم میں سے اس علم کو رکھ چھوڑتا ہے' جس میں انسان کی بہتری ہو۔ اسٹرالوجی اور اسٹرانومی اکٹھے تھے۔ ان میں تقسیم ہوئی۔ اللہ نے جس مین انسان کی فلاح و بہبود دیکھی' وہ اسٹرانومی (علم ہیئت) تھا۔ اس کو عزت اور ترقی بخشی اور علم نجوم اب اندھیری راتوں میں امید و یاس و شیطانی وساوس کا مرکز بن کر رہ گیا ہے۔

اجرامِ فلکی کا انسانی زندگی پر اثر صرف شعاعی اثرات کی حد تک ہے۔ وہ آپ کا مقدر نہیں ہیں۔ چاند اور باقی ستاروں سے بھی ایسی شعاعیں نکلتی ہوں۔ الفا' بیٹا' گاما ریز' ضرور آپ پر اثر انداز ہوں گی' مگر ان کا مقدر سے کوئی تعلق نہیں۔ جس انسان نے یہ گمان کیا کہ ستارہ اس پر حکمران ہے' اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔ البتہ آپ ان میں علمی حیثیت سے دلچسپی لے سکتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ کس قسم کی گیسیں ہیں اور کیا امکانات ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ نے ان کو اٹکل پچو والے خناس کا نام دیا ہے۔ اس سے زیادہ ان کی کچھ اہمیت نہیں۔

ماورائی قوتیں' پیشین گوئی

انسان ماورائی قوتوں سے نہیں' پیشین گوئی نارمل قوتوں سے کر سکتا ہے۔ ماورائی قوتیں وجود نہیں رکھتیں۔ ماورائی قوتیں ابنارمل اور سب نارمل کیٹیگریز مین چلی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ جو اقتصادیات کے ماہر ہوتے ہیں' جو رجحانات اور امکانات پر نگاہ رکھ سکتے ہیں' وہ آسانی سے کسی مارکیٹ کے عروج و زوال کی نشاندہی کر سکتے یں۔ اسی طرح ان لوگوں نے' جنھوں نے تاریخ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے' وہ بڑی آسانی سے کسی قوم کے عروج و زوال کی وہ ساعتیں گن سکتے ہیں' جس سے وہ قوم گزر رہی ہوتی ہے۔ ان میں کوئی علم ماورائی علم نہیں ہے۔

بہت سارے علوم پہلے عام نفسیات میں پیراسائیکالوجی بنے ہوئے تھے۔ سائیکالوجی ان چیزوں کو جن کو وہ سمجھ نہ پائی تھی' پیراسائیکالوجیکل اثرات کہلاتی تھی۔ نفسیات چونکہ اب سائنس ہے تو جن کیفیات کو نفسیات اصولاً بیان نہیں کر سکی' ان کو مابعدالنفسیات کہتی ہے۔ جیسے روح ہے مگر جب سے نفسیات اور پیراسائیکالوجیکل کانسپٹ شروع ہوئے' اب یہ عالم ہے کہ بے شمار وہ مضامین' جو پیراسائیکالوجی کے تھے' باقاعدہ نفسیات کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہ اب پیراسائیکالوجیکل نہیں ہیں۔

دراصل اب پیراسائیکالوجی کے پاس صرف ایک دو موضوعات رہ گئے ہیں۔ جن میں سب سے سرکردہ سپرٹ ہے' جسے آپ روح کہتے ہیں یا چار چیزیں ایسی ہیں' جن کو آپ ٹیلی پیتھی' ٹیلی کائناسس کلیئروائنس کہتے ہیں۔ ان کو پیراسائیکالوجیکل انسٹی ٹیوشن سمجھا جاتا ہے۔ مگر ہوسکتا ہے کہ کل کو دو' چار سال برس گزرنے کے بعد یہ بھی اصولاً سائیکالوجیکل قابل فہم قوانین ہو جائیں۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں ایک انسان کی کیفیات نفسی کا مطالعہ ہے۔

علم کے چار درجات ہیں۔ ایک جبلی ہے۔ دوسرے درجے میں تعقل ہے۔ تعقل مسلسل غوروفکر سے وجدان میں ڈھلتی ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تشخیص نہیں۔ مزید ریفائنمنٹ کے نتیجے میں الہام پیدا ہوتا ہے۔ یہ تعقل کی آخری ڈگری ہے۔ الہام کا سادہ سا قانون اللہ نے قرآن حکیم میں دیا ہے۔ فرمایا: ونفس وما سوھا' ہم نے نفس انسان کو درست کیا۔ فالھمھا فجورھا و تقوھا ' ہم نے ہی اس پر الہام کیے' فسق وفجور' اور ہم نے اس پر تقویٰ کے خیالات الہام کیے' چنانچہ ہمارے الیکٹروکارڈیوگراف اور برین گراف میں دو مختلف اقسام کے خیالات کی روئیں سموئی گئیں اور ہر کرنٹ اپنے ساتھ ایک پیکیج آف تھاٹ رکھتی ہے۔ یہ خیالات کا پیکیج منفی ہے یا مثبت۔ اگر آپ منفی خیالات کو خدا اور مذہب کی تفہیم کے ذریعے ختم کر دیں تو بالآخر آپ کے پاس صرف خیالات کی ایک سیریز رہ جاتی ہے اور وہ الہام خیر ہے۔

لوگ جو الہام کا دعویٰ کرتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ ہمیں الہام آیا۔ جب وہ الہام غلط ہو جائے تو وہ اس کی تاویل دینا شروع کر دیتے ہیں۔ الہام کبھی غلط نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ قرآن حکیم میں اللہ نے کہا کہ خیر وشر دونوں الہام ہیں' اس لیے بہترین وہ انسان ہے جو شر کی ٹیکنالوجی کو زیادہ جانتا ہے' کیونکہ اس سے الہام خیر تک پہنچنا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ ان کے دل سے وسوسہ شیطان

گزرتا ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے ذہن کے کمپیوٹر کو اللہ کا ڈیٹا صحیح طور پر پہنچایا ہوا ہے تو یہ مائنڈ اتنا خبردار ہوتا ہے کہ جونہی اس سے منفی خیال گزرتا ہے' اس میں گھنٹی بج اٹھتی ہے کہ یہ غلط ہے' غلط ہے' غلط ہے۔

بعض اوقات یہ کراس کرنٹ اتنی نازک ہو جاتی ہے کہ کبھی سارا خیر شر ہوتا ہے اور کبھی سارا شر خیر ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں پروردگار نے کہا ہے کہ خیر و شر دونوں فتنہ ہیں۔ دونوں آزمائش ہیں۔ گفتہ کہ خیر او نہ شناسی ہمی شر است۔ کبھی شر ندامت اور توبہ پیدا کرتا ہے اور یہ خیر ہے۔ کبھی خیر تکبر اور استہزا پیدا کرتا ہے اور یہ شر ہے۔ دونوں کی کیفیتیں معروضی ہیں۔ بذاتہٖ ان دونوں انسٹرومنٹس کو اچھا یا برا نہیں کہا جا سکتا۔ ایک پیکیج کو پیکیج آف گڈنس کہتے ہیں اور ایک پیکیج کو پیکیج آف ایول کہتے ہیں۔ مگر جب ہم ان پر عمل کریں گے تو ہمارا رویہ ان میں طے کرے گا کہ کس حیثیت سے ہم خیر کو پہچانتے ہیں اور کس کو ہم شر سے پہچانتے ہیں۔

یہ ایک ایسی نازک سائنس ہے' جس کو سمجھنے کے لیے ہمیں بہت زیادہ نیات رسولؐ کے قریب جانا پڑتا ہے۔ ہم حدیث رسول کو بڑی توجہ سے پڑھیں۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹی سی حدیث معانی میں کتنی گہری ہے کہ ایک پوری کتاب اس پر لکھی جا سکتی ہے۔ فرمایا' زیادہ مت ہنسو۔ زیادہ ہنسنے سے روح مردہ ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کو تھوڑی روشنی دی جائے تو وہ قابل برداشت ہے۔ مگر اگر آپ اندھیری سڑک میں بہت بڑی فلیش کے سامنے آ جائیں تو آپ کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ آپ بہت زیادہ روشنی کے مقابلے میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے کہا جائے کہ جو لوگ خوشیوں کی آرزو کرتے ہیں جو ہر وقت آسانیاں ڈھونڈتے ہیں جب ان کو مشکل حالات سے واسطہ پڑتا ہے تو تاب مقاوت نہیں ہوتی۔ وہ جلدی نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شفاعت اور قانونِ عدل

شفاعت قانون عدل کے بالکل خلاف نہیں ہے۔ جن لوگوں نے زمین پر کوئی ایسا کام کیا ہے تو خدا اسے زمین پر ہی ایسی مصیبت میں ڈال دیتا ہے کہ وہ زمین پر اپنا حساب کلیئر کر جاتا ہے۔ شفاعت ہر مسلمان کے لیے اس لیے واجب ہو جاتی ہے کہ جسے دل سے خدا اور رسالت کا یقین ہے' اس کا حساب کافی حد تک دنیا میں ہو جاتا ہے۔ باقی جو اس کے ذاتی گناہ ہیں' وہ اللہ اور بندے کے درمیان میں۔ خدا کی ایک صفت ستار العیوب بھی ہے۔ جب ایک گناہ کا لوگوں کو نہیں پتہ' تو خدا کہتا ہے' اے بندے! لوگوں سے تو نے اپنی عیب پوشی کی' میں بھی تیری عیب پوشی کروں گا۔

ان ربی یعفل مایشاء کے تحت بے شک خدا کسی چیز کو بھی استثنیٰ قرار دے سکتا ہے۔ مگر آپ کا دین بڑا عجیب وغریب ہے۔ یہ قانون ایسے بنا دیا گیا ہے کہ ہر قانون میں استثنیٰ ہے۔ حتیٰ کہ نماز میں 27 استثنیٰ ہیں۔ اتنا عجیب قانون ہے کہ اس میں ہمیشہ باہر نکلنے کا راستہ موجود ہے۔ ایک شخص کو جب زنا کی سزا دے رہے تھے' تو اصحاب نے کہا' یا رسول اللہؐ! اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ فرمایا' بھاگنے دیا ہوتا۔ بدترین ناقابل معافی گناہ قتل ہے۔ تین استثنیٰ اس میں بھی موجود ہیں۔ چاہے تو معاف کر دے' چاہے تو اس کا خون بہا لے لے اور چاہے تو اسے کم تر سزا پر ڈال دے۔ کیونکہ یہ وارثین کی مرضی ہے۔ ہر قانون میں اللہ تعالیٰ نے اتنی استثنیٰ رکھی ہیں کہ میرے خیال میں دنیا کا کوئی ایسا قانون دان اتنا مہربان نقطہ نظر نہیں رکھ سکتا' جتنا کہ اللہ نے اپنے مذہب کو بنایا ہوا ہے۔ ما انزلنا

الیک القرآن لتشقی۔ ہم نے قرآن کو مشقت کے لیے نہیں اتارا۔

نجات کی کم سے کم شرط

نجات کی کم سے کم شرط اتنی کم ہے کہ میں اکثر سوچتا ہوں کہ نجات مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اس حوالے سے دو چار احادیث تواتر سے جو ہمیں ملتی ہیں ان میں ایک یہ حدیث موجود ہے جس میں معیار اتنا کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ فرمایا' جس نے دل سے ایک مرتبہ بھی لاالــــہ الا الله محمد رسول الله کہہ دیا' اسے دوزخ کی آگ نہیں جلا سکتی۔ اسی کے ساتھ تھوڑے سے اور پیٹرن بھی ہیں کہ جس جوان کی آنکھ سے اللہ کے لیے ایک آنسو نکلا' اس پر بھی دوزخ کی آگ حرام ہے۔ قرآن حکیم میں خود اللہ نے فرمایا' شیطان سب لوگوں کو بہکائے گا مگر جس کے دل میں میرے لیے ایک ذرّہ بھی اخلاص موجود ہے تو اسے بہکا نہیں سکے گا۔ الاعباداللہ المخلصین۔ ان کو تم نہیں چھو سکتے۔

(نجات بہت آسان ہے اور یہ اتنی آسان ہے کہ ساری زندگی ہم نجات سے نجات حاصل کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہم یہ کیا کرتے پھرتے ہیں۔ مسلمانوں کی زیادہ کوشش یہ ہے کہ نجات کے انسٹی ٹیوشن سے ہی نجات حاصل کرلیں۔)

حور و قصور اور شراب طہور

ایک عمومی حالت پر خدا کے ڈیزائن کا گمان نہیں کرنا چاہیے کیونکہ پروردگار کے ہاں پورا قرآن کم از کم صورتحال پر اترا ہے یعنی اس پست ترین حالت کو کور کر رہا ہے' جو کسی انسان کی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر نماز' روزہ جیسا قانون بہترین پر لاگو نہیں ہوتا۔ نماز کا ستر اس شخص کے لیے نہیں ہے' جس کے پاس کپڑا موجود ہے بلکہ اس شخص کے لیے' غلام کے لیے ہے' جس کے پاس سرے سے کپڑا موجود ہی نہیں۔

تو کم از کم سطح پر جا کر اللہ کا قانون لاگو ہوتا ہے اور کم از کم سطح پر اس کے ثواب و عذاب ہوتے ہیں۔ پروردگار نے یہ فرمایا کہ ما انزلنا علیک القرآن لشقی' کہ ہم نے قرآن کو مشقت کے لیے نہیں اتارا۔ ثواب و عذاب کی جن آیات کو ہم پڑھتے ہیں' وہ ایک عمومی آیات

ہیں۔کوئی بھی آدمی گروہ میں سے مختلف سوچ رکھ سکتا ہے مگر اٹھانوے بندے آپ کی طرح نہیں سوچیں گے۔وہ عذاب وثواب کو بعینہٖ انہی معنوں میں لیں گے جو خدا نے بتائے ہوئے ہیں۔

(مثال کے طور پر بازار میں ہزاروں آدمی ہیں۔پھل بیچنے والا ہے۔ریڑھی والا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا۔ایک ریڑھی والا بڑی مشقت کررہا ہے۔مدتوں سے ریڑھا چلا رہا ہے۔سوچا' یہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟ میں نے اپنی زندگی پر نفرین کی کہ مجھے دیکھو' میں نے ایک دن بھی ریڑھا نہیں چلایا لیکن اس سے زیادہ کما رہا ہوں۔ایسا کیوں ہے؟ مجھے یہ یقینی خیال آیا کہ اگر اللہ نے اس کی محنت کے ساتھ اس کی عقل نہ محدود کر دی ہو' تو شاید دنیا میں کوئی بھی اپنے سٹیٹس آف لائف سے مطمئن نہ ہوتا۔بڑا انسان وہ ہے' جو چوائس رکھتا ہے اور پھر ایک چھوٹے سے سٹیٹس میں قید ہے مگر جن کو آپ چھوٹے سٹیٹس کا شکار سمجھتے ہیں' وہ اپنے ساتھ اسی سٹیٹس کے ذہنی روّیے رکھتے ہیں۔

اسی لیے انعام و اکرام میں بھی پروردگار نے جو جنرل کیڈر مقرر کیا ہے' ان میں تو حور وقصور بڑی قیمتی بات ہے مگر دراصل خداوند کے انعامات اوپر چلتے ہوئے کچھ اور بھی ہیں جیسے مقامِ رضا' مقامِ محبت' مقامِ توکل' پھر خدا کی چاہت۔جو زیادہ سمجھ دار ہے' وہ آگے بڑھتا ہے۔تین جنتیں سنائی گئی ہیں۔تینوں گلیکسیز کے معیار چناؤ کے مختلف ہیں۔اس میں ایک وہ لوگ ہیں جو گناہوں سے بچتے ہیں۔ایک وہ ہیں جو نیکیاں کرتے اور عام قانون کے تحت چلتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو سابقون السابقون یعنی آگے بڑھنے والے ہیں۔مگر آگے بڑھنے والوں کو جو انعام اللہ نے دیا ہے' وہ اپنا آپ ہے۔اپنی زیارت اپنی صورت اور اپنا سایہ ہے۔اپنی محبت ہے' اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب بڑا انعام جو رسول اللہ کو دیا' وہ ہے ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ مقام بھی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔)

جنت دوزخ' ذہنی کیفیت

یہ سوال ایک مخصوص وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم پروردگارِ عالم کی کچھ صلاحیتوں پر شبہ کرتے ہیں۔ہمارا خیال یہ ہے کہ جو وعدے وعید ہمیں دیے گئے ہیں' یہ مفروضے ہیں۔جنت ایک کیفیت امن ہے اور دوزخ ایک کیفیت ذہن کا عذاب ہے۔بعض انٹلکچوئل' جن میں غلام احمد

پرویز بھی شامل تھے اور اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ ایسے تھے' جنہوں نے جنت اور جہنم کی کیفیات پر عملاً شبہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ انسانی امن کی کیفیت جنت ہے۔ جب ایک آدمی اچھے کام کرے گا تو ہمیشہ کے لیے دوامی امن نصیب ہوگا۔

مگر اس کی جو عملی صورت قرآن مجید میں آئی ہے۔ باغات' حور و قصور اور نعمت ہائے دنیا کی' اس کی روشنی میں یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ یہ خدا کے وعدے پر شک ہے۔ میں جو ذہین ہوں' میرے نزدیک ہو سکتا ہے امن بہت اعلیٰ ترین کیفیت ہو' مگر میرے جیسے کتنے لوگ ہیں جو اس ذہنی سطح پر ہیں اور جو اپنی آخری اور حتمی منزل قرار امن سمجھتے ہیں؟ ذہنی کیفیت امن کو جنت قرار دیں گے؟ ان لوگوں کروڑوں کے بارے میں کیا خیال ہے' جو ابھی رہ گزر میں ہیں۔ اس شخص کا کیا بنے گا جو ایک ریڑھی پر بیٹھا ہے۔ اس سے کوئی سیب لینے آیا ہے' سیب خراب ہے' وہ خدا کے خوف سے آگہی پا کر اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی جگہ اسے اچھا سیب دے دیتا ہے۔

ایک معمولی سی سطح عقل و ایمان کا وہ آدمی' جس کو اتنے دانشوروں سے واسطہ نہیں ہے' لیکن اندرونی طور پر وہ خدا پر یقین رکھتا ہے۔ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ میں اس وقت تنگی اور عسرت و بلا کے عالم میں ہوں۔ مجھے اس کے عوض اللہ نے گھونگھے اور موتی کا محل آفر کر رکھا ہے۔ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے ایسی متحیرانہ سہولتوں کا وعدہ کیا ہے' بشرطیکہ اس زمین پر میں اس کے احکامات پر عمل کر سکوں۔ ایمان اور خیال کی یہ وہ سطح ہے جو میرے پاس ہے' اتنی محدود ہے کہ جنت صرف معدودے چند لوگوں کو نصیب ہوگی اور بے شمار لوگوں کو ایسی کوئی چیز نصیب نہ ہوگی جن کا وعدہ اللہ نے انہیں دیا ہے۔

مگر قرآن میں دیکھئے کہ جنت کیا ہے؟ جو پروردگار عالم بے پناہ گلیکسیز کا مالک ہے۔ جو زمین و آسمان کی تخلیقات کا باعث ہے اور ایک نہ حساب میں آنے والے حساب کا مالک ہے۔ وہ جنت کو خالی و خیالی دنیا بنا کر آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتا' جس خدا نے اس معمولی سے اطمینان اور تعیشات کی ایسی دنیا کو تخلیق کیا ہے' جس کی حیثیت بقول رسولؐ ایسی ہے جیسی کہ وسیع و عریض جنگل میں ایک پڑا ہوا چھلہ یا حلقہ ہو اور اس کی کائنات اتنی وسیع ہے کہ جس کائنات میں ارب ہا ارب سورج ہیں۔ یہ اتنے مختلف رنگوں کے ہیں کہ کوئی سورج کرمزی شعاعیں پھینک رہا ہے تو کوئی سبز۔ کوئی سورج سرخ شعاعیں پھینک رہا ہے تو کوئی نارنجی۔ ان کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں ہے۔

اس خدا نے جس جگہ جنت بنائی ہے جو گلیکسی اس نے تعمیر کی ہے' اس کا ایک حدود اربعہ قرآن نے دیا ہے۔ فرمایا: عرضھا السموات و الارض ۔ ہم نے اہل ایمان کے لیے جو جنت تخلیق کی ہے' اس کی چوڑائی زمین و آسمان کی لمبائی کے برابر ہے۔ یہ اتنی بڑی وسیع و عریض گلیکسی اللہ نے بنائی ہے۔

اگر آپ کے دنیا کے پہاڑ میں ایک سبز پٹی زمردیں پہاڑ کی طرف اشارہ کر سکتی ہے تو کتنے ہی ارباب ہا سالوں سے یہ قائم جنت کے پورے کے پورے پہاڑ بھی زمردیں ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک اور اشارہ اور ایک کنایہ ہے۔ اگر کسی سمندر کی کوکھ سے نیلم نکل سکتے ہیں تو کسی سمندر کی زمین بھی نیلم ہو سکتی ہے۔ اگر مارکونی کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک اپنا پیغام پہنچانے کے بعد آج اتنے عظیم الشان الیکٹرانک کمپلیکس تعمیر ہو سکتے ہیں تو خدا بھی مثال کے طور پر جنت کی ہر کیفیت کو زمین پر وارد کرتا ہے تاکہ آپ کو کوئی شبہ نہ رہے کہ وہ گھونگھے اور موتی کے محل تخلیق کر سکتا ہے۔ ایسی بھی مٹی پیدا کر سکتا ہے جو دودھ کی طرح سفید اور مشک کی طرح خوشبودار ہو۔ ایسے تمام سوال اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہم اللہ کی قوتِ تخلیق پر سوال کرتے ہیں۔

جنت اور دوزخ مفروضے نہیں' حقائق ہیں۔ ہم نے ابھی پہلے آسمان کی دہلیز کو عبور نہیں کیا۔ پچھلے دنوں ناسا کی رپورٹ کے مطابق انہوں نے ایک نیا ایسا ستارہ دریافت کرلیا ہے۔ ایسی گلیکسی دریافت کی ہے جس کو انہوں نے کرائسٹ کی گلیکسی کا نام دیا ہے۔ وہ اتنی روشن اور منور ہے کہ انہوں نے گمان کیا' یہ جنت ہے مگر وہ جنت نہیں ہے۔ جنت اتنی بڑی ہے کہ رسولؐ گرامی کے مطابق اس کا ایک مکان دوسرے مکان سے پانچ سو برس کے فاصلے پر ہے۔ پوچھا گیا' یارسول اللہؐ! لوگ ایک مکان سے دوسرے مکان تک کیسے جائیں گے؟ فرمایا' براق کے ذریعے۔ براق برق سے ہے۔ یعنی جنت ستاروں کی گلیکسی کی طرح ہے' جس میں ہر ستارہ مکمل طور پر آزاد ہے۔

ذرا شیخ عبدالقادرؒ کی چہل کاف پڑھیے۔ ایک صوفی کو شاید اس بات کا علم تھا۔ کہا' اے ستارہ دل من کہ مشابہ ہستی ستارہ آسمان را کہ میرے دل کی صورت کے مقابل میرا ایک ستارہ ہے۔ میری افلاک میں ایک زمین ہے' جس زمین میں میرا اکتساب اس پر اثر ڈالتا ہے۔ کیا آپ رسول گرامی مرتبت کا یہ قول بھول گئے کہ جس نے ایک مرتبہ زبان سے **سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم استغفر اللہ** کہا' اس نے جنت میں درخت لگایا اور جتنی مرتبہ چاہیں'

آپ اس جگہ میں جو آپ کا مقسوم ہے' آپ کا نصیب ہے' اپنی کارکردگی سے اس کی فضا کو منور کر سکتے ہیں۔ اپنے اعمال سے اس کی زمین روشن کر سکتے ہیں۔

پھر خدا نے خلیفۃ اللہ فی الارض بنا کر آپ کو دیا کیا ہے؟ کیا آپ اس چیز پر نازاں ہیں کہ افلاس کے مارے ہوئے ایک غریب چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے کو جا کر یہ فخر سنائیں گے کہ تم مخلوقاتِ ارضی کے خلیفہ ہو؟ کیا آپ اسے یہ تفاخر دیں گے؟ وہ تو کہے گا کہ ہر چیز جہنم میں جائے' میں ہوں کیا؟ میں تو بھوکا ننگا مر رہا ہوں۔ میں کہاں سے خلیفۃ اللہ فی الارض ہوا؟ دراصل خلیفہ کا مطلب یہ تھا مستقر او متاع الی حین' کہ زمین پر اس خلافت کی ابتلا و آزمائش ہے۔

خلیفۃ اللہ فی الارض اور فی السموات بنانے سے پہلے تو وہ خلیفۃ اللہ فی السماء ہوا' جب اسے ملائکہ' شیاطین اور جنات نے سجدہ کیا۔ پھر اس کو نکال کر اس زمین پر اس لیے پھینکا گیا کہ وہ لفظی عقیدے سے ایک عملی عقیدے میں جائے۔ جب وہ لفظی سے عملی عقیدے کو جاتا ہے تو پھر اسے خلافت آسمانی دی جاتی ہے۔ اس کو سٹار بخشا جاتا ہے۔ ایک گلیکسی عطا کی جاتی ہے جس میں وہ اپنی عبادات کے اشغال کے ساتھ ساتھ اپنی مرضی کے مطابق زندگی تخلیق کرتا ہے۔ وہاں وہ اللہ کی طرح خالق اور باری ہے۔ اللہ کی طرح مصور ہے۔ یہ تخلیق کی انتہا ہے۔ یہ ایک مخلوق کا اعلیٰ ترین رتبہ ہے۔

خداوند کریم نے انسان کو زمین پر دو چیزیں دیں اور ایک چیز چھین لی۔ وہ مرید تھا' قدیر تھا اور متکلم تھا۔ اللہ مرید ہے' قدیر ہے متکلم ہے۔ ارادہ کرتا ہے اور ارادہ قدرت رکھتا ہے۔ جب کلام کرتا ہے تو وہ چیز ہو جاتی ہے مگر انسان سے اس نے حسِ مزاح برتی' مرید بنا دیا' متکلم بنا دیا' قدرت چھین لی۔ وہ قدرت دے بھی نہیں سکتا تھا' کیونکہ ایگزیکٹو پاور کے کچھ ٹسٹ ہوتے ہیں۔ آپ نے اس قدرت کو تھوڑا سا استعمال کر کے دجل و فریب کی ایک دنیا آباد کر لی۔ خدائی کو چیلنج کرنا شروع ہو گئے۔ آج چھ ارب انسانوں میں سے پانچ ارب' اللہ پر کسی قسم کا یقین و اعتقاد نہیں رکھتے۔ وہ آپ کو تمام طاقتیں کیسے دے سکتا تھا؟ اس نے یہ طاقت آپ کے لیے آخرت میں سنبھال لی۔ جنت کیا جگہ ہے کہ جس میں آپ صرف خواہش کریں گے اور وہ چیز آپ تک پہنچ جائے گی۔ آپ آرزو کریں گے اور وہ پوری ہو جائے گی۔ آپ ارادہ کریں گے' وہ مکمل ہو جائے گا۔ ان دو صفات کے ساتھ' جو زمین پر ہیں' آپ کو قدرتِ الٰہی کا کچھ حصہ بھی انعام میں ملے گا اور

اس قدرت کے ساتھ آپ اپنا وہاں گھر بھی سنواریں گے۔ آپ کو خلافتِ ارضی کا مستحق سمجھا جائے گا۔

اسی طرح جہنم کو دیکھ لیجیے۔ زمین کی تہوں میں اتر جایئے اور قرآن کے الفاظ ساتھ لے کر جایئے۔ پگھلا ہوا تانبا' پگھلی ہوئی دھاتیں' نمک کے ستون' اُبلتا ہوا لاوا' ئے خروش۔ آپ زمین کے مرکز کو دیکھئے' تو جہنم کی اس سے زیادہ کوئی خوبصورت تعبیر نہیں ہوسکتی۔ جہنم ارب ہا سالوں کا وہ سٹار ہے' جو ابھی بننے کے اسٹیج میں ہے۔ جیسے زمین کا کرسٹ آباد ہے' جو ابھی ٹھنڈک میں نہیں آیا۔ آپ جہنم کو دور کیوں دیکھنے جاتے ہیں۔ اگر آپ کو زمین کے باطن میں قید کر دیا جائے تو آپ جہنم سے بدترین فضا دیکھیں گے۔ مسموم آگ جلانے والی' پگھلے ہوئے لاوے' زقوم اور وہ پتھر جو دھنک رہے ہیں۔ آگ میں' یہی فضا جہنم کی ہے۔ جہنم ایک ایسے سٹار کی طرح ہے جو ابھی تخلیق کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ ایک ایسا جلتا ہوا' بھڑکتا ہوا ستارہ ہے' جس میں آپ کو رکھا جائے گا۔

(حضور اکرمؐ سے پوچھا گیا' یارسول اللہؐ! اگر جنت اتنی بڑی ہے تو جہنم کہاں ہے؟ اگر جنت کی چوڑائی ساتوں زمین و آسمان کی لمبائی سے بڑی ہے تو پھر جہنم کہاں ہے؟ فرمایا' جب دن طلوع ہوتا ہے' تو رات کہاں جاتی ہے؟ اگر غور کیجیے' تو جواب ذہنی طور پر مناسب نہیں لگتا ہے اس لیے کہ دن اور رات کی کیفیات اور نتائج ہیں۔ جب کہ سوال پوچھا جا رہا ہے جگہ کا۔ مگر رسول اکرمؐ نے بڑی ذہانت سے جواب دیا کہ دن اور رات دونوں ایک کیفیت سے ہیں' سورج سے ہیں۔ جب زمین سورج کے سامنے ہوگی تو منور ہوگی۔ جب زمین سورج کے سامنے نہ ہوگی تو تاریکی ہوگی۔ جنت چونکہ جلال و جمال پروردگار کے سامنے ہے اس لیے جنت اور آخرت میں جو چیز خدا کے دیدار سے محروم ہے' وہ جہنم ہے۔ جس مقام پر پروردگار عالم کے کرم کی نوازشات کی نظر نہیں پڑ رہی' وہ جہنم ہے۔ سب سے بڑا انعام جنت میں اشیاء کا نہیں' حور و قصور کا نہیں بلکہ دیدار خداوند کا ہے۔)

جنت زمین پر ممکن

آپ مرنے کے بعد بھی ہمیں مرواؤ۔ اس زمین سے تو ہم پہلے ہی تنگ ہیں۔ اب مرنے کے بعد بھی آپ ہمیں یہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسا کہنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ

حدیث یہ کہتی ہے کہ اَرواح انسانی کی جو نیک روحیں ہیں، وہ عالم علیین کو جائیں گی اور جو مردہ روحیں ہیں، وہ عالم سجین کو جائیں گی۔ کسی نے پوچھا کہ عالم سجین کیا دنیا میں واقع ہے؟ تو حضورؐ نے اس کے جواب میں ہاں فرمائی۔ عالم سجین کی روحیں جہنم میں روانہ ہونے سے پہلے Terrestrial Under World میں رکھی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے زمین کم از کم جنت نہیں ہوسکتی۔

نفس اور رُوح

نفس اور روح دو علیحدہ چیزیں ہیں۔روح پروردگار کا امر ہے۔یسئلونک عن الروح کل روح من امر الله 'یہ اللہ کا حکم ہے' بنیادی چپ ہے۔معمولی سی ڈسک' باریک سے ذرّے کی شکل میں' جس میں پورے انسان کی جینٹک کوڈ محفوظ ہے۔جب حضرت آدمؑ کو ان کی اولاد بے شمار ذرّوں کی شکل میں دکھائی گئی تو وہ اتنے باریک تھے کہ وہ تمام ان کی ہتھیلی پر سما گئے۔ان میں سے کچھ سیاہ اور کچھ چمکدار تھے۔آدمؑ ان کو دیکھ کر روئے کہ میری اولاد میں سے کچھ عذاب پائیں گے اور کچھ ثواب۔

مگر اس حدیث آدمؑ سے روح کی نوعیت کا پتہ چل جاتا ہے۔یہ امکانی حد تک ایک باریک ایٹم ہے۔ممکن ہے کہ ہیسان اور میسان سے بھی باریک ایٹم' جو انسان کے جسم باطن میں بڑی ہی باریکی اور احتیاط سے رکھی جاتی ہے۔اس میں پورے پورے احکامات خداوندی کی کوڈ ہے' جو اللہ کی شناخت کا علم ہے اور وہ نسیان کا شکار ہو چکی ہے۔جب یہ عمر ختم ہو جاتی ہے تو پھر اسی کو واپس نکالا جاتا ہے۔

مگر نفس جبلی اقدار اور آپ کی حاصل کردہ حیوانی اور شعوری جبلتوں کے مجموعے کو کہتے ہیں۔نفس کو انگریزی میں Id ego اور سپر ایگو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔عربی میں اسے نفس عمارہ' نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے یا جبلت' انائے مطلق اردو میں کہا گیا ہے۔یہ اس کی تین کیفیتیں ہیں جس میں یہ بتدریج ترقی کر کے جاتا ہے۔ہمیشہ خدا مخالف ہے' اس لیے پروردگار

نے کہا کہ اما من خاف مقاما ربه ونهى النفس عن الهوى کہ جو اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا' اس نے ہمیشہ اپنے نفس کی مخالفت کی۔ چاہے وہ اس کو کتنا ہی نیکی پر کیوں نہ اکسائے۔

لیکن روح کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں اس کے بارے میں بہت تھوڑا علم دیا ہے اور یہ اللہ کا حکم ہے۔ یہ یقیناً دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ روح علیحدہ چیز ہے' نفس علیحدہ چیز ہے۔

نفس کی ورغلاہٹیں

نفس کس چیز کی آرزو کر سکتا ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے زیادہ عنوانات نہیں ہیں۔ اس کے ہیڈز اللہ نے گنوا دیئے ہیں۔ ذوالجناح للناس حب الشهوات من النساء والبنين والقناطير للمقنطرة والفضة یہ خاصائے نفس ہے۔ میں نے کبھی نفس کو یہ نہیں کہا کہ تو کم بخت ہے۔ میں اس کی صلاحیت خیر سے آگاہ ہوں۔ جو اپنے اندر کی دی ہوئی صلاحیت عقل کو نہیں پہچان سکتا' وہ دراصل نفس کے شر کا شکار ہے۔

نفس میں ایک بڑی اچھی عادت بھی ہے جہاں یہ آپ کو ورغلاتا ہے' ترغیب دیتا ہے' وہاں تجسّس پیدا کرتا ہے۔ یہ تجسّس ہو سکتا ہے' پورنوگرافک موویز کو چلا جائے۔ ایک بچہ گھر سے بھاگ کر باہر کوئی فلم لگی ہو' اس پر چلا جائے۔ اسی تجسّس میں کوئی بچہ کسی مشین کے اندر ہاتھ دے دے مگر نفس تجسّس کو ابھارتا ہے۔ جب اس کو علم مل جائے' تو یہ سیدھا ہو جاتا ہے۔ یہ نفس کی خوبی ہے کہ جن جبلتوں کا مجموعہ ہے' ان تمام جبلتوں کا علاج علم ہے اور علم کا انسٹرومنٹ انسان کے پاس ہے۔ ہو سکتا ہے کہ باوجود بے پناہ علم کے اس کی شرارتیں باقی رہ جائیں۔ اس کے تحفظات اتنے نہ ہو سکیں' جتنے آپ چاہتے ہیں لیکن یہ تو بتائیے کہ خدا کب آپ سے اتنی پاکیزگی کی توقع رکھتا ہے؟ خدا تو آپ سے پاکیزگی کا لفظ ہی نہیں سننا چاہتا۔

رسولِ اکرمؐ کی حدیث ہے کہ جب اصحاب موسیٰؑ کے تقویٰ اور ان کی عبادات کا ذکر ہوا تو اصحاب رسولؐ نے کہا' یا رسول اللہ! ہم بھی گناہ کبھی نہیں کریں گے۔ جیسے تمازت آفتاب سے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے' غصے سے آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ فرمایا' تم ایسی بات کہتے ہو' خدا تمہیں زمین

کے صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دے گا۔ تمہاری جگہ وہ لوگ پیدا کر دے گا جو خطائیں کریں گے، گناہ کریں گے اور توبہ کریں گے۔ اللہ ان کو بخشنے میں زیادہ خوشی محسوس کرے گا۔ وہ بھلا آپ سے کہاں تقدس کی آرزو رکھتا ہے؟ یہاں تو خطاؤں کا ڈھیر لگا ہوا ہے، جس انسان کا لباس دیکھو گناہ آلود ہے۔ کوئی نہ کوئی کسب غلط لیے پھرتا ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی

میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

میں نے صلاحیت دی تھی، نماز کے لیے تم نے شراب خانے میں گزار دی۔ پڑھنے لکھنے کے لیے، تم نے جہالت اور تاش شطرنج میں گنوا دی۔ کوئی حرج نہیں۔ اے ابن آدم! تو بڑی حماقت کرے گا۔ مگر یہ حماقت نہ کر بیٹھنا کہ اللہ کی طرف سے مایوس ہو جائے۔ یہ کلی حماقت ہے۔ اگر وہ گناہ معاف نہ کرے تو وہ غفور اور رحیم ہی نہیں ٹھہرتا۔ اللہ کہتا ہے، میرے بندو! یاد رکھو کہ تمہارے گناہ وقتی ہیں۔ تمہاری زندگی کتنی ہے؟ ساٹھ برس، سو برس میں کیا کر لو گے؟ کتنی چوریاں، کتنے ڈاکے مار لیں گے؟ کیا میری رحمت بیکراں کے مقابلے میں تمہارا یہ وقفہ حیات بہت بڑا ہے؟

وہ ہر انسان خدا کا کفر اور اس کی توہین کرتا ہے، جب وہ یہ کہتا ہے کہ میرے گناہ اللہ کی رحمت نہیں بخشے گی۔ وہ لامتناہی رحمت کو محدود کر دیتا ہے۔ خطا تو ہم کرتے ہی رہتے ہیں۔ جہالت سرزد ہو جاتی ہے۔ میں گناہ و ثواب کو اس نظر سے نہیں دیکھتا۔ میں اسے حُسن اور بدصورتی کے ضمن میں دیکھتا ہوں۔ ہمارا حُسن عمر اور عقل کے ساتھ کم ہو جاتا ہے۔ ہم وقتی طور پر بدصورت ہو سکتے ہیں، مگر ہمارا حُسن اس کے ساتھ ہے، جو بہت خوبصورت ہے۔ اللہ جمیل و یحب الجمال ' نیکی خوبصورتی ہے، توازن ہے۔ حُسن، نیکی اور اخلاق ہے۔ بشرطیکہ ہم میں سے کوئی ان میں سے کسی پر مقام رہے۔

ایک بندہ جب خدا سے بخشش کے لیے رجوع ہی نہیں کر رہا، تو اسے خدا کیا معاف کرے گا۔ کافر کو سزا مل رہی ہے کہ وہ بخشش کے لیے رجوع ہی نہیں کر رہا۔ کافر اپنے عقیدے کے مطابق اپنے انجام تک پہنچتا ہے۔ اسی لیے خدا نے کہا، جو کچھ تمہیں برائی پہنچتی ہے، تمہارے نفس سے پہنچتی ہے۔ کسی سے جا کر کہو کہ مرنے والے ہو، ایک دفعہ کہہ دو کہ اللہ میاں مجھے معاف کر دو۔ خدا کہتا ہے کہ جس نے دل سے ایک مرتبہ لا الٰہ کہا، اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ کہیں تو

سہی۔ جب آپ بخشنے والے' معاف کرنے والے کو نہیں پہچانتے تو پھر وہ کیا کرے؟ آپ نے اللہ کو جبر میں ڈال دیا۔ شفاعت کے وقت رسول اکرمؐ ایک مرتبہ جائیں گے' بخشوائیں گے۔ دوسری مرتبہ جائیں گے' بخشوائیں گے۔ تیسری مرتبہ جائیں گے بخشوائیں گے اور پھر اللہ کہے گا اے محمدؐ! ہم نے آپ کو شفاعت بخشی تھی۔ ہم نے وہ سارے لوگ بخش دیئے' جن کی آپ نے شفاعت کی تھی۔ اب وہ لوگ باقی ہیں' جنہیں قرآن نے روک رکھا ہے جنہوں نے کبھی میرا اقرار خداوندی نہیں کیا۔

جسے روح کہتے ہیں

جسے آپ روح کہتے ہیں' یہ یسان اور میسان سے بھی ایک باریک چپ ہے۔ اسے بڑی احتیاط سے انسان کے اندر رکھا جاتا ہے۔ وقت ختم ہوتا ہے' تو یہ چپ نکال لی جاتی ہے۔ نکالنے والے بھی اسی طرح نکالتے ہیں۔ دو فرشتے آ جاتے ہیں۔ ایک ہلکا پھلکا سا آپریشن کرتے ہیں۔ تکلیف تو ہوتی ہے مگر آپریشن سے خون نہیں بہتا۔ ناقابلِ دید سا آپریشن ہے۔ باریکیوں سے نکالتے ہیں۔ قبر تک بندہ مشکل سے پہنچتا ہے...... یہ چپ بڑی مشکل سے نکلتی ہے۔ اگر آپ کی ملکیتیں بہت مضبوط ہوں' تو اس چپ کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں کمی بیشی اور اس کے سامانِ زیست سے پیدا ہوتی ہے۔ جب آپ کی مال و جائیداد اور اس سے رغبت مضبوط ہوتی ہے' تو اس سے ناقابل شناخت دھاگے اتنے بن جاتے ہیں کہ آپ کو زندگی چھوڑنا مشکل لگتا ہے۔ دیکھئے! خودکشی کرنے والا کتنی آسانی سے مر جاتا ہے۔ کتنے حیران ہوتے ہو آپ کہ کتنی آسانی سے مر گیا۔ ہمیں تو مرنے کے خیال ہی سے خوف آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی وابستگی اور دلچسپی کوئی نہیں رہتی۔ ڈیپریشن' اُداسی اور فرسٹریشن رفتہ رفتہ احوال دنیا سے اکتا جانے کا نام ہے۔ کہتا ہے' میں کیوں جیوں؟ میرا اِدھر کون ہے؟ میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھائی بہن نہیں ہے۔ مجھے کھانا بھی نہیں سوٹ کرتا۔ میں مر ہی جاؤں تو بہتر ہے۔ جب منفی دلائل اتنے وزنی ہو جائیں گے کہ مثبت دلائل دب جائیں تو خودکشی کی تمنا پیدا ہوتی ہے مگر جو شعوری بندہ اپنے آپ کو زندگی سے اتنا عدم وابستہ رکھے کہ کوئی خوشی اس کو زیادہ خوش نہ کرے اور کوئی غم اسے زیادہ غمگین نہ کرے' تو وہ اعتدال کا ایسا بندہ ہے جو قبر تک بڑی آسانی سے جاتا ہے۔

روح، پراسس، مراحل

عالمِ ارواح کے بارے میں میری رائے بڑی منفرد ہے۔تمام احادیث جو ملتی ہیں، وہ روح کو ایک بڑی فائن ترین امکانی چپ کی شکل میں دیکھتی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں جو حدیث ہے اور فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی ذریّت چمکدار ذروں کی صورت میں دکھائی گئی۔ ان میں سے کچھ سیاہ تھے اور کچھ بہت روشن تھے۔ اس پر آدم علیہ السلام بڑے روئے اور ان کو بتایا گیا کہ سیاہ ذرّے وہ ہیں جو عاقبت نا اندیش نکلیں گے۔

وہ صورت، جو روح نکالنے کی ہے۔ اس میں روح ایک اچھے یا بڑے کپڑے پر ہے۔ جیسے پروردگار یا حدیث کہتی ہے۔ ٹھیک وہ بھی اس کی تشریح نہیں کرتے۔ اس میں نکالی جاتی ہے اور یہ ایک قطرے کی صورت میں ہوتی ہے۔ اب خیال یہ ہے کہ جیسے کسی کمپیوٹر کا ایک مین آئی سی یا چپ ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی روح بھی فائن ترین امکانی چپ کی صورت میں ہے۔ ڈی این اے سٹرکچر کوڈ وغیرہ سب اس پر درج ہوتی ہے، مگر اس کے بعد عالم برزخ کبریٰ میں اس کو داخل کیا جاتا ہے اور عالم برزخ کبریٰ وہ ہے، جس میں اسے شکل دی جاتی ہے مگر جسم نہیں دیا جاتا۔ پھر جب زمین پر اسے بھیجا جاتا ہے، تو اسے شکل اور وزن دونوں چیزیں دی جاتی ہیں۔ جب اسے دوبارہ رخصت کیا جاتا ہے تو پھر وہ اسی پراسیس سے گزرتا ہے۔ وہ عالم برزخ میں اس طرح جاتا ہے کہ اپنا وجود زمین پر چھوڑ جاتا ہے۔ جب اس سے مرتبہ علیین کو رفعت کرتا ہے تو جیسے حضورؐ نے فرمایا کہ شہیدوں کی روحیں پرندوں کے پوٹوں میں ہیں جو جنت کے درختوں کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں۔

روح کی واپسی

عالم برزخ دو ہیں۔ ایک کو برزخ کبریٰ اور ایک کو برزخ صغریٰ کہتے ہیں۔ برزخ ایک ایسا عالم ہے جسے آپ Non existing material existance کا عالم کہتے ہیں۔ اوپر سے جو ارواح آتی ہیں، وہ اس عالم میں رکتی ہیں۔ تین عالم ہیں۔ ایک بغیر شکل وصورت کے ہے۔ ایک دوسرا عالم ہے، جہاں شکل موجود ہے لیکن وزن نہیں ہے اور ایک وہ عالم ہے جس میں شکل و

صورت اور وزن تینوں موجود ہیں۔ آپ کے موجودہ عالم میں آپ کا وزن موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کی شکل وصورت اور رُوح بھی موجود ہے۔ اس کو جب آپ خیر آباد کہتے ہیں تو وزن ختم ہو جاتا ہے۔ شکل وصورت اور رُوح باقی رہ جاتی ہے۔ جب برزخ سے روح عروج کرتی ہے تو وہ شکل وصورت کھو بیٹھتی ہے۔ بنیادی چپ کی شکل میں آ جاتی ہے۔ کسی دوسرے بدن کو لگا کر اس کی پھر کلوننگ کی جا سکتی ہے۔ ایک مستقل کلوننگ کا پراسیس جاری ہے۔

مگر کوئی رُوح پریشانی یا کوئی نیک روح دعا' فکر یا رہنمائی کے لیے خدا کے حکم سے دوبارہ پلٹ سکتی ہے۔ تلخی کے باعث یا اپنے پچھلے والوں پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھی پلٹ سکتی ہے مگر دونوں قسم کے معاملات میں خدا کی اجازت لازم اور ضروری ہے۔ مگر وہ قابل دید نہیں ہوتی۔ وہ صرف خواب کے پیٹرن میں ہی آ سکتی ہے۔ روح کو دیکھنا ناممکن ہے کیونکہ روح بھی ویسے ہی ہے جیسے اللہ کو دیکھنا۔

انسانی جسم اور رُوح

(ڈاکٹر عبدالجلیل خواجہ) انسانی جسم میں رُوح پھونکنے سے جو مراد ہے' وہ حیوان کے جسم میں روح سے مختلف نہیں ہے۔ انسان میں دو قسم کی روح ہے۔ ایک تو وہ ہے جو ہم میں اور تمام جانوروں میں مشترک ہے یعنی کسی قسم کے جو جانور ہوں گے' ان میں روح ہوگی۔ اسی طرح آپ کہہ سکتے ہیں جو مادہ ہے' اس کے اندر بھی ایک روح ہے کہ وہ بھی ایک طرح کا فنکشن ادا کر رہا ہے۔ ایک دائرے کی صورت میں نیوکلیئس کے گرد ایٹم چکر کاٹتے ہیں۔ ایک تو وہ روح ہوگی۔ دوسری جانور کی روح ہوگی۔ تیسری انسانوں میں روح پھونکنے سے مراد شاید عقل وشعور کی دولت ہے' جس کو ہم روح کہیں گے اور اسی روح سے حساب کتاب بھی ہوگا۔ جبکہ جانوروں کی روح سے اس قسم کا کوئی سوال وجواب نہیں ہوگا۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) یہ جدید مسئلہ بھی ہے اور بڑا قدیم سوال بھی ہے۔ اس کی قرآن وحدیث سے وضاحت ملتی ہے۔ جب تک مرد کا مادۂ تولید رحم مادر میں نہیں ٹھہرتا اور مرد اور عورت کے مادۂ تولید علیحدہ علیحدہ ہیں' ان پر زندگی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس قرآن کی اس آیت کا اطلاق نہیں ہوتا کہ اولاد کو رزق کے خوف یا اور فتنوں کی وجہ سے قتل نہ کرو مگر جب ہم کسی خاتون کا

معائنہ کراتے ہیں اور ڈاکٹر ایک ماہ بعد ہی بتا دیتا ہے کہ رپورٹ مثبت ہے تو پھر ہر شخص کو پتہ ہوتا ہے کہ پیدائش ہو چکی ہے۔ متحرک ہے اور زندگی بن چکی ہے۔ اب اس کے بعد یہ کہنا کہ جس وقت تک بچہ تین ماہ کا نہیں ہوتا' اس کا نصیب نہیں لکھا جاتا' بے معنی بات ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ پرانی غلط فہمی ہے۔ زندگی کا اس وقت اطلاق ہو جاتا ہے' جب رپورٹ میں اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ زندگی موجود ہے۔ زندگی جو بن گئی ہے' وہ حرکت پذیر ہے۔ خدا اور مشکل سائنسز دونوں پر اعتماد کر لینا چاہیے۔

جیسے حدیث کہتی ہے' اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ اس وقت اس پر زندگی کا اطلاق نہیں تھا بلکہ اگر تین ماہ میں یا اس سے پہلے زندگی ختم ہو جاتی ہے تو اس کے مقدرّات کی تفصیل اس پر درج نہیں کی جاتی مگر جو کچھ اس نے کرنا ہے یا کھانا کمانا ہے' تین ماہ کے بعد بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کو مقدرّات کی لسٹ دے دی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ اس وقت رُوح اور زندگی نہیں ہوتی۔

گوتم بدھ کی روشنی

دراصل مہاتما' جسے سیدھارتھا بدھا کہتے ہیں' ایک خوف کا شکار تھے۔ تمام عرصہ اپنے زمانے میں وہ ایک خوف کا شکار رہے۔ وہ اللہ کا نام نہیں لے سکے۔ اس لیے کہ ان کے اردگرد اس درجہ تبانِ آذری کا ہجوم تھا اور اتنے زیادہ نام دیوؤں اور دیویوں کے چلے ہوئے تھے کہ اگر مہاتما کسی کا نام لیتے' تو وہ ایک اور بت بن جاتا۔ دراصل بدھا نے احتیاط کی ہے کہ اس کا نام اس نے روشنی اور نروان رکھ دیا۔ اللہ نہیں رکھا۔ اس لیے کہ وہ ڈرتا تھا اس بات سے کہ میں شیوا' وشنو' بھگوان جو نام بھی رکھوں گا' یہ بتوں میں ایک بت ہو جائے گا۔

مگر مہاتما اس لحاظ سے یقینی پیغمبر تھے۔ ہمیں ان کی ایک شہادت ملتی ہے کہ ان کے قریب ترین شاگرد کا نام نندا تھا۔ جب مہاتما وفات پا رہے تھے' تو نندا نے پوچھا کہ کیا استاد تو آخری استاد ہے؟ کہا' نہیں۔ آخری میرے بعد آئے گا۔ نندا نے کہا' استاد! کیا میں اس وقت موجود ہوں گا؟ بدھا نے کہا' میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تو نندا نے کہا کہ استاد اگر میں موجود ہوا تو اس کو پہچانوں گا کیسے؟ مہاتما نے کہا' وہ مترا ہے۔ مترا سنسکرت میں ٹھیک معانی رحمت رکھتا ہے۔

میرے خیال میں سدھارتا بدھا اپنے وقت کے پیغمبر تھے' جنہوں نے پیغمبر آخرالزمان کی پیشین گوئی کی تھی کیونکہ اللہ نے بھی قرآن میں کہا ہے کہ ہم نے اُمتوں کی طرف رسول بھیجے ہیں اور نہیں بھیجے ہم نے رسول الا بلسانک قومہ' ہم نے اس قوم کی زبان میں بھیجے۔ ظاہر ہے کہ انڈیا میں بہت سارے پیغمبر آئے ہوں گے بلکہ گمان تو کرشنا اور راما چندرا پر بھی پیغمبری کا

ہوتا ہے۔ اگر چہ اس معاملے میں ہم بہت محتاط ہیں، مگر جہاں تک بدھا کا سوال ہے، وہ کافی تصدیق شدہ ہے کہ وہ پیغمبر تھے۔

دانیال کے بارے میں

حضرت دانیال بنواسرائیل کے بڑے مشہور اور صاحب رویا پیغمبر ہیں۔ ان کا ذکر اگر چہ قرآن حکیم میں اس طرح نہیں آتا، مگر ان کو سریانی اور عبرانی میں دانیل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ عسکائیل، دانیل یہ سارے بنواسرائیل کے ثقہ پیغمبر ہیں۔ حضرت دانیال کا ذکر اور رویائے دانیال عہد نامہ عتیق میں کثرت سے ہے۔ عہد نامہ عتیق کی بائبل پیغمبران بنواسرائیل پر مشتمل ہے۔ یہ اتنے زیادہ ہیں کہ قرآن نے ان میں سے سب اہم پیغمبروں کا ذکر کیا ہے جیسے حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ۔ باقی جو بیچ میں ہیں، جیسے ہم Sampson and player میں سمپسن اللہ کے نبی تھے، حضرت شمعون کہلاتے ہیں۔ ان کا ذکر بھی اسی میں ہے۔

اسی طرح حضرت دانیال بنواسرائیل کے مشہور پیغمبر ہیں۔ بخت نصر کے زمانے میں ہوئے۔ ان کا ذکر قرآن میں وہاں آتا ہے، جہاں پہلی دفعہ اسرائیل کی تباہی کا ذکر ہے۔ جب بنواسرائیل نے اللہ سے انحراف کیا اور خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ تم پر وہ سخت قوم چڑھا کے لاؤں گا جو تمہیں تباہ و برباد کر دے گی تو بخت نصر بنواسرائیل پر حملہ آور ہوا اور یروشلم سے 70 ہزار قیدی پکڑ کر لے گیا۔ ان قیدیوں میں حضرت دانیال بھی تھے۔

حضرت دانیال کے پکڑے جانے کے بعد بخت نصر نے ایک خواب دیکھا۔ یہ ایک لمبا باب عہد عتیق کا ہے۔ مختصراً یہ کہ بادشاہ نے کہا، میں نبی اسے مانوں گا جو مجھے میرا خواب بھی بتائے گا اور اس کی تعبیر بھی بتائے گا۔ ہر زمانے میں کذاب ہوتے ہیں۔ حضرت دانیال کے زمانے میں پندرہ سولہ کذاب پیغمبر تھے۔ جب یہ واقعہ ہوا اور اللہ نے دانیال کو ظاہر کرنا تھا، تو انہوں نے یہ خواب ان کو دکھایا۔ وہ خواب اتنا پریشان کن تھا کہ بادشاہ نے یہ قید لگا دی کہ میں اسے پیامبر مانوں گا، جو مجھے خواب بھی بتائے گا اور اس کی تعبیر بھی بتائے گا۔ جھوٹے پیغمبروں کو پتہ نہیں لگ سکتا تھا۔

اسے بتایا گیا کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص ہے جو نبی اور غیب کی خبر بتاتا ہے۔ نبی کا ترجمہ ہی غیب کی خبر بتانے والا ہے۔ اگر آپ اسے کال کریں تو وہ شاید آپ کو بتائے۔ بادشاہ نے

حضرت دانیال کو حاضر کیا۔ اس سے پہلے حضرت جبرئیل امینؑ نے دانیال کو خواب اور اس کی تعبیر کی خبر دی اور کہا کہ اب ہم نے بادشاہ کو تیرے بس میں کیا ہے۔ بخت نصر حضرت دانیال کا معتقد ہوا۔ دانیال نے بادشاہ سے بنو اسرائیل کو بچایا اور انہیں واپس یروشلم لے آئے۔ دوبارہ آبادی ہوئی' جو دوسری بار تباہ ہوئی۔ قرآن میں ان کا نام تو نہیں لیا گیا مگر ان کا ذکر کئی حوالوں سے کیا گیا ہے۔

ہندو اور تبدیلیٔ مذہب

اللہ کہتا ہے' جن لوگوں نے مجھ سے دنیا میں عزت و برکت چاہی' میں نے ان کو ہر چیز دے دی۔ وہ تو اس سے کچھ مانگ ہی نہیں رہے۔ اس کے لیے درخواست ہی نہیں کر رہے۔ میں آپ کو ہندو کی بات بتاؤں۔ سر گنگا رام یا دوسرے تیسرے ہیں۔ قبر میں چلے جاتے ہیں اور ملائکہ ان سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون تھا؟ اس جنگل میں وہ کس کا نام لے گا؟ شیوا' وشنو' برہما' کالی یا درگاہ کا' کس کا نام لے گا؟ اسی لیے خدا کہتا ہے کہ جنہوں نے مجھے خدا جانا' وہ گنہگار ہیں یا نہیں ہیں' ان پر میری بخشش لازم ہے۔ چاہے کچھ دیر کی سزا کے بعد ہو۔ ہندو کے گھر پیدا ہو کر مسلمان ہونا مشکل کام ہے' بجا۔ لیکن عقل کا کام ہی مشکل کام کرنا ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ شروع میں سب مواحد تھے' مگر لوگوں نے بُت پرستی' سحر یا خدا سے دریغ قبول کیا۔

آپ کہتے ہیں مشکل کام ہے۔ پاکستان میں سوشلزم آیا۔ میں لاہور میں ٹیچر تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ دس کروڑ مسلمانوں میں سے دو کروڑ سوشلسٹ ہو گئے۔ ان کو ایک آئیڈیا پسند آیا مگر وہ آئیڈیا کس نہج کا تھا؟ ایک نوجوان طالب علم میرے پاس آیا۔ اس نے کہا' پروفیسر صاحب! میں تو سوشلسٹ تھا۔ باقی باتیں ان کی مجھے پسند تھیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہ خدا افیون ہے۔ آج میں آپ سے یہ بات پوچھنے آیا ہوں کہ میرے استاد نے کہا ہے کہ محمدؐ سرمایہ داروں کے ایجنٹ تھے' جن کو سرمایہ داری کے مفاد کے لیے استعمال کیا گیا۔ میں تو ساری عمر یہ سنتا رہا ہوں کہ حضورؐ ساری عمر بوریا پر سوتے رہے۔ کھانا بھی ایک وقت کا کبھی نصیب نہ ہوا۔ ساری عمر غربت' ناداری اور فقر میں گزاری۔ میرا دل نہیں مانتا کہ ان کی یہ بات مانوں۔ میں نے کہا' تو بچ گیا ہے۔

اب بطور اصول آپ دیکھیں کہ اگر اس زمانے میں دو کروڑ سخت گیر مسلمان سوشلزم'

کمیونزم کا عقیدہ رکھ سکتا ہے تو باقی قوموں کو بھی آ گہی حاصل ہے۔ بڑا مسئلہ یہ نہیں کہ کسی کو جاننے کی ضرورت ہے کہ خدا ہے یا نہیں' بلکہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کو جاننے کا ذرا تردد نہیں کرتے۔

آلِ ابراہیم اور یہودی

اس کا فیصلہ قرآن حکیم نے کر دیا ہے۔ اگرچہ قرآن حکیم کی آیات **ان اللہ اصطفی آدم و نوح و آل ابراھیم و آل عمران علی العالمین** کہ ہم نے اولاد ابراہیم' اولاد نوح اور عیسیٰ اور موسیٰ اور اولادِ عمران کو برکت بخشی۔ ان کو زمین و آسمان میں غلبہ دیا اور کہا' **یا بنی اسرائیل اذکرو نعمت التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العالمین** ' اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو عالمین پر غلبہ دیا مگر جب بنو اسرائیل اس عہد کو پورا نہ کر سکے' تو خداوند کریم نے ان پر لعنت بھیجی اور کہا' **وضربت علیھم الذلتہ والمسکنتہ وباو بغضب من اللہ ذالک بانھم کانو یکفرون بایت اللہ ویقتلون النبین بغیر الحق ذالک بما عصوا وکانو یعتدون** کہ تم لوگوں نے میرے اس حق کی نافرمانی کی' جو میں نے تم پر کرم فرمایا تھا۔ تم نے اس میں گستاخی کی۔ میرے انبیاء کو قتل کیا اور میری حدود کی خلاف ورزی کی۔ میری کتابوں کو مسخ کیا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ میں نے تمہارے لیے مسکینی اور ذلت لکھ دی۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پروردگار نے بڑا واضح وعدہ فرمایا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے کلمات سے آزمالیا تو فرمایا کہ میں نے امت انسانی پر تمہیں امام مقرر کیا۔ حضرت ابراہیم نے عرض کیا' **قال من ذریتی**' اے مالک کائنات! میری اولاد کا کیا بنے گا؟ فرمایا' قال لاینال عہدالظّٰلمین' ہم ظالموں سے عہد نہیں نبھاتے۔ خداوند کریم نے تمام ظالم اہل یہود کو عہد سے نکال دیا اور اب یہ درود و سلام صرف انہی پر بھیجتے ہیں' جو ذریت ابراہیم علیہ السلام اور اس کے ساتھ ساتھ آل ابراہیم علیہ السلام ہونے کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔

آل ابراہیمؑ کی وضاحت قرآن مجید میں اللہ کریم نے دی ہے کہ جب حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کنعان کے بارے میں کہا' اے میرے رب! کنعان میرا بیٹا ہے' جو پہاڑ پر رہتا ہے اور میری آل میں سے ہے' تو اللہ نے کہا' یہ تیری آل نہیں ہے۔ اس کے اعمال اس قابل نہیں ہیں' اس لیے ہمارا درود و سلام آل ابراہیم میں ان لوگوں تک پہنچے گا' جن پر اللہ کی طرف سے درود و سلام

ہے۔اولئک علیھم الصلوٰۃ من ربھم و رحمۃ و اولئک ھم المھتدون.

مدرٹریسا کے لیے صلہ

اس شخص کے متعلق آپ کیا کہیں گے جو ایک پورے تکمیل شدہ مذہب پر رائے دیتا ہے؟ خدا نے پوری کائنات اپنے دوستوں کے لیے مرتب کی ہے۔اپنے دوستوں کے لیے بنائی اور اپنے دوستوں کی محبت کو عام کیا۔جیسے حج کی مثال لیجیے۔تمام کا تمام حج ابراہیمؑ کی سنت ہے۔ ابراہیمؑ تو کب سے گئے' مگر اللہ کی محبت اور دوستی کا عالم یہ ہے کہ آج تک سنت دوست کو سلامت رکھے ہوئے ہے۔اس کالے سیاہ پتھر کو دیکھئے کہ شاید اسے اتنا چوما گیا کہ بمشکل نظر آتا ہے۔اس میں پتھر ہونے کے سوا کیا ہے؟ اس کی محبت کا یہ عالم ہے کہ آج تک لمس دست ابراہیمؑ کو ہم سے چھواتا ہے۔کہتا ہے کہ اس کو میرے دوستوں کے ہاتھ لگے ہوئے ہیں' اس پتھر میں اور کیا خوبی ہوسکتی ہے؟

اب اور ذرا دیکھئے۔ام المومنین عائشہ صدیقہؓ نے کہا کہ حضورؐ سے پوچھا گیا' یارسول اللہؐ! صفا و مروہ میں تو ابراہیم انوالو نہیں تھے۔کیا ہم اس کو چھوڑ نہ دیں؟ تو غیرت خداوند کا عالم دیکھئے کہ دوست کی بیوی جو پیغمبر نہیں ہے' اس کو بھی کہا' ایسا نہیں ہوسکتا۔میرے دوست کی ایک ایک چیز میری دوست ہے۔ان الصفا و المروۃ من شعائر اللہ' خبردار! سن لو! صفا و مروہ بھی اللہ کا طریقہ کار ہے۔اتنا پکا دوستی میں اللہ ہے۔وہ مدرٹریسا' سینٹ آگسٹائن یا اور جو کوئی رہا ہو' جس کی نظر اس کے بہترین دوست پر نہیں پڑ سکتی جو معرفت رسول سے لاعلم رہا۔کائنات میں واحد وجہ غرض غایت کائنات سے غافل رہا۔اس کا کیا اللہ کے قریب حق ہے کہ وہ اللہ سے انعام مانگے۔

ایک روایت کے مطابق اللہ نے کہا: کنت کنزا مخفیا ما اجبت ان اعرف فخلقت محمدا ' کہ میں نے محمدؐ کو اپنے تعارف کے لیے پیدا کیا۔خدا نے کہا: الحمدللہ رب العالمین' خدا نے کہا: کتب علی نفسہ رحمہ' میں عالمین کا رب تھا۔میں نے تخلیقات کے لیے رحمت کو چنا اور تمام رحمت سمیٹ کر وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین' کیا اس شخص کو نظر انداز کر کے کوئی بارات عاشقانہ پاسکتا ہے؟ کیا اس کی محبت کے بغیر کوئی نقش و نگار پروردگار دیکھ سکتا ہے؟

کوئی صوفی ہو یا بہترین انسان' اس کی شناخت یہی ہے کہ وہ خدا کو جانتا ہے یا نہیں؟ دوسری اس کی شناخت یہ ہے کہ اپنی دوستی اور اپنے دوست کو پہچانتا ہے کہ نہیں؟ یہ دوست کتنی بڑی شے ہے کہ حضور گرامی مرتبتؐ کے سامنے سیدنا ابی بکر صدیقؓ نے شکایت کی' یارسول اللہؐ! مجھ سے غلطی ہوئی تھی' عمرؓ بن خطاب کی وجہ سے۔ میں نے معافی مانگی۔ عمرؓ مجھے معاف نہیں کرتے۔ حضور گرامیؐ مرتبت طلوع آرائے مسند رسالت ہوئے۔ بار بار فرماتے تھے' تم میرے دوست کو بھی نہیں چھوڑتے۔ میرے دوست کو بھی نہیں چھوڑتے۔ حتیٰ کہ عمرؓ گھٹنوں کے بل رینگے اور کہا' پروردگار کے رسولؐ! غلطی ہوگئی۔ آئندہ تیرے دوست کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔

کسی بھی نیک اور پاک ہستی' زمین کی کیا حیثیت ہے۔ اس مقام پر' جہاں صرف محبت کا دخل ہے اور رسول گرامیؐ کے تسلیم کیے بغیر پھر میں یہ بھی نہیں کہتا کہ ہمارا رسولؐ۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ جب تھامس کارلائل نے اس رسول پر ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ کتاب لکھی تو اس کا اپنا پیغمبر موجود تھا۔ لیکن اس نے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر کو بطور ہیرو منتخب کیا اور وہ حضرت محمدؐ تھے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب سو بڑے آدمی کتاب لکھی گئی وہ آپ نے نہیں لکھی' میں نے نہیں لکھی' کسی مسلمان نے نہیں لکھی۔ اسے تاریخ دانوں کے ایک گروپ نے لکھا۔ اس کتاب نے دنیا کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس کی چوٹی پر محمدؐ رسول اللہ تھے۔ کیا مدر ٹریسا کو یہ نظر نہیں آیا؟ اس کا اللہ اور اس کے دوستوں سے کچھ طلب کرنے کا کیا حق ہے؟

مدر ٹریسا کا انجام

مجھے تو مدر ٹریسا سے کوئی دشمنی نہیں ہے مگر اللہ کو اس سے ایک دشمنی ہے۔ وہ اس دور میں پیدا ہوئی جب اسے اچھی طرح یہ پتہ تھا کہ آدھے مذہب سے بات آگے بڑھ کر الیوم اکملت لکم دینکم تک پہنچ چکی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد محمد رسول اللہؐ آچکے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ کے نزدیک اس پیغمبر کی اطاعت کے بغیر اسے شفاعت نہیں ملے گی۔ مگر مدر ٹریسا پھر بھی اللہ کے رسول کو مان نہیں رہی۔ وہ کتنی ضدی ہے۔ ساری انرجی مخلوق کی خدمت میں لگا رہی ہے۔ اللہ میاں نے کہا' اچھا میں بے انصافی نہیں کرتا جن کے لیے کام کر رہی ہو' وہ تمہیں بہت عزت دیں گے۔ میرے لیے تو تو نے کچھ نہیں کیا۔ میرے ساتھ ناانصافی کی۔ میرے دوست کو دھتکار

دیا۔ جانتے ہوئے بھی میری محبوب ترین شخصیت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ہاں تجھے خلق سے محبت ہے' خلق تجھے بڑی تعظیم دے گی۔ تو نے خلق کی خدمت کی ہے' خلق تیری خدمت کرے گی۔

اصولاً دیکھا جائے تو مدر ٹریسا کا کوئی حق اللہ پر نہیں بنتا۔ جو حق بنتا ہے' اللہ رب العزت نے اس کو مکمل واپس کر دیا ہے۔ آج وہ دنیا کے ہر اخبار کی زینت ہے۔ جتنی پروجیکشن وہ مانگ سکتی تھی' اسے مل چکی ہے۔ جتنی عزت اسے اس صلے میں دی جا سکتی تھی' وہ اس کو دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اللہ سے کیا مانگتی ہے؟ وہ جنت کیوں مانگتی ہے' اس کی مجھ سمجھ نہیں آتی۔ جو اس کو چاہیے تھا' وہ اس کو مل چکا۔

کافر بچے کا انجام

حضورؐ کی کسی بات کو اشتباہ کی نظر سے دیکھنا ایک قدرتی امر ہے۔ یہ سب کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے' مگر آپ اس حدیث کو دیکھیں کہ اس میں قطعیت نہیں برتی گئی۔ کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی گئی کہ کافر بچہ ضرور جہنم میں جائے گا اور مسلمان بچہ لازماً جنت میں جائے گا۔ اگرچہ میرے پاس ایک دلیل ہے کہ کافر بچے کو جہنم میں جانا ہے اور وہ دلیل پیش کرتا ہوں۔ رسولؐ نے یہ بات نہیں کی۔ رسولؐ نے وہ بات کی' جو ان کے شایان شان تھی کہ انہوں نے ذمہ داری اللہ پر ڈال دی۔ میں اللہ کی نیت کو نہیں جانتا اور میں اس بات کو قطعیت سے نہیں کہہ سکتا کہ کافر کے بچے کا انجام کیا ہو گا مگر انسانی تعقل کو اپلائی کرتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جبریت کے علت و معلول کے ردّوبدل میں ایک جبریت کا رجحان ہے۔ اس کے مطابق اگر آپ نے آئس کریم بنانی ہو اور آپ آئس کریم کے اجزا ہی ڈال رہے ہوں' اس توقع کے ساتھ کہ اس میں سے آئس کریم نکلے گی تو اس میں سے گاجر کا حلوہ نہیں نکل سکتا۔ یہ بات سبب اور نتیجہ کے ردوبدل میں محال ہے۔ اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ اچھی نہ نکلے' گندی آئس کریم نکلے۔ کھانے کے قابل نہ ہو۔ اس کے ذائقے میں کمی بیشی ہو مگر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اجزا کی فطرت ہی تبدیل ہو جائے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ایک کافر کے بچے کو اس کے جینیٹک اور موروثی اثرات سے کیا ملا ہے؟ ایک بچے کے ماں باپ کی طرف سے اس کے جینز پر فیصلہ ہونا ہے۔ اس کی اپنی زندگی پر فیصلہ ہونا ہے' جس کو پہلے سے کرپٹ نہیں کیا گیا۔ تو پھر وہ بچہ وہی نکلے گا' جو اس کے ماں باپ کی خواہش

اور ان کا فیصلہ ہے۔ جب تک کہ وہ بلوغت تک نہ پہنچے اور سوچے سمجھے نہیں۔

ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ دین فطرت سے مراد یہ ہے کہ اس بچے کو پیدا ہونے کے بعد جو سوشل سیٹ اپ ملے گا اور جن سماجی حالات سے اسے واسطہ پڑے گا' ان پر وہ غور وفکر کرے گا۔ غور وفکر میں وہ قبولیت شو کرے گا جو اس کے والدین کر چکے ہیں۔ خدا کی طلب کسی کافر یا مسلمان کے بچے میں ہوگی' تو وہ بالآخر اللہ کریم تک ضرور پہنچے گا۔ بہت سارے مسلمانوں کے بچوں میں یہ آرزو پیدا نہیں ہوتی۔ بہت سارے ہندوؤں کے بچے میں یہ آرزو پیدا ہو جائے کہ وہ حقائق کو پرکھیں اور جانیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آرزو اور خواہش کی سطح پر ابتدائے زندگی کے لیول میں ہر بچہ اپنے لیے کوئی بھی آرزو تعین کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کی سلیٹ صاف ہے' جس پر اثرات بار بار وارد ہو کر یا اس کے جینیٹک اور مادرانہ پدرانہ اثرات کو ثابت کریں گے یا اسے رد کریں گے۔

دین فطرت سے قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں پڑھا لکھا ہے۔ شریعت تو بڑی سادہ سی ہدایت دے رہی ہے کہ چودہ پندرہ سال تک کسی بچے کو جواب دہی نہیں ہے' جب تک اس کی بلوغت نہیں ہوتی۔ جب تک وہ بالغ نہیں ہوتا' وہ شرع امور کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔

لیکن جہاں تک اس کے سیکھنے کے ذرائع اور اس کے تحصیلی رویوں کا تعلق ہے' وہ بڑے صاف ستھرے ہیں۔ وہ بچہ ایسے انسٹرومنٹ سے کے ایل گابا بھی نکل سکتا ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ بارکر بھی نکل سکتی ہے' جو اپنے اپنے دین میں یا اپنے اپنے موضوعات میں بڑے متشکل تھے۔ کوئی رومن کیتھولک بھی بن سکتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی مسلمان کسی وقت اپنا رویہ تبدیل کر سکتا ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں وہ بچے' جو مسلمان پیدا ہوئے۔ مارکسزم اور ماؤازم کے فلسفے کے تحت انہوں نے اپنے پیغمبر کو یہ بھی کہا کہ وہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ تھے۔

جستجو و آرزوئے خدا

میں نے ایک سال سے آپ کے اندر جستجو اور آرزوئے فراق کو زندہ رکھا ہے' اس سے آپ زندہ ہیں۔

تو نمی دانی ہنوز چیست حیات دوام
چیست حیات دوام سوختن ناتمام

حضرت شیخ شہاب کے پاس جب خواجہ بہاء الحق نقشبند گئے تو تین دن کے بعد آپ نے اسے کلاس سے فارغ کر دیا۔ دوسرے شاگردوں کو بڑا اعتراض ہوا کہ حضرت ہم سالہا سال کے بیٹھے ہیں' یہ اتنی جلدی فارغ ہو گئے ہیں۔ آپ نے کہا' تم گیلی لکڑیاں ہو۔ دھواں دیتی ہو۔ وہ خشک لکڑی تھی' جل کر خاک ہو گئی۔ اگر اضطراب' تجسّس اور حقیقت کے سراغ رساں کوئی نہیں ہوتا' مگر اگر اضطراب و جستجو سے مراد جبلتوں کی طرف رجحان ہے تو پھر بھی یہ ایک جہاد بالنفس ہے جس کی جدوجہد میں ہم پڑے ہوئے ہیں۔ مگر اگر اضطراب سے مراد نالائقی' مایوسی اور نامرادی ہے تو پھر ہم یقیناً ناکام ہو رہے ہیں۔

ہم میں سے اس تیسری صورت میں کوئی نہیں۔ کوئی فرد اس اعتبار سے ناکام نہیں ہو رہا بلکہ ہر شخص اپنی ذات کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔ ہر آدمی سچائی' حقیقت اور اپنی ذات کے بارے میں جاننے کی فکر کا امکانی حد تک نفیس کام کر رہا ہے۔ ہم اس تقابل کو مزید بڑھا رہے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ ہم مزید اضافی خصوصیات کو سیکھیں۔ ہمارے لوگ دنیادار ہیں۔ ہم میں

سے کوئی دنیا سے باہر نہیں بیٹھا ہوا۔ کسی نے جنگل کا رخ نہیں کیا۔ کیا کسی نے حجلہ نشینی نہیں اختیار کی اور کوئی بھی گوشہ نشین نہیں ہوا۔ ہم ٹھیک دنیا کی منجدھار میں اپنی ذات کے خلاف سخت ترین جنگ میں شریک ہیں۔

میں آپ کو بھی اس جہاد کا یقیناً بہت بڑا مجاہد سمجھتا ہوں اور وہ بھی، جنہوں نے کہاں کہاں سے اپنی زندگیاں شروع کی ہیں۔ کس کس مقام پر ذہنی اور اخلاقی جدوجہد شروع کی ہے۔ کہاں وہ پیچھے رہے، کہاں آگے گئے لیکن جدوجہد میں پیچھے جانا حکمت عملی ہو سکتی ہے، شکست نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم اپنے ذہن کو سچائی اور حقیقت کے بارے میں برانگیخت کر سکیں تو ہم اپنے آپ کو کامیاب کہہ سکتے ہیں۔ میں یہاں خدا کو ضرور زندہ دیکھتا ہوں، اس لیے کہ یہ واحد مجلس ہے، جس میں لوگ محض اس لیے اکٹھے ہوئے کہ وہ خدا کی کچھ اور باتیں سنیں۔ خدا کو یقیناً اس بات پر تفاخر ہوگا کہ کچھ تو لوگ ہیں، جو میری بھی سنتے ہیں اور میرے بارے میں بھی بات سنتے ہیں۔

تعقل، دلیل، شناخت خدا

اس لفظ کو جو اتنا اوپر چڑھا دیا جاتا ہے کہ خدا بے دلیل سمجھا جاتا اور بے دلیل جانا جاتا ہے۔ خدا کے لیے کوئی دلیل ہی کوئی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب خدا کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ تو اللہ کو ہمیں عقل سکھانے کا کیا حق ہے؟ اگر خدا نے اپنے لیے عقل کے رستے کھلے نہیں چھوڑے اور اس نے اپنی شناخت اور اپنی جان پہچان کے لیے عقل کا رستہ نہیں کھلا چھوڑا تو کیا وہ نعوذ باللہ ایسے نفاق والا رب ہے کہ جو چیز اپنے لیے پسند نہیں کرتا، تمہارے لیے پسند کرتا ہے؟ قرآن میں تو ایسا نہیں ہے۔ اللہ کہتا ہے جو ہلاک ہوا، وہ دلیل سے ہلاک ہوا۔ جو زندہ ہوا، وہ دلیل سے زندہ ہوا۔

ادھر تو اللہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔ ادھر ہم نے رٹ لگائی ہوئی ہے کہ ایک اندھا دھند اعتبار اور ایک اندھا دھند اعتقاد ہی خدا کی طرف لے کر جاتا ہے۔ اب اندھا دھند اعتقاد کرنے والوں کو ذرا خدا کی نظر میں دیکھئے، تو آپ کو یقین ہوگا کہ شاید ہماری تمام بنیاد تعلق خداوندی غلط ہے۔ خدا کہتا ہے بدترین جانور وہ ہے جسے میں نے انسان تو بنا دیا لیکن وہ اندھا اور بہرہ ہو کر میری کتاب پر گرتا ہے اور عقل استعمال ہی نہیں کرتا۔ ان قرآنی آیات کے بعد کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہم

اندھے اعتقاد کو اختیار کریں۔

دنیا تو پراگریسو میٹریل سے بھری ہوئی ہے۔ جگہ جگہ آپ کے رستے رُکے پڑے ہیں۔ آپ کی تعقلی فراست کو روکا جا رہا ہے اور اس کے توسط سے خیال خدا کو روکا گیا۔ شیطان کو آپ کے کردار سے تعلق ہے نہ اس کو آپ کو گمراہ کرنے سے دلچسپی ہے۔ وہ تو صرف آپ کو اغوا کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ آپ سے گناہ وغیرہ نہیں کرانا چاہتا۔ یہ اس کا مقصد ہی نہیں ہے۔ وہ صرف آپ کو اس بنیادی عقیدے جو عقل وشعور کی مدد سے خدا کی پہچان میں مدد دیتا ہے' سے تھوڑا سا ہٹانا چاہتا ہے۔ آپ کو انٹلکچوئل اور دانشور بنانا چاہتا ہے۔ آپ کو رسل' وڈ کانسٹائن' واٹسن اور ہابکنز بنانا چاہتا ہے مگر وہ بندۂ خدا نہیں دیکھ سکتا۔

اس نے کہا' میں آسمانوں سے آؤں گا۔ زمینوں سے آؤں گا۔ دائیں بائیں سے اور اوپر اور نیچے سے آؤں گا اور اے پروردگار! میں حضرت انسان کو تھوڑا سا اغوا کروں گا۔ آپ گناہ و ثواب کو اغوا سمجھتے ہیں۔ گناہ وثواب تو ٹیکنالوجی کا حصّہ ہے۔ ایک آدمی کی جبلت بہت طاقتور ہے۔ جبلت میں غصہ بہت ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ ایک دن میں نکل جائے گا؟ وہ بار بار غصے کو ایکسائز کرے گا۔ اس غصے کی وجہ سے جوتیاں کھائے گا۔ کبھی جیل جائے گا۔ کبھی اس کو عقل آئے گی کہ آئندہ پانچ دس سال کے بعد غصہ کرنا بند کر دے۔ جبلتیں ایک دن میں قابو میں نہیں آتیں۔ امام جعفر صادق کے بقول' توبہ آسان ہے' ترک گناہ مشکل ہے۔ یہ ترک گناہ کبھی عادت بن جاتی ہے اور عادت کا چھوڑنا بڑا مشکل ہے۔ حتیٰ کہ 62 سال کا ہو کر اور زندگی بھر خدا کے بارے میں سوچ وبچار کے باوجود سگریٹ تو میں ابھی تک نہیں چھوڑ سکا۔

خدا تو وہ ہے جو نیچر بنا رہا ہے۔ وہ تو تخلیق کر رہا ہے۔ میں یہاں ایک چھوٹی سی دعا آپ کو رسول اللہؐ کی بتا دوں اور میں نے اپنی زندگی میں پیغمبرؐ سے زیادہ انٹلکچوئل شخص کسی کو نہیں دیکھا۔ جب وہ کوئی بات کرتے ہیں تو ان کے لہجے سے ان کا ذہنی سٹیٹس سامنے آتا ہے۔ ان کے اندرونی نیچرل سٹیٹس کی جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ اے پیغمبر! اگرچہ تو بہت بڑا پیغمبر ہے اور زمین پر تیرے جیسا وجدانی اور انٹلکچوئل کوئی نہیں ہے۔ الہام تجھ پر ختم ہے۔ قرآن تجھ پر ختم ہے۔ تو ختم المرسلین اور خاتم النبیین ہے اور ختم ذہانت یہ ہے کہ اب انسان نے تھوڑا تھوڑا تجھ سے سیکھنا اور لینا ہے مگر اس کے باوجود فرمایا کہ اے پیغمبر! یہ کہنا قل رب

زدنی علم اے اللہ! میرا علم بڑھا' اس لیے کہ تو جس کا دوست' اس کا علم کبھی ختم نہیں ہونا' یعنی اللہ ایک ایسی انتہائے علم ہے جس کے علم کا کوئی حساب و کتاب نہیں ہے' اس لیے بہترین عالم بھی اللہ ہی سے بہترین سمجھ سکتا ہے۔

اللہ سے ایک عجیب سی دعا حضور گرامیؐ مرتبت علم کے بارے میں مانگا کرتے تھے۔
اللھم نبنی بحقیقت للاشیا دیکھئے! ارہبل کے بیان پر دوبارہ غور کیجیے وہ کہتا ہے کہ:

"We only know the relationship of things. We don't the nature of things."

ہم صرف اشیاء کے تعلق کو جانتے ہیں' ان کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ ذرا رسول اللہ کی دعا پہ غور کیجیے کہ اللھم نبنی بحقیقت للاشیا' اے پروردگار! مجھے اشیاء کی فطرت کا علم دے۔ کتنا اپروچ کا فرق ہے۔ ایک شخص' جو بصیرت کے اعلیٰ ترین مقامات پر فائز ہے جو خدا پر شاہد اور خدا کا نظیر ہے۔ وہ پھر بھی ملتجی ہے کہ اے پروردگار! تو مجھے اشیاء کی فطرت کا علم دے۔

علم کے تین مقاصد بیان کیے گئے تھے۔ ایک وہ علم ہے جو آج ہم سب سیکھ رہے ہیں اور دے رہے ہیں۔ یہ نارمل علم کا وہ رینک ہے' جو ہماری زندگی کو سہل بناتا اور اس میں سختیوں کو کم کرتا ہے جو بحران زندگی کو کم کرنے کے لیے ہم نے خود بنایا ہے جیسے ٹریفک کے قوانین ہیں۔ ہم نے کہا' یہ جو مسلسل متصادم معاشرے کی حرکیات ہیں' ان میں کچھ سہولت تخلیق ہو۔ ہم نے بینکوں کے قوانین بنائے۔ یہ علم ہمیں زندگی گزارنے میں آسانی دیتا ہے۔ اس سے بھی ذرا بہتر مقصد وہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص یہ جنون رکھتا ہو' جیسے سقراط میں تھا۔ وہ عالم بننے کا بڑا جنون رکھتا تھا۔ بڑی دیوانگی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں سب سے بڑا عالم بنوں۔ وہ گاڈس آف ڈیلفی کے پاس گیا' پیتھنس کے پاس۔ اس سے کہا' سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اس نے کہا تو ہے۔ سقراط کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟ اس نے کہا' نہیں نہیں میں کیسے جانوں گا۔ اس نے کہا' جاذرا چکر لگا' مذہب دنیا کے لوگوں کو دیکھ' ان کو جانچ پرکھ کر آ۔

وہ ایک موچی کے پاس آیا۔ کہنے لگا' میں عالم نہیں ہوسکتا۔ مجھے تو جوتی بنانی نہیں آتی۔ میں دو چار دن تیرے پاس بیٹھ جاؤں۔ چند دن بیٹھا۔ ٹانکے ٹونکے لگانا آسان تھے' اس نے لگا لیے۔ پھر اس نے اس کو کہا کہ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تو ذرا جوتی کو اس طرح سی دیا کر۔ موچی نے

کہا' جا بھئی کام کر۔ ہمیں صدیوں سے اسی طریقے کا پتہ ہے تو کہاں سے اختراع کار آ گیا۔ سقراط اٹھا۔ اس نے کہا' اس کا علم تو میں نے حاصل کر لیا۔ یہ میرا علم نہیں لے سکا۔ جب سارے پروفیشنلز کے پاس سے ہو کر آ گیا' تو اس نے کہا' اصول یہ کھلا ہے کہ تھوڑا تھوڑا علم تو میرے پاس ہے مگر جو کچھ میں جانتا ہوں' وہ کسی کے پاس نہیں۔ اس لیے میں سوسائٹی میں سب سے زیادہ علم والا شخص ہوں۔

(ایک علم کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے زمانے کے بہترین علماء میں شمار ہوں۔ بہترین اتھارٹی علم کی ایک یقینی انتہا کو حاصل کریں۔ ماہرین کے ماہر ہوں۔ مگر یہ مقاصد حیات پست تر ہیں۔ خدا کے ہاں تمام علم کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ آ گہی و عرفان ذات خدا اور اس کی پہچان ہے۔)

تعلق باللہ اور ترقی

میں واحد استاد ہوں' شاید اس زمانے میں اور پرانے زمانے کے لحاظ سے بھی کہ جس نے سب سے پہلے علم اور معرفت کے لیے جدوجہد شروع کی ہے۔ ہم تصوف میں ان تمام سکولوں کو رد کرتے ہیں' جو اندھادھند تقلید پر ابھارتے ہیں۔ اس تمام عرصے میں اگر آپ میرے موضوعات ہی دیکھ لیں' ان کا تعلق قطعاً کسی روایتی موضوع سے نہیں ہوتا بلکہ قرآن کے اعلیٰ ترین موضوعات کے اوپر ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ مذہب پر گفتگو کے آغاز سے پہلے میں نے پوری کوشش کی کہ میں ہر اس سوال کو دیکھوں۔ ہر اس مسئلے کو سمجھنے اور سوال کو جاننے کی کوشش کروں' جو خدا کے حق میں یا اس کے خلاف جاتا ہے جو لوگوں کے ذہن میں اعتراض یا شک وشبہ کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ پروردگار عالم نے بڑی وضاحت سے اپنی انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان شر الدواب عند الله صم بکم الذین لا یعقلون کہ بدترین جانور انسانوں میں میرے نزدیک وہ لوگ ہیں' جو اندھے' بہرے اور گم سم ہو کر میری آیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور غور وفکر نہیں کرتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تقلید اور سنے سنائے عقیدہ کے اتنا سخت مخالف ہے کہ مسلسل

اہل کفر کو قرآن حکیم میں طعینہ دیتا ہے کہ اگر تم عقل رکھتے اور اپنے آباؤ اجداد کے دین پر تھوڑا سا غور کرتے تو تمہیں حقائق کا پتہ چل جاتا۔ سچائی کا کھوج مل جاتا اور تم کبھی بھی خدا سے غافل نہ رہتے۔ یہ پروردگار وہ ہے' جسے علم سب سے زیادہ پسند ہے۔ جو علم سے محبت رکھتا ہے۔ جس نے اپنی شناخت علم میں رکھی ہے اور ہر موضوع میں رکھی ہے۔ یہ نہیں کہ دینی تعلیم میں رکھی ہے' بلکہ جب اپنی شناخت اور اپنی تسبیح اور اذکار کا ذکر کیا تو بڑی وضاحت سے کہا' الذین یذکرون الله قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوت والارض' کہ میرے بہترین بندے وہ ہیں' جو صبح' دوپہر' شام تسبیح کرتے ہیں۔ لیٹے' بیٹھے کروٹوں کے بل کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ زمین و آسمان کی تخلیقات پر غور بھی کرتے ہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ مسلمان کے پاس سائنٹفک طرز فکر نہیں رہا۔ معروضی حقائق کی سمجھ بوجھ نہیں رہی اور صرف موضوعی اور داخلی رجحانات پر بنیاد کر کے وہ جو تعلیم دینا اور لینا چاہتے ہیں' اس کی مغربی اقدار اور اعلیٰ معیار کے مطابق کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے ہم لوگ مغرب کی نظر میں ناکارہ سمجھے جاتے ہیں اور خود اپنی نظروں میں بھی گر جاتے ہیں۔ یونیورسٹیاں ضرور بنایئے' مجھے بھی موقع دیجیے۔

جہاں تک کسی ادارے کی خود تشکیل کا سوال ہے' پتہ نہیں' آپ کے پاس علم کی کیا شناخت ہے؟ مگر میں جن استادوں کا ریزہ چین ہوں' ان کا کہنا ہے کہ علم جب بہت بڑھ جاتا ہے تو آدمی جبریت کا مکمل قیدی ہو جاتا ہے۔ اس معاملے میں' میں جبریت کا قائل ہوں اور ابھی سیکھنے کے مراحل میں ہوں۔ جب اللہ چاہے گا' اس قسم کے اسباب مہیا ہوں گے۔ لوگ آگے آئیں گے اور وہ میری استعانت کریں گے۔ ہم ایک بہت جدید ہائی کلاس' ٹاپ یونیورسٹی تعمیر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

اللہ کا دائمی ساتھ

خدا کی رضا اور دائمی ساتھ ہر دور میں ایک بہت بڑا متصوفانہ تصور رہا ہے۔ تصوف ان ادوار میں' جن سے ہم گزر کے آئے ہیں۔ ایک انتہائی پیچیدہ عمل ہو گیا تھا' جس کی وجہ سے ایک عام آدمی نے اسے اپنی زندگی سے بالکل نکال دیا تھا۔ میں نے پروردگار سے عرض کی کہ نہ میرے

پاس صائم الدہر ہونے کے عناصر موجود ہیں نہ ہی ہمیں ضرورت سے بہت زیادہ نمازیں پڑھ سکتا ہوں۔ حالات اور واقعات کے تحت میں اتنا مصروف ہوں کہ شاید میں تیرے احکامات کی بمشکل پابندی کر سکوں۔ جو ہمارے اردگرد آثار موجود ہیں' ان کے تحت لذات' فواحشات اور اپنی خواہشات اتنی زیادہ ہیں کہ ان میں شاید ہمیں ثابت قدم بھی نہ رہ سکوں۔ کیا ان حالات میں میری نیّت اور اخلاص کے مطابق تو مجھے نظرانداز کر دے گا کہ تو صرف طاقتور لوگوں کا خدا ہے یا شاید تو بایزید اور ذوالنون مصری کو مل سکتا ہے؟ ہم جیسے کمزور لوگوں کو نہیں ملتا؟ میں نے اسے کہا کہ ان تمام باتوں کے پیش نظر' جو مجھے درپیش ہیں' میں تجھے صرف ایک چیز پیش کر سکتا ہوں۔ میرا تجھ سے صرف ایک وعدہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ مخلص رہوں گا۔ بس اتنا ہی۔

میرے پروردگار نے جو اس کے بدلے میں مجھے صلہ بخشا۔ عنایات عطا فرمائیں۔ علم و حکمت میں سے جو خیرات بخشی' وہ ایسی تھی کہ میرا نہیں خیال کہ میں کسی بھی پرانے صاحب تصوّف سے حاسد ہوں۔ ان پر اللہ کی عنایات اپنی جگہ' میرے سامنے ایک قانون بڑے واضح طور پر آیا ہے کہ تمام انسان' صوفی ہوتے ہیں' صوفی ہو سکتے ہیں۔ تصوف کوئی غیر معمولی ہونا نہیں بلکہ تصوف نام ہے' نارمل ہونے کا۔ (تصوف اللہ کے توسط سے اپنی بے محابا حیوانی جبلتوں کو اعتدال میں لانے اور خدا کے احکامات کے تحت حدود اللہ سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے۔ تصوف باطن اور ظاہرہ دونوں خطاؤں سے ذہناً اور بدناً بچنے کا نام ہے۔ اس لیے جب مجھ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ طریقت کیا ہے اور شریعت کیا ہے' تو میں ان سے کہتا ہوں کہ طریقت شریعت کی نیت ہے۔

جن اعمال شرح کے پس منظر میں خدا کی خواہش ہے' وہ طریقت ہے اور جو اعمال شرح محض شریعت کے لیے سرانجام دیئے جا رہے ہیں' وہ شریعت ہیں۔ ان سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے میں نے یہ طویل لیکچر دیا ہے کہ آپ اپنی عبادات کو ضائع نہ کریں۔ آپ کی عبادات اس وقت ضائع ہوتی ہیں' جب صاحب عبادات کا تصور نہیں ہوتا۔ کم از کم میں ایک سادہ سی خواہش تو پال لیں کہ کبھی نہ کبھی ہم خداوند کریم کی ہمسائیگی میں جا اتریں گے۔)

آپ کے تمام سوالات بنیادی طور پر ایک ہی سوال کو ریفر کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ فرض کیجیے خدا نہیں ہے تو یہ تمام سوال' سوال بن جائیں گے اور ان تمام کے جوابات فرضی' نظریاتی اور فلسفیانہ ہوں گے' لیکن سچائی پر مبنی نہیں ہوں گے۔ اگر خدا ہے' تو یہ تمام سوالات مفروضے اور وہمے

بن جائیں گے اوران کا وجود کسی طور بھی قائم نہیں رہ سکتا' چنانچہ ہمیں اپنے کو بنیادی سوال کی طرف رجوع کرنا ہوگا کہ مذہب تو سرے سے اہم ہے ہی نہیں۔ مذہب کو ہم ایک ایسے قانون کے طور پر جانتے ہیں' جو کسی فرضی یا حقیقی رب نے ہمیں زندگی گزارنے کے لیے دیا ہے۔ اگر وہ فرضی ہے' تو ہمارے وہم کی پیداوار ہے یا کسی صحرا میں کھڑے بے بس انسان کا احساس ہے' جب اسے اپنے اردگرد سے خوف پیش آیا۔ یا شاید یونانی میتھالوجی میں چشموں کے قریب سے گزرتے یا فصلوں کی سرسراہٹ سنتے ہوئے کسی کو اپنے پیچھے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے اس کا نام پین گاڈ رکھ لیا اور وہاں سے Panthyism شروع ہو گیا۔

بہت سارے خدا جو زمانے نے بنائے یا انسان نے تخلیق کیے' معاشرے میں یا علم الاصنام میں ہیں' وہ زیادہ تر ان کے خوف و وحشت اور ان کی توقعات کی وجہ سے پیدا ہوئے' مگر یہ تبھی ممکن ہے' جب خدا نہ ہو' ہمیں جو ایک خدا کا تصور ملا ہے' ہمیں پوری اجازت ہے کہ ہم اس کی نفی کریں۔ خدا کا انکار کریں مگر ہمیں انکار کرانے والا کہتا ہے کہ تمہارا انکار علم کے لیے اور یہ جاننے کے لیے ہونا چاہیے کہ میں ہوں یا میں نہیں ہوں۔ تمہارا انکار ایک خیال یا ایک وہمہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ مسلسل تحقیق کا عمل ہونا چاہیے۔ اگر آپ پندرہ برس میں علم سیکھ رہے ہیں اور انکار کی حالت میں ہیں اور علم سیکھتے ہوئے تیس برس کی عمر میں جا کر خدا کو ماننے والے ہیں' تو یہ اللہ کی زیادہ قابل قبول ہے بہ نسبت اس کے کہ آپ بغیر سوچے سمجھے 30 برس کی عمر کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے پہنچیں۔

کلمے پر غور سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا کلمہ ہی جدلیات فکر کا ہے لا الہ الا اللہ یعنی خداوند کریم نفی سے انسان کو اثبات کی طرف لے کر آتا ہے۔ پہلے یہ کہو کہ کوئی اللہ نہیں۔ پھر تم الا اللہ تک پہنچو گے۔ کسی کو یہ کہنے سے پہلے کہ یہ اللہ نہیں ہے' یہ سمجھنا پڑے گا کہ یہ اللہ ہے۔ شواہد اور غور و فکر کے بعد تم غیر ضد خدا کو رد کرو اور پھر الا اللہ تک پہنچو۔

سو اسلام میں اللہ نے جو ہمیں قانون دیا ہے' وہ ایک بنیادی جدلیات سے شروع ہوتا ہے اور بنیادی جدلیات میں اس کا قول مبارک ہے کہ دیکھو' مجھ پر اس وقت تک تم یقین نہیں لا سکتے' جب تک کہ تم دوسرے خداؤں کو ترک نہیں کرو گے۔ ظاہر ہے کہ پر اسس عقیدہ ایک سادہ اعتبار کا نہیں ہے۔ یہ ایک انتہائی مشکل فیکلٹی' انتہائی سوچ سمجھ اور غور و فکر اور ایک انتہائی تیز جدوجہد کا نام

ہے، جس کے ذریعے ہم معاملات اور حقائق کو پرکھتے ہیں اور بالآخر کسی خدا کے یقین تک پہنچتے ہیں۔

اب ایک اور نقطۂ نظر کہ اللہ نے بہت سے پیغمبروں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست کہا بلکہ اس سے اتنا خوش ہوا کہ کہا 'انی جاعل للناس اماما' میں نے تجھے تمام الناس کا امام مقرر کیا۔ اولادِ ابراہیم کو بھی ممتاز کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں وہ کیا صفت تھی کہ انہیں اولاد نبی آدم کا سردار کہا؟ قرآن میں وہ کیا پراسس لکھا ہوا ہے، جس میں وہ اپنے زمانے کے مروجہ خداؤں کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر ان کو بحث و تمحیص اور تحقیق کا موضوع بناتے ہیں اور پھر انہیں رد کرتے ہیں۔ جب ستارہ چڑھا تو ابراہیم نے کہا 'ھذا ربی یہ میرا رب ہے۔ جب ڈوب گیا تو کہا 'نہیں' میں زوال پذیر کو خدا نہیں سمجھتا۔ ابراہیم نے ایک ایسی کسوٹی سامنے رکھی جس کو لے کر وہ اپنی بحث اور اپنی منطق کو آگے بڑھا سکتے تھے۔ ان کی کسوٹی یہ تھی کہ خدا کوئی بھی ہو، وہ ہوگا جو زوال پذیر نہیں ہوگا۔ خدا لازوال ہے جن چیزوں کو انہوں نے اپنے اعتبار پر پرکھا 'ان کو زوال پذیر پایا۔ حتیٰ کہ وہ اس حتمی نتیجے پر پہنچ گئے کہ میرے اردگرد ستاروں میں کوئی خدا نہیں ہے۔ سب زوال پذیر ہیں۔

جب وہ اس مقام عقل تک پہنچے' تو انہوں نے تسلیم کیا اور ان کا دانشورانہ یقین پورا ہو گیا۔ پھر بھی ابراہیم علیہ السلام کو خلش رہی۔ قالا رب ارنی کیف تحی الموت کیا تو مجھے دکھا سکتا ہے کہ مردہ کو زندہ کیسے کرتا ہے؟ اللہ نے کہا 'اولم تو من اتنی ذہنی مشقت اور اتنے تردّد کے بعد بھی تو اس بات پر ایمان نہیں لایا؟ ابراہیم نے کہا 'بلا ولکل یطمئن قلبه' ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مکمل ذہنی طور پر قائل ہو چکا ہوں مگر میرا دل ہے' جو مشاہدے کی طلب کرتا ہے۔ یہ پراسس علم الیقین سے عین الیقین کی طرف بڑھنے کا ہے۔

جب میں خدا کے تصور پر ریسرچ کر رہا تھا' تو میں نے ان تمام دلائل کو رد کیا' جو فلسفے یا منطق سے نکلتے تھے۔ میرے خیال میں کوئی بھی فلسفیاتی دلیل کسی دوسری فلسفیاتی دلیل سے رد ہو سکتی تھی اور اقبال کے بھی Antological 'Teleological 'Cosmological دلائل کے بعد بہت سے فلاسفرز نے دھجیاں اڑا دیں۔ Logical Positivists اور دیگر فلاسفروں نے اس کے تمام تشکیلِ الٰہیات کے فلسفے کو رد کر دیا۔

میں کسی دلیل کی تلاش میں تھا' جو اقبال کی تشکیل الٰہیات جدید کو آگے بڑھائے۔ ایسی دلیل جس کی بنیاد فلسفے پر نہ ہو۔ آیا مجھے خدا کا دفاع اپنے ذمے لینا تھا؟ میں اتنی بڑی ذات گرامی اور حقیقت مطلقہ کا اتنا ادراک ہی نہیں رکھتا کہ میں اس کا دفاع کر سکوں۔ چنانچہ مجھے کوئی اور طریقہ ایسا ڈھونڈنا تھا' جس سے میں خدا کے اثبات کا تعین کر سکوں۔ میرا یقین تھا کہ اگر خدا خدا ہے تو اس نے ہر زمانے میں اپنے لیے ناقابل شکست دلیل رکھی ہوگی۔ اگر وہ خدا ہے' تو مجھے اس دلیل تک پہنچنا ہے۔

میں اس دلیل تک اس وقت پہنچا' جب میں نے قرآن حکیم کی پہلی آیت پڑھی جس میں اللہ نے کہا' الم ذالک الکتاب لاریب فیہ' یہ وہ کتاب ہے' جس میں کوئی شک نہیں۔ یہ میرے لیے تھیسز بن گئی۔ خدا اس آیت کو لکھنے کے بعد ایک عجیب سے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہہ رہا ہے کہ اے معترض! کوئی شک ہے تو نکال لاؤ۔ مجھے ایسے لگا' جیسے یہ آیت میرا منہ چڑا رہی ہو اور کہہ رہی ہو کہ تو جو اپنے آپ کو دانشور اور عالم سمجھتا ہے' بہت ساری کتابوں کا حافظ سمجھتا ہے تیرے پاس جدید Skepticism کی لازہیں۔ تشکیک کے بحران ہیں۔ بات بات پر تو شک کرتا ہے۔ اگر تجھے میرے ہونے کا شک ہے تو یہ کتاب جو کہ میرا ڈیٹا ہے' اس کا ایک لفظ ہی غلط ثابت کر دکھا۔ اگر ایسا کرے تو میں سچا خدا نہیں ہو سکتا۔ آپ اور میں ایک آدھ غلطی کے باوجود سچے رہیں۔ لوگ ہمیں گنجائش دے دیں مگر یہی گنجائش خدا کو نہیں دی جا سکتی۔ اگر خدا کی لکھی ہوئی ایک بات بھی غلط ہو جائے تو وہ خدا نہیں رہتا۔ ایک کتاب یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ میں اللہ کا ڈیٹا ہوں۔ میں اللہ کے لفظ ہوں۔ تمام معلومات جو مجھ میں ہے' اللہ کی ہے۔ تو پھر آپ کا یہ حق بنتا ہے کہ قرآن کو دوستوں کی طرح نہیں چاہے دشمنوں کی طرح پرکھو۔

کیوں؟ میں یقین رکھتا ہوں کہ انسان کی آزادی اور انسان کی غلامی میں صرف قرآن حائل ہے۔ قرآن نہیں ہے تو میں آزاد ہوں۔ اگر قرآن ہے تو میں غلام ہوں۔ اگر قرآن ہے تو خدا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خدا کوئی نہیں۔ جب اس ڈیٹا کو رد کر کے میں خدا سے آزادی حاصل کر سکتا ہوں تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اسے محبت' خلوص اور عبودیت سے پڑھوں۔ آپ میں سے کوئی شخص ایسا ہے' جو اپنی آزادی غلامی کے بدلے میں دے گا؟ اگر آپ میں یہ حوصلہ اور تنقید ہے تو پھر آپ کو قرآن ایسے احساس اور معروضی سائنسی انداز سے پڑھنا پڑے گا جس سے آپ

خدا کی تلاش کر سکیں اور اسے پاسکیں۔

اسی نقطہ نظر سے میں نے قرآنِ حکیم کا مطالعہ شروع کیا۔ میرے پیش نظر اپنی آزادی کا تحفظ تھا۔ بحیثیت انسان ایک جابر مطلق ذات سے آزاد ہونے کا خیال تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس سے نکلنے کا کوئی چانس نکل آئے گا۔ آخر 365 صفحے کی کتاب ہے۔ بے شمار واقعات و حادثات میں کوئی تو غلط نکل آئیں گے۔ میں نا کام ہو گیا۔

مجھے عذاب قبر سے واسطہ نہیں ہے۔ مجھے یہ ساری چیزیں فضول لگتی ہیں۔ ان ساری چیزوں کا وجود اللہ سے ہے۔ اگر آپ عالم برزخ اور موت کے بعد کے واقعات پر غور کریں۔ قبر کے عذاب اور ملائکہ کی باتوں پر غور کریں، تو یہ ساری چیزیں وجود رکھتی ہیں۔ اگر اللہ ہے، اگر اللہ نہیں ہے۔ تو ان چیزوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اب یہ سوال کہ کیا مذہب ہے کہ نہیں؟ کیا مذہب ایک تاریخ ہے یا یہ Occult کا ایک سیٹ ہے؟ اس کے لیے آپ کو یہ ضرور جاننا ہوگا کہ اس کے پیچھے جو اتھارٹی ہے وہ حقیقی ہے کہ نہیں۔ یہ وہ بنیادی سوال ہے، جس کا ہم کبھی سامنا نہیں کرتے۔ باقی سوالات ایک ہی سوال کے ٹوٹے ہوئے مختلف پہلو ہیں، لیکن جب ہم سب سے بڑے سوال کی طرف جاتے ہیں تو پہلا سوال یہ ہے کہ انسان آزاد ہے کہ انسان غلام ہے؟ پہلے سوال کو محکم کرنے کے لیے دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ آیا خدا ہے کہ خدا نہیں ہے؟ اگر خدا ہے تو پھر آپ آزاد نہیں ہیں۔

بنیادی سوال ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ آیا میں اس بحران کو حل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں؟ کیا میرے ذہن میں یہ سوال شدت سے آ رہا ہے کہ میں خدا کے موضوع اور وجود اور اس کی موجودگی کے لیے اتنی مشقت کروں؟ ریسرچ سے جاننے کی کوشش کروں اور شواہد اور دوسرے طریقوں سے یہ کھوج لگاؤں کہ آیا خدا ہے یا خدا نہیں ہے؟ میں نے تو اس طرح سے خدا کو پایا۔ میرے پاس خدا سے انکار کی کوئی دلیل نہ رہی۔ یہ آٹھ سال کی جدوجہد ہے، جو میں نے ایک سوال پر صرف کی۔ ایک انتہا درجے کے کرب میں ڈوبے انسان کا سوال، جو کوشش کر رہا تھا کہ بہت بڑے بوجھ سے آزاد ہو اور چکی کے پاٹ میں پسنے سے بچ جائے۔ بالآخر میرے پاس فرار کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

دوسرا سوال اس کی طرف حرکت کا ہے۔ اسے ہم تصوف کہتے ہیں۔ علمی سوال کے حل

کے بعد اب خدا کی طرف جانے یا نہ جانے کا سوال ہے۔ جو خدا کی طرف بڑھنے کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ عین الیقین کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ مشاہدات ربانی کی طرف پیش رفت کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کو ہم تصوف کہتے ہیں۔

انتھراپالوجی کے اعتبار سے خدا کے بغیر مذہب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلا اور آخری مذہب اس وجہ سے وجود میں آیا کہ زندگی کے مصائب' اداسیوں' تنہائیوں اور رشتہ داروں کی محرومیوں میں اسے کسی بڑی ذات کے آسرے کی ضرورت محسوس ہوئی' تو اسے خدا کا خیال آیا۔ اسے پتہ چلا کہ مذہب خدا کی طرف جانے کا رستہ ہے۔ اس نے مذہب کو اختیار کیا۔ مذہب کا بذات خود اپنا کوئی وجود نہیں۔ مذہب اپنے وجود کے اعتبار سے پرانے زمانے کا Occult تو بن سکتا ہے' مذہب نہیں رہتا۔ رسم و رواج جہاں آ کر رک جائیں' وہاں ایک بُت پیدا ہوتا ہے۔ خدا کے ساتھ کسی کی عقل اور شعور نہیں رکتا۔ خدا کے ساتھ کوئی Occult نہیں ہے جبکہ خدا کے بغیر ہمیشہ ایک Occult ہے۔ چاہے وہ کسی فلسفی کا Occult ہی کیوں نہ ہو۔

پلٹنے کی اہمیت

بعض اوقات جبلت اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ وہ صحت دماغ پر غالب آ جاتی ہے۔ جیسے کبھی کبھی غصہ انسان کے اچھے احساسات پر غالب آ جاتا ہے۔ انسان ہر وقت کمزور ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی چاہتا ہے کہ انسان اس کے سامنے طاقت ور نہ بنے۔ ہمارے تکبرات اور ہمارے جہل و خرد کا علاج یہ ہے کہ ہم اللہ کے سامنے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے رہیں۔ خطا و نسیان ہمارا ڈس کریڈٹ نہیں ہے۔ ہمارا ڈس کریڈٹ واپس نہ پلٹنا ہے۔ توبہ کے دروازے کھلے ہیں۔ احساس ندامت کا احساس بغیر خیال کے نہیں آتا۔ میں اللہ میاں کو طاقت ور سمجھ کر اس کی طرف نہیں پلٹتا۔ میں جب بھی اللہ کی طرف جاؤں گا تو میں تو ایک ایسی مہربان ذات کی طرف جاؤں گا جس کے بارے میں مجھے پتہ ہے' وہ اختیارات کلی کی مالک ہے اور میری خطا و نسیان اور میرے ثواب و عذاب اسی کے پاس ہیں۔ اگر میں ثواب مانگنے اس کے پاس جا سکتا ہوں تو پھر خطا کی معافی مانگنے بھی جا سکتا ہوں۔

آپ کو پتہ ہے' انسان نے سفر کیسے شروع کیا؟ خطا سے شروع کیا اور مغفرت پر ختم

ہوا۔ انسان کا پہلا ایکٹ غلطی کا ارتکاب ہے اور سب سے پہلا خدا کا ایکٹ اس کو معاف کر دینا ہے۔ آپ ستّر مرتبہ خطا کریں۔ اگر تمام زندگی خطا کرتے رہیں، مگر آپ کے دل میں خیال راسخ ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے تو اللہ بخشے گا۔

ایک شخص کو پوری زندگی میں اپنی ایک نیکی بھی نظر نہ آئی۔ اس نے اپنے بچوں کو وصیّت کی کہ مرنے کے بعد مجھے جلا دینا اور میری راکھ کچھ سمندر میں، کچھ پہاڑوں پر اور کچھ صحراؤں میں بکھیر دینا تاکہ میں جمع نہ ہو سکوں۔ مرنے کے بعد اس کی وصیت پوری کی گئی۔ اللہ نے ہواؤں، پہاڑوں اور سمندروں کو حکم دیا کہ جو کچھ تمہارے پاس اس کا ہے، واپس لاؤ۔ انہوں نے ایک ایک ایٹم جوڑا اور بندہ سامنے آ گیا۔ اللہ میاں نے کہا، باقی باتیں صحیح ہیں۔ یہ کیا تو نے عجیب بات کی، کیوں کی؟ اس نے کہا، سرکار عالی مقام! میں نے اپنی کریڈیبلٹی اور بیلنس شیٹ دیکھ لی تھی۔ پوری زندگی میں ایک بھی نیکی نہیں تھی۔ میں بہت ڈرا کہ اب تو اللہ سے بہت مار پڑے گی، بہت سختی ہوگی۔ میں نے کہا کہ ایسی حالت میں اپنے آپ کو ایسے ماروں کہ کبھی جمع نہ ہو پاؤں۔ خدا نے کہا، کیا تجھے یقین تھا کہ کوئی مارنے والا بخشنے والا ہے؟ خطا کی جزا اور سزا دینے والا کوئی ہے؟ اس نے کہا، پروردگار! ساری زندگی باقی بڑی خطائیں کیں لیکن ایک بات کا مجھے پورا یقین رہا ہے کہ کوئی اللہ ہے، جزا اور سزا کا جو مالک ہے تو اللہ نے کہا، اس سے بہتر یقین تو کسی بڑے ولی کا بھی نہیں ہو سکتا۔ تجھے میں نے بخش دیا۔

پہلے چونکہ طریقہ کار متعین نہ تھا، لیکن ہمیں قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ قابیل نے قبر میں اتر کر اپنے بھائی کو پنجوں سے زمین کھود کر چھپایا تھا۔ ابھی بھی ہمارے پاس جو ماقبل تاریخ کی لاشیں دریافت ہوئی ہیں یعنی پتھر کے زمانے میں یا نیوسٹون ایج کی، وہ ڈھکی ہوتی ہیں اور کھدی ہوئی قبریں ہیں۔ ان میں ہمیں کوئی اس قسم کی نعش سوزی نظر نہیں آتی، بلکہ آگے چل کر انہی نعشوں کو ممّی کرنے اور انہیں محفوظ کرنے کا عمل جاری رہا۔ یہ رسم کالنگا کی جنگ کے بعد ہندوؤں میں پھیلی۔

پہلے جب قربانی آسمانوں سے قبول ہوتی تھی تو ایک برقی بجلی آتی تھی۔ ہابیل و قابیل پر یہی مرحلہ آیا۔ انہوں نے بھی قربانی رکھی۔ جو قربانی قبول کی جاتی تھی۔ آسمانوں سے آگ گرتی تھی اور لے جاتی تھی۔ ہندوؤں کی میتھالوجی میں پہلی تثلیث اندرا، متھرا اور ورونا کی ہے۔

دوسری شیوا' وشنواور برہما کی ہے۔دونوں میں پاوترتا کا سمبل ہے۔یعنی پاک کرنے والی۔حضورؐ کی حدیث ہے کہ آگ' پانی اور خاک تینوں چیزیں پاک کرتی ہیں۔ہم پر دو چیزیں حلال کی گئی ہیں یعنی پانی اور خاک۔وہ چونکہ قدیمی قربانیوں کے زمانے سے چلے آتے ہیں تو بنیادی طور پر ویدک مذاہب اور ویدانتا کا مذہب بھی الٰہیاتی مذہب ہے۔

اس لیے کہ پہلی تثلیث کا جو زمانہ اندرا' متھرا اور وروناکا ہے' اس میں آریاؤں کا بنیادی خدا صرف ایک ہے اور وہ اندرا ہے۔اندرا کے دو پہلو ہیں۔جنت کا خدا اور طاقت کا خدا۔ یہ ان کے اللہ کے بارے میں بنیادی تصورات ہیں۔جونہی وہ انڈیا کے اندر داخل ہوتے گئے' انہوں نے اپنی اندرا کی شادیاں کرادیں۔ان میں سے طہارت کی دو چار چیزوں میں ایک آگ بھی ہے۔واکنگ بھی اس پر عمل پیرا رہے ہیں۔ان کے ہاں دو پہلو نمایاں تھے۔سمندر' سفر اور آگ۔

مگر چائنیز جو پرانے ہیں' وہ بڑا گڑھا کھود کر نیچے لاش رکھتے اور اس کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھتے ہیں' چنانچہ جس قوم کا مرنے کے بعد یہ کانسپٹ ہو' اس کے مطابق اس نے اس کا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے تو میرا خیال ہے کہ جلانے کا عمل اس لیے پیدا ہوا کہ بڑی جنگ میں بہت سارے لوگ قتل ہوئے اور ان سے انتہائی بدبو پھیلی۔سو اس کے لیے یہ طریقہ استعمال ہوا۔

بعد میں مسلمانوں نے اس کانسپٹ کو بدلا۔تمام بڑے مذاہب دفناتے ہیں۔چاہے وہ یہودی یا عیسائی ہوں۔بنیادی طور پہ خدا کا طریقہ کار وہی ہے' جو ان بڑے مذاہب کا ہے۔کہتے ہیں کہ کلنجا کی جنگ میں ہزاروں لوگ مارے گئے' جو اشوکا نے لڑی' جس کے بعد وہ بدھ مت کا پیروکار ہوگیا۔اس جنگ میں اتنی بدبو پھیلی کہ لاشوں کو جلانے کا طریقہ اپنایا گیا۔یہ ڈسپوزل کے طریقے ہیں۔اللہ کے پاس یہ طریقہ نہیں ہے۔ایک دفعہ ایک کافر کو ہجو رسولؐ کی وجہ سے جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جلایا تو حضورؐ نے منع فرمایا کہ ہم اس قسم کا عذاب دینے والے نہیں ہیں۔ ہندو بڑی سیانی قوم ہے جو انہیں آخرت میں ماننا ہے وہ ادھر بھی لے لیتے ہیں۔

آزمائش کی پہچان

پروردگار عالم نے فرمایا' ولنبلونکم بشی من الخوف و الجوع و نقص من الاموال والانفس والثمرات 'بلاشبہ حضرت انسان ہم تمہیں آزمائیں گے۔ بھوک' غم و بلا' نقصان' مال و دولت کے نقصان سے وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبتہ ہماری طرف سے بشارت دو ان کو' جن پر مصیبت آئی اور وہ ثابت قدم رہے اور صرف اتنی سی بات کہی' وقالو انا للہ و انا اللہ الیہ راجعون' میں نے آپ کو علاج بتا دیا ہے۔ اس کی تسبیح کثرت سے کیا کریں اور کہا کریں کہ اے پروردگار! یہ بلا تیری طرف سے آئی ہے اور ان شاء اللہ ہم اس میں سے گزر جائیں گے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ گرسنگی کے عالم میں بڑی دُور نکل جاتے تھے۔ ابتدائے عہد میں پریشانی اور بلا میں گرفتار ہوتے۔ ایک دفعہ تین دن کے فاقے سے زمین سے لوٹ رہے تھے۔ شیطان نے آتے ہی کہا کہ دوستی کا مزہ چکھ لیا؟ اللہ میاں کے بڑے دوست بنے تھے نا' دوستی کا مزہ چکھ لیا؟ یہ کیسا دوست ہے جس نے تمہیں کھانے کو کچھ نہیں دیا اور بھوک سے مار رہا ہے۔ کم از کم اب تو اسے چھوڑ دو۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا کہ میں نے اس کو دیکھا اور پایا اور میں نے کہا کہ تو جھوٹا ہے۔ میرا رب سچا ہے۔ فان مع العصر یسراً وان مع العسر یسرا' میرے رب نے کہا ہے کہ ہر تنگی کے بعد کشادگی ہے۔ بلاشبہ ہر تنگی کے بعد کشادگی ہے اور جس کو مصیبت میں اپنے رب کی بات پر یقین ہوا' وہ بلا سے اخلاص پا گیا۔

عذاب اور آزمائش

عذاب اور آزمائش میں بڑا فرق ہے۔ آزمائش اپنے نتیجے کو دوبارہ پلٹتی ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال حضرت ایوبؑ کے ضمن میں آتی ہے۔ وہ بلا اور 8 برس تک بیماری میں مبتلا کیے گئے۔ حتیٰ کہ وہ پکار اٹھے انی مسنی الضر وانت الرحم الرحمین' خدا نے ان سے عذاب اتارا اور اتارنے کے بعد ان کو سارا کچھ واپس کیا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ انہیں شان و شوکت دی۔ بلا' عذاب اور آزمائش میں ایک فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ اگر آزمائش ہے اور

آزمائش میں آپ خدائے حقیقی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور خدا سمجھتا ہے کہ میرا بندہ انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر امتحان میں کامیاب ہوا تو آپ کی نہ صرف مصیبت کٹتی ہے بلکہ آپ پہلے سے بہتر حال میں چلے جاتے ہیں اور جو عذاب ہے اس میں بہتری نہیں ہوتی۔ وہ زوال نہ رکتا بلکہ وہ بالآخر آپ کو تباہ و برباد کر کے ہی دم لیتا ہے۔

علم بطور انسٹرومنٹ

علم بطور انسٹرومنٹ کی اہمیت یہ ہے کہ ہم سب لوگ خدائے ذوالجلال کے اس مخصوص پیٹرن سے ہیں، جس میں اللہ نے اپنے لیے جو سب سے بہترین اور اوّلین چیز منتخب کی، وعلم آدم الاسما کلھا، اس نے معلّم ہونا اور تعلیم دینا پسند کیا۔ جب اس کے شاگرد کا مقابلہ اعلیٰ ترین صفاتی مخلوقات ملائکہ سے پڑا تو بطور ایک استثنائی کیس اس نے مجبور نہیں کیا کہ میرا شاگرد تم سب سے بہتر ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ میں تم دونوں کو ایک پرچہ اور ایک ٹیسٹ دے دیتا ہوں۔ ملائکہ کو کہا، تم بھی اسی یقین اور علم کی وجہ سے کسی منصب کے دعوے دار ہو، تمہیں بھی میں ایک پرچہ دے دیتا ہوں۔ تم بھی کوشش کرو۔

یہ وہ وقت تھا، جب علامت سے انسان زبان کو بڑھ رہا تھا۔ اشارہ اور کنایہ سے ایک زبان کو دریافت کر رہا تھا، جس سے وہ اپنا مافی الضمیر بیان کر سکے۔ وہ ان غاروں میں، جہاں اس کی تصاویر آج بھی پائی جاتی ہیں، جیسے سپین کے غار ہیں اور ان میں جو نقش بنے ہوئے ہیں، وہ اپنے آپ کو صرف اشاروں سے بیان کرتا ہے۔ اب اس کو ایک زبان کی بنیاد دے دی گئی۔ یہ آپ کے پاس جو بنیادی چودہ حروف ہیں۔ قرآن حکیم میں جنہیں آپ حروف مقطعات کہتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ تختی حضرت آدمؑ کو بھی عطا ہوئی اور حضرت ملائکہ کو بھی عطا ہوئی۔ پھر ان کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ ممکن ہے اس امتحان کو کلیئر کرنے میں ہزاروں، لاکھوں برس خرچ ہو گئے ہوں۔ ہمارا مطالعہ

یہ کہتا ہے کہ نیوسٹون ایج کے بعد جب انسان نے بستیاں بنانی شروع کیں۔ گھر آباد کرنے اور بچوں کی حفاظت کرنی شروع کردی تو ساتھ ہی اس نے زبان کو ڈویلپ کرنا بھی شروع کردیا۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد متحارب فریقین جو علم کا دعویٰ رکھتے تھے' میں سے ایک فریق واپس آیا اور واپس آ کے کہا' قالو سبحانک لاعلم لنا کہ اے مالک' تو پاک ہے' خطا سے۔ لاعلمنا ہمیں تو کچھ علم نہیں ہے الاماعلمتنا سوائے اس کے کہ تو ہمیں کچھ بتا دے جو پروگرامنگ ہماری کردے۔ ہمارے اندر ڈیٹا ڈال دے' اس ڈیٹا کے علاوہ ہم میں یادداشت ہے نہ ادغام نہ تسلسل ہے۔ ہم اپنی سابقہ نسلوں سے تجربہ لے نہیں سکتے۔ آنے والی نسلوں کو دے نہیں سکتے۔ ہمارے معاملات محدود ہیں۔ ہم اپنے دعوے کو چھوڑتے ہیں اور تجھ سے معافی کے طلبگار ہیں کہ تیری ایک خصوصی اور اعلیٰ ترین مخلوق کے سامنے ہم نے دعویٰ خطاب کیا۔ خداوند کریم نے پہلا سجدہ تعظیم اسی علمیت کے سامنے کرنے کا حکم دیا۔ واذقلنا للملئکۃ السجدو لادم فسجدو الا ابلیس' والا واقعہ علم ودانش کا مظاہرہ تھا۔ حضرت آدم کی اس سیکھنے کی سہولت کے بعد تمام مخلوقات وہ ارضی ہو یا سماوی پر سجدہ تعظیم لازم ہوا۔ یہ جسمانی سجدہ نہ تھا' یہ علم کو' تعلیم کو سجدہ تھا۔ اس کے بعد بہت سارے اساتذہ اللہ کے اس علم کو جاری رکھنے' خدا کی دی ہوئی شناخت کو آگے بڑھانے اور علم وعقل ومعرفت کے ان اسباق کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے آتے رہے۔

مگر ایک سوال درمیان میں یہ پیدا ہوا کہ خدا کے نزدیک انسان کی اس خوبی کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اگر آپ نے سورہ دھر کو دیکھا ہو تو آپ کو بڑی آسانی سے سمجھ آتا ہے کہ اللہ کا آپ کو زندگی گزارنے کی سہولتیں دینا ایک ضمنی مقصد تھا۔ یہ اصل مقاصد میں نہیں ہے۔ وہ تخلیق اور تسلسل ضمنی مقاصد میں سے ہیں۔ اصل مقاصد میں سے نہیں ہیں۔ وہ آپ کو یاد دلاتا ہے کہ بلاشبہ زمانے میں انسان پر ایک ایسا وقت گزرا کہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا جبکہ آدم قابل ذکر شے ہے۔ آدم وہ ہے' جس کے بارے میں اللہ زبان حال سے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ زمین وآسمان کا خلیفہ ہے۔ کائنات کا وارث ہے۔

علم کی تمام فیکلٹی سمجھنے اور سوچنے کی طاقت پر انحصار رکھتی ہے۔ انسانی تعقل ہے' جو اسے اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اللہ کو بطور ترجیح اول شناخت کرے اور اسے ایسا ہی تسلیم کرے۔ ذہن وہ واحد پیچیدہ کمپیوٹر ہے' جس کو آپ ترجیحات کا سبق ازخود نہیں دیتے۔ یہ آپ کو صبح سویرے اپنے

طور پر ترجیحات کی تمام لسٹ پیش کرتا ہے۔آپ فیصلہ کرتے ہیں کہاں سے ہم نے ترجیح اول کس کو چننا ہے۔کس کو دوسری ترجیح اور کس کو تیسری ترجیح قرار دینا ہے۔بدقسمتی سے ہمیں زندگی کی فوری ترجیحات تو بڑی آسانی سے یاد رہتی ہیں لیکن اولین ترجیح کی کوئی فکر ہی نہیں۔

(جیسے سکول جانا' اپنے کام کرنا' کپڑے سلانا اور بات چیت' معاشرت کے آداب وغیرہ۔ مگر ایک پوری زندگی کی ترجیح یعنی اللہ ہم سے مس ہو جاتا ہے۔بالعموم جب ہم اپنی کمٹمنٹ اور مذہبی رویہ کو جاتے ہیں تو ہم یہ ذمہ داری نیم پڑھ یا ان پڑھ لوگوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔اگر اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔اللہ ہی کائنات میں تعقل کا واحد منبع و مرکز ہے اور علم وحکمت تمام کی تمام اسی سے جاری ہوتی ہے تو کم از کم اس کی کتاب کا بھی تو کوئی رینک ہوگا؟ کتاب کے مقاصد عالیہ کا کوئی رینک اور کوئی انٹلکچوئل پیٹرن تو ہوگا۔یہ بہرحال رسل کی پرنسپل آف میتھمیٹکا سے بڑی کتاب ہونی چاہیے۔یا وائٹ ہیڈ یا ڈبل ہیلیکس سے اس کو بہتر ہونا چاہیے۔یا کسی بھی Behaviourism کی سائیکالوجی کی کتاب سے۔کیونکہ وہ سائیکالوجی دینے اور عطا کرنے والا ہے۔ظاہر ہے' اس کتاب کی ایک ایسی سطح بھی ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے اہلِ علم کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

میں ان ڈگریوں کو محض سوچنے کا انسٹرومنٹ خیال کرتا ہوں۔ایم اے' ایم ایس سی' پی ایچ ڈی تو صرف آپ کو انسٹرومنٹ مہیا کرتے ہیں۔سوچنے کا وقت تو بعد میں آتا ہے۔ان ڈگریوں کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو پتہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس انداز سے سوچنا ہے۔اس ترتیب سے ہم نے تحقیق کرنی ہے۔پیٹرن یہ ہے۔سیمینار ایسے مرتب ہوتے ہیں مگر جب آپ خدائے واحد کے بارے میں سوچیں گے' غور کریں گے تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ ہم نے کائنات کی سب سے بڑی کتاب کو ایک ایسے ان پڑھ کی تحویل میں دے دیا ہے' جو شاید میٹرک پاس کرنے کے قابل نہ تھا۔اسی مولوی کو جس کو آپ آٹھویں کلاس میں داخلہ بھی نہیں دے سکتے' اس کو آپ نے دنیا کی سب سے بڑی کتاب کا وارث بنا دیا۔یہ ہمارا قصور ہے۔مولوی کا نہیں' اہلِ علم کا قصور ہے۔)

علم' دعویٰ' دجال

ایک مخصوص وقت کی تمام پیغمبر نشاندہی کر گئے ہیں۔حضرت دانیالؑ سے لے کر حضور

اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق ایک وقت ضرور ایسا آئے گا جب انسان وہی کام کرے گا جو اللہ کرتا ہے۔ بہت سے دعوے اپنے ساتھ ایسے منسوب کرے گا جو اللہ کے ساتھ منسوب ہیں اور وہ زمین پر خدائی کا دعویٰ دار ہوگا۔ اسے دجال اس بنا پر کہیں گے کہ بہت سارے لوگ اس کے تابع ہوں گے۔ اس استثنیٰ کی طرف اللہ اور اس کے رسولؐ نے نشاندہی کی ہے۔

میرے خیال کے مطابق ہم دورِ دجال میں داخل ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر جب قرآن کی ان آیات کے بارے میں لوگ شبہ کرتے ہیں جن میں اللہ نے کہا ہے کہ ان پانچ چیزوں کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔ پہلا یہ کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ کسی کی موت اور زندگی کا قیام کہاں ہے؟ رزق کی فراہمی؟ بادل کون برساتا ہے؟ سو بہت سارے لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آج کے دور میں انسان مصنوعی ذرائع سے بارش بھی برسا رہا ہے۔ سونوگرافی کی مدد سے وہ بچے کی جنس بھی جان لیتا ہے۔ پھر کیا یہ خدا کی آیات غلط ہو گئیں؟

مگر اس سے بہت پہلے پیغمبروں نے مسلسل اور متواتر ایک استثنائی دور کی نشاندہی کی ہے جب خدائی کا دعویٰ ایک بندہ یا ایک گروپ آف تھاٹ دہرائے گا اور اپنے آپ کو خدا محکم کرے گا۔ اس کی ایک آنکھ ہوگی اور وہ بڑی روشن ہوگی۔ اس کو سمجھنا آسان ہے کہ اس کی دوسری آنکھ، جو روحِ تسلیم اور مقبولیت ہے، وہ نہیں ہوگی۔ وہ اپنی شاندار سرگرمی اور اپنے خیال کی پختگی کی بنا پر اپنے آپ کو خدا کا تصور قرار دے گا۔ ابھی کچھ عرصے سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ اقوامِ مغرب میں خود پسندی وجود پا رہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو کبھی گاڈ امریکہ کبھی گاڈ وائٹ مین کہتے ہیں۔ یہ اصطلاحات اب حرکت میں آ رہی ہیں۔ استثنائی دور شروع ہو چکا ہے۔ اگلے زمانے میں شاید خدا پر یقین ایسے ہی کسی عجیب و غریب واقعے سے ہوگا۔ ہمیں حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک شخص دجال کے پاس جائے گا اور کہے گا کہ کیا تو مجھے مار کر زندہ کر سکتا ہے؟ وہ کہے گا کہ ہاں۔ وہ اسے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ وہ کہے گا کہ اب تو دوسری بار ایسا نہیں کر سکے گا۔ وہ پھر اسے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ وہ تیسری مرتبہ ایسے نہیں کر سکے گا۔

اس سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ خدا کی قدرت میں اس قسم کے تسلسل میں کوئی بریک نہیں ہے۔ وہ اگر ہزار مرتبہ بھی چاہے تو انسان کو مارے اور زندہ کرے مگر دجال کی اس صلاحیت کی ایک حد ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اگلے زمانے میں میڈیسن یا جینیٹک سائنسز اتنی زیادہ ترقی کر

جائیں گی کہ وقتی طور پر موت کا مداوا ہو جائے گا۔

تعقل اور متضاد رستے

(میرا بھی پہلے یہ خیال تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ میں قبر میں جاؤں گا تو میرے لیے وہاں کوئی عزت واحترام کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ صرف یہی پوچھیں گے کہ تمہارا خدا کون ہے؟ اسی طرح ایک مزدور بھی قبر میں جائے گا اور اس سے بھی یہی کہا جائے گا کہ تمہارا رب کون ہے؟ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں یا تو خدا بے انصاف ہے کہ وہ آدمیوں کی صلاحیت پرکھے بغیر ان سے ایک ہی سوال کر رہا ہے یا پھر دوسری بات ہے کہ اور کسی چیز کی صلاحیت اللہ نے انسان کو دی یا نہ دی ہو اپنے آپ کو پہچاننے کی داخلی صلاحیت ہر فرد و بشر میں ضرور رکھی ہے اور یہی درست ہے۔)

تساہل، حادثہ، بیداری

تساہل مسلمانوں اور خاص کر پاکستان کے مسلمانوں میں اتنا ضرب المثل ہے کہ جناب اقبالؒ نے مصرعہ لکھا ''ایک مرد تن آسان تھا تن آسانوں کے کام آیا'' جس قوم کو اقبالؒ کی شاعرانہ غیرت نہیں جگا سکی، اسے اور کیا کوئی حادثہ جگائے گا۔ ہمیں ایک زیادہ بڑے جھٹکے کی ہوش میں لانے کے لیے ضرورت ہے۔ ہمارا نروس سسٹم تقریباً بے حس رہتا ہے اور وہ ایک بہت بڑے جھٹکے سے ہی دوبارہ زندگی کو استوار ہو سکتا ہے۔

(حضورؐ نے فرمایا کہ مسلمان بہت زیادہ ہوں گے، مگر ان پر وہن غالب ہوگا۔ میرے نزدیک تقسیم کے فوری بعد ہماری نالائقیوں نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہم تمام کے تمام دنیا کو پلٹ گئے ہیں۔ ہماری کمٹمنٹس ختم ہو گئیں۔ ہماری مقصد کے ساتھ دیانت ہوا ہو گئی۔ ہمارا مقصد حیات اور مقصد اخلاق جاتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اپنے آپ کو زوال پذیر گنتے ہیں۔ میرے خیال میں جب بھی اس قوم کی کچھ کرنے کی قوت جاگے گی، اس دن سے اس قوم کی کایا پلٹنی شروع ہو جائے گی۔

کارکردگی اور ذہانت میں یہی لوگ جب بیرون ملک جاتے ہیں تو معجزات برپا کرتے ہیں۔ حیران کن کارنامے انجام دیتے ہیں۔ یہ زمین پر اللہ کے بہترین لوگ ہیں۔ ان کا کارکردگی

اور علم میں کوئی ثانی نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اندرونی ملک ہماری ذاتی انا' ہمارے تکبرات' جہالتیں' تعصبات اور ہمارے خاندانی حالات ہمیں ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے اٹھنے میں مدد نہیں دے رہے۔)

طوفان اور رسول اللہؐ

انما یخشی اللہ من عبادہ العلما کہ اللہ سے سب سے زیادہ تو اللہ کے عالم ہی ڈرتے ہیں۔ رسول اللہؐ سے بڑا اللہ کا عالم کون ہو سکتا ہے؟ معمولی سا ایک پتہ بھی ہلے تو خشیت والا دل اس میں ناراضگی اور رضامندی کے امکان محسوس کر لیتا ہے۔ خدا کے رسولؐ اتنے دلیر تھے کہ جب ایک دفعہ مکہ میں آفت آئی تو سارے لوگ گھروں میں گھس گئے' بھاگ گئے۔ صرف ایک آدمی جو باہر نکلے' دیکھا کہ رسول اللہؐ مخالف سمت سے آ رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ امن ہی امن ہے۔ گھبراؤ مت! اتنے دلیر آدمی کو چھوٹی موٹی باتیں نہیں ڈرا سکتیں مگر یہ خشیت اللہ رسول کے ہاں خدا سے انتہائی انس' انتہائی محبت کے تحت پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس قسم کے آثار کو شبہ سے دیکھتے تھے کہ کہیں خدا ناراض نہ ہو جائے۔

اس کے ساتھ ہی چونکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے تذکرہ کیا تھا کہ جیسے قوم عاد و ثمود اور قوم شعیب اور اصحاب مدین پر اللہ تعالیٰ نے چنگھاڑ' آندھیاں اور تیز ہوائیں بھیجی تھیں' قدرتی طور پر ایک پیغمبر کا دل جب ان آثار کو دیکھتا تھا اور وہ چونکہ بہت زیادہ امت کا درد محسوس کرنے والے تھے' اس خوف سے ڈر جاتے تھے کہ کہیں میری امت سے کوئی ایسی غلطی تو نہیں ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا کے لیے یہ ہوا بھیجی ہے۔

پیار' محبت اور عشق

پیار' محبت اور عشق ہمارے ہاں ادب میں' گفتگو میں بعض اوقات ایک ہی معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن علم کی حد تک یہ جان لیں کہ قرآن میں لفظ مؤدت استعمال ہوا ہے۔ اس کشش یا اس دلچسپی کے لیے جو مرد کے دل میں عورت کے لیے رکھا گیا اور عورت کے دل میں مرد کے لیے رکھا گیا۔ قرآن نے اس کو مؤدت کہا لیکن محبت اس کے لیے مخصوص ہے۔ اگر ہم اسے

لٹرل صوفیانہ معنوں میں لیں اور اس محبت میں کوئی شریک ہوگا تو یہ شرک ہوگا۔ خواہ وہ عورت ہو' مرد ہو' خواہ دولت ہو۔

رہ گیا عشق' تو تفصیل میں نہیں جاتے۔ وہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ عشق خلل ہے دماغ کا۔ یہ بنیادی طور پر دماغ پر طاری محویّت ہے۔ کسی خیال' منظر یا کسی فرد کا آپ کے اعصاب پر اس طرح سوار ہو جانا' گویا یہ جذبات کا بھوت دماغ پر سوار ہونے کے معنوں میں ہے۔ بیماری کی حد تک کسی جذبے کا آپ پر مسلط ہو جانا' صحت مندانہ نہیں ہوتا۔ باقی پیار اور محبت کی حد تک ٹھیک ہے۔

اسلام پُر پیچ رستہ

سوال یہ کیا گیا ہے کہ ''آپ کے بقول منزل مقصود اللہ ہے' اسلام صرف رستہ ہے۔ میرے خیال میں حضرت انسان کا چودہ سو سال کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اسلام کوئی صراط مستقیم نہیں' بلکہ پُر پیچ اور خار رستہ ہے۔ اس قدر پُر پیچ اور خار راستہ کہ صحابہ کبار خود اس رستے پر گامزن نہ رہ سکے۔ صحابہ تو اس رستے سے نکل گئے۔ اگر آپ تابعین' تبع تابعین' تبع تبع تابعین اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کا ذکر کرتے' تو شاید اس کا مطلب اور ہوتا جبکہ نبی اکرمؐ کی وفات کے چند سال بعد ہی حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان جنگ میں صحابہ نے ایک دوسرے کو قصداً مار ڈالا۔

یہ آپ کی رائے ہوسکتی ہے۔ میرے علم کے مطابق حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی جنگوں میں زیادہ سے زیادہ سات اصحاب نے شرکت کی۔ باقی تمام وہ لوگ تھے' جو تازہ ترین مسلمان تھے۔ ان میں اصحابی کوئی نہ تھا۔ جنگ جمل میں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ تھیں اور جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت عمار بن یاسر اور دوسری طرف عمرو بن العاص اور حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ یہ کل ہمیں چار ہی نام نظر آتے ہیں۔ پانچواں اور چھٹا نام بھی شاید ہوگا۔ ان بڑی جنگوں میں اصحاب رسول شہید نہیں ہوئے نہ انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا بلکہ یہ نو واردان شوق تھے۔

تازہ واردان مسلمان تھے۔ یہی آپس میں لڑتے رہے۔ الا ماشاء اللہ اصحاب رسول میں اس قسم کی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ جنگ حنین میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کسی صحابی کے ہاتھوں نہیں مارے گئے۔ جب حضرت علیؓ کے مقابل آئے' تو حضرت علیؓ نے کہا' اے طلحہ! اے زبیر! تمہیں پتہ نہیں ہے کہ رسول اللہؐ نے کہا تھا کہ اے طلحہ! اے زبیر! تم علی کے خلاف لڑو گے اور علی اس وقت حق پر ہوگا۔ وہ اتنے اچھے لوگ تھے کہ انہوں نے فوراً اس بات کی شہادت دی اور میدان جنگ چھوڑ کے نکل گئے۔

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو معاف کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جنگ صفین میں عمرو بن العاصؓ اور امیر معاویہؓ بھی نہیں رہے۔ حضرت علیؓ بھی شہید نہیں ہوئے۔ صرف ایک لے دے کے حضرت عمار بن یاسرؓ شہید ہوئے۔ وہ بھی کسی صحابی کے ہاتھوں نہیں مرے۔ اس لیے تمام سوال ایک ایسے مفروضے پر قائم ہے جس کی شہادت تاریخ پر ہے' دین نہ مذہب سے ملتی ہے۔

اسلام' دین فطرت

اسلام دین فطرت اور اعتدال کی وجہ سے ہے۔ اسلام اگر پوری طرح سوچا سمجھا جائے تو انسان کے اندر جبلی اور عقلی توازن اور اعتدال قائم کرتا ہے۔ پروردگار نے کہا کہ اسلام دین فطرت ہے' تو اس کی تاریخ انسانی معاشرے کی ابتدا سے شروع ہوتی ہے۔ ایک حیاتیاتی آدمی' جو عقل سلیم سے بے گانہ باقی حیاتیاتی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو قتل و غارت میں مبتلا کیے ہوئے تھا' جب وہ تاریخ کے ادوار سے بڑھا تو اس پر اللہ نے ایک ایک قانون وارد کرنا شروع کر دیا۔ ہمیں عمرانیاتی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ زمانہ قدیم کے جو دور یا معاشرے ہیں' وہ ایک ایک قانون پر پنپتے چلے آئے ہیں اور جب وہ آگے بڑھتا ہوا حضرت موسیٰؑ یا عیسیٰؑ کے زمانے تک آیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی فطرت واضح طور پر جبلی رجحتوں اور عقلی یقین میں بٹ چکی تھی۔

یہود کی سب سے زیادہ باعث تحقیر بات اللہ کے نزدیک یہ تھی کہ بہترین تعلیم اور مشاورت کے باوجود یہ قوم ہمیشہ جبلی عادتوں کو پلٹ گئی تھی اور تمام عقلی ذرائع اپنی جبلتی عادتوں کے تحفظ کے لیے استعمال کرتی تھی۔ جیسے یوم سبت کا واقعہ ہے۔ خدا نے ان کو منع کیا کہ اس تالاب سے فلاں دن مچھلی نہیں

پکڑنا۔انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ خدا کا حکم ہے' بلکہ یہ کہا کہ خدا کا حکم تالاب سے مچھلی پکڑنے کا نہ تھا۔ انہوں نے اس حکم سے اغماض کا راستہ یہ نکالا کہ بیچ میں سے نالیاں نکال کر گھروں میں لے گئے اور یہاں پروردگار نے کہا کہ میں بھی ان کو تنگ کرنے کا طریقہ نکالوں گا۔وہ ہفتے والے دن زیادہ مچھلیاں اُوپر لے آتا تھا۔

مگر جب حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ آیا' تو لوگ سخت عبادت گزار تھے جنہیں ہم فلسطین کہتے ہیں' وہ بڑے متقی تھے۔ میں کبھی اپنے معاشرے میں دیکھتا ہوں تو بہت سارے ایسے گروہ دیکھتا ہوں جو مجھے بے پناہ متقی نظر آتے ہیں اور ہر وقت تلقین نماز میں لگے رہتے ہیں۔اس وقت حضرت عیسیٰؑ نے انہیں اندرونی علم سے آشنا کیا اور ان کو بتایا کہ تم منافق ہو۔تمہارا ظاہر اور ہے باطن اور ہے۔تمام تر عیسوی شریعت باطنی تعلیم پر مشتمل ہے۔انہوں نے کوئی قانون شریعت کا اضافہ نہیں کیا۔کوئی نیا قانون نہیں دیا بلکہ تمام تر باطنی شریعت کی نشاندہی کی' جسے فلسطین مکمل بھول چکے تھے۔

انسان جب اگلے معاشرے یا دور میں آیا تو پروردگار عالم نے اب ایک ایسے انسان کو چنا جو بظاہر بڑا کرپٹ' اُجڈ' جاہل' گنوار اور قتل و غارت کا شائق تھا مگر اس میں کچھ بہترین انسانی خصوصیات موجود تھیں۔خدا نے اسے پرکھا' جانچا اور پھر اپنے رسولؐ کے ذریعے پیغام دیا' تو اس پیغام نے جس طرح ان انسانوں کو بدلا اور جس چیز میں انہیں ڈھالا' وہی ہمیں اس چیز کا سب سے بڑا ثبوت دیتی ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔اگر آپ اصحاب رسولؐ کی وہ زندگی' جو اسلام سے پہلے تھی اور وہ زندگی' جو اسلام کے بعد ہے' کا مطالعہ کر لیں تو اسلام کی اس قوت سے شناسا ہو جائیں گے جو ایک وحشی اور غیر متمدن سوسائٹی کو جس نے قانون کا کچھ نہیں جانا تھا' جو محض ایک تناور درخت کی طرح انا' بغض اور کینہ میں ڈھلی ہوئی تھی' اصحاب رسولؐ میں ڈھالا' تو بخدا یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔اس سے بڑا اور کوئی ثبوت نہیں ہے۔

علماء کی تفرقہ بازی

علم جب کم ہوتا ہے' تو گھروندوں میں بٹتا ہے۔جب بڑھتا ہے تو تمام دنیا میں علم کے بڑھنے کا صرف ایک نشان ہے۔اقوام متحدہ کی ایک اندھی بہری لڑکی کو استاد نے بڑی محبت سے پالا۔اس نے پی ایچ ڈی کی اور وہ علوم عالم نسواں کی اقوام متحدہ میں محافظ بھی نکلی۔ڈاکٹر ہیلن کیلر

نے The best result of education is tollerence کہ علم کا بہترین نتیجہ برداشت ہے۔ یہ گروہوں کی بات نہیں، سنی شیعہ کی بات ہے بلکہ اس سے آپ بڑی آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علم کم ہے۔ اگر کوئی آپس میں لڑ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے پاس الفاظ کم ہیں۔ ان کے دلائل غارت ہو چکے ہیں۔ وہ صرف جبلی عادات سے غور و فکر شروع کر دیتے ہیں اس لیے وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر بحیثیت استاد میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے دائیں طرف شیعہ اور بائیں طرف اہل حدیث نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں کبھی اہل حدیث، کبھی اہل دیوبند اور کبھی حضرت بریلوی کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوں۔ مجھے تو آج تک یہ خیال نہیں آیا کہ میں اپنی اولین شناخت کو مجروح کر رہا ہوں۔ بریلوی یا سنی ہونا میری شناخت نہیں ہے بلکہ میری شناخت میرا مسلمان ہونا ہے۔ ہاں اگر کوئی میری مسلمانی چھینے گا تو پھر میں بقیہ ماندہ اداروں تک آؤں گا۔

اب دیکھئے، اہل حدیث کس کو کہتے ہیں؟ جو حدیث کو زیادہ جانتے ہیں۔ میں نے اپنے معزز دوست سے کہا کہ میں نے قرآن اور حدیث پڑھی ہے۔ قرآن میں بہت ساری صفات رسول اللہؐ کی آئی ہیں۔ سب سے بڑی صفت اللہ نے یہ دہرائی ہے وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین کہ میرا محبوب رحمت عالم ہے۔ آگے جا کے کہا' یہ وہ شخص ہے' جو میرے ہی ناموں کا اسم بامسمی ہے۔ رؤف الرحیم ہے۔ یہ نہیں کہا کہ عبدالرؤف یا عبدالرحیم ہے۔ اگر بین الکائناتی رؤف الرحیم کے شعبے میرے پاس ہیں تو زمین پر انسانوں کے رؤف الرحیم کے ٹائٹل اس کے پاس ہیں۔

آپ کا کیا خیال ہے' کیا آپ کو خدا کنفیوز کر رہا ہے؟ بالعموم تو لوگ کہتے ہیں کہ کسی کو رحمان یا رحیم کہہ کے نہ بلاؤ' بڑا گناہ ہے۔ عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم کہو۔ ورنہ لوگوں کے خیال میں یہ شرک اور کفر ہے۔ معاذ اللہ استغفر اللہ! قرآن میں اللہ خود ترغیب دے رہا ہے کہ میرے پیغمبر کو رؤف اور رحیم کہو۔ گویا اس کا وہ مطلب نہیں' بلکہ یہ ہے کہ صفات کے درجات ہیں۔ ایک صفت کائناتی سٹیج کی ہے۔ وہاں اللہ رؤف و رحیم ہے۔ وہ کائنات کی ہر چیز شجر و حجر' درختوں' پرندوں' چرندوں کے لیے رؤف الرحیم ہے۔ اسی طرح رسول اکرمؐ اپنی حدود کے اندر رؤف والرحیم ہیں۔ خدا اپنے لیے کہتا ہے' الحمد للہ رب العالمین' رسولؐ کے لیے ہے' وما ارسلنک الا

رحمتہ للعالمین جہاں جہاں رب العالمین ہے وہاں وہاں رحمت للعالمین ہیں۔

قرآن سے تو دور جانا ہی نہیں۔ آپ حدیث کو بھی نہ جائیں۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ خدا کوئی مغالطہ پیدا کر رہا ہے؟ ایسا بھی نہیں ہے۔ خدا اپنے اختیارات بانٹتا نہیں ہے مگر جب اللہ کسی کو دینا چاہے تو کسی کو کس پر اعتراض ہوگا؟ میں اپنے آقا سے اس لیے جلوں۔ رسول اللہ کی اس لیے کسر شان کروں کہ اللہ نے سب کچھ انہیں دے دیا ہے؟ حضورؐ سے کوئی جلتے تو پیغمبر جلتے۔ میرا تو یہ حق ہی نہیں بنتا مگر جب چوتھے، پانچویں یا چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ سے حضورؐ کی ملاقات ہوئی تو موسیٰ سے پوچھا' کیا ہوا؟ کیا میرے آنے سے آپ کو کوئی زحمت ہوئی؟ فرمایا نہیں، میں اللہ سے گلہ گزار ہوں کہ یہ ابھی نوجوان لڑکا سا ہے اور اس کی امتؐ کے لوگ میری امت سے زیادہ جنت میں جائیں گے۔

دیکھئے حضرت موسیٰ نے ذاتی حسد کا اظہار نہیں کیا۔ دونوں پیغمبر حریص خیر امت تھے مگر حریص کا لفظ صرف رسول اللہؐ کے لیے استعمال ہوا۔ منفی لفظ ہے۔ محبت رسولؐ اجاگر کرنے کے لیے پوری عربی زبان عاجز ہوگئی۔ اتنا زیادہ انس رسول کو اپنی امت سے ہے کہ کسی مثبت لفظ سے وہ ادا نہیں ہو سکا۔ اسے حریص کے منفی لفظ سے پورا کیا گیا۔

لاہور والے جب کسی کو بہت اچھا پائیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو نرا قتل ہے۔ دراصل وہ اس کے حُسنِ کمال کی داد دے رہے ہوتے ہیں۔ وہی جملہ اللہ میاں نے اس سے بہت پہلے استعمال کیا اگر اس کی خوبی کی بات کروں کہ وہ بہت اچھا ہے، تو پھر تم نہیں سمجھ سکتے۔ اب تمہیں یہ کیسے کہوں کہ یہ نبی اپنی امت کی رہائی' اس کی تسکین اور اس کی بخشش کے لیے کتنا حریص ہے' تو پھر ہمیں جلدی سمجھ آ گئی کہ ایسا اور کوئی پیغمبر نہیں ہے جو رسول اللہ کی طرح اپنی امت کی اتنی فکر کرنے والا ہو۔

حضورؐ نے ایک خواب سنا۔ فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں' لوگ آگ کے گڑھوں کے گرد کھڑے ہیں۔ اس میں گرنے کے لیے بے چین ہیں اور میں انہیں کمرے سے کھینچ کھینچ کر پیچھے کر رہا ہوں۔ نبی کو آپ لوگوں کے لیے بڑی مشقت اور مزدوری کرنی پڑ رہی ہے۔ میرا خیال ہے' آپ تو گرنے کی کوشش میں بے چین ہیں۔ اللہ کرے' انہی کی کوشش بخشش اور رحمت و مغفرت ہمارے کام آ جائے۔

مذہبی جماعت کی تشکیل

میں بڑا خوفزدہ رہتا ہوں کہ کوئی جماعت بنے یا بنائیں یا میں اس میں شریک ہوں۔ قرآن کی آیت ہے ان الذین فرقوا دینھم و کانو شیعا لست منھم فی شیاً جن لوگوں نے اپنے اپنے دین میں فرق کیا اور گروہ بن گئے، اے پیغمبر! تُو اِن میں سے نہیں ہے۔ میں بنیادی طور پر بڑا خوفزدہ ہوتا ہوں اور آپ نے بھی جماعت کا نام لے کر مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔ پروردگار مجھے یہ شوق نہ بخشے کہ میں ایک جماعت بناؤں۔ مجھے اس کا امیر بننے کا شوق ہو اور میں اسے بہترین گروہ کہوں یا میں اپنے آپ کو اِصلاح کے کاموں کے لیے چنوں۔

جو میں کر رہا ہوں، وہ لوگوں کے لیے سوچنے سمجھنے کی راہیں کشادہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ میرے خیال میں گروہی جماعتوں نے سوچنے کے راستے بند کر دیئے ہیں۔ یہ کمپیوٹر لاک ہو گئے ہیں۔ انفارمیشن کلوز ہو گئی ہے۔ جب میں کسی مذہبی آدمی سے گفتگو کرتا ہوں تو مجھے اس کے کمپیوٹر کی سلیٹ پر لکھا ہوا ملتا ہے Exit denied بار بار آتا ہے Exit denied اور اس کی کون مجھے آج تک نہیں ملی کہ یہ Exit کا Denial میں کیسے توڑ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ میں بار بار اس پر خیال وفکر کی بمباری کروں۔

تنظیم سازی کی ضرورت

ہم سب کی اس معاشرے اور ملک کے حوالے سے کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ مجھے کوئی ملک عزیز نہیں ہے اور یہ ملک بھی اس لیے عزیز نہیں ہے کہ میں یہاں پیدا ہوا بلکہ اس لیے کہ خدا نے مجھے یہ ملک آزادی سے خدا کے احکامات بجالانے کے لیے دیا ہے۔ ہم سب کو کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی مثال قائم کرنی ہے۔

مثال کے طور پر میں اپنے ایک اچھے دوست کے پاس تھانے میں گیا تو وہاں مجھے ایک بزرگ نے کہا کہ میں ذکر کے لیے تسبیح چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا، آپ کیوں چاہتے ہیں؟ اللہ کی طرف جانے میں آپ کو بہت محنت کرنی پڑے گی۔ یہ عملی طرز فکر ہے۔ اس نے مجھے بڑی عجیب سی بات کہی، کہا کہ فلاں صاحب آپ کے دوست اور شاگرد نہیں ہیں؟ میں نے پوچھا، آپ

نے کیا ان میں ایسی بات دیکھی ہے کہ آپ بھی یہ کرنا چاہیں؟ کہنے لگے کہ پیسے تو وہ ہمارے جتنے لیتے ہیں۔ اتنا حرام کھانے کے باوجود ہمارے چہروں پر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ مجھے حیرت ہے' اس کے پاس کوئی پیسہ نہ ہوتا' اس کے باوجود وہ ہنس کھیل رہا ہوتا ہے۔

پہلے' ہمارے پاس مثال کوئی نہیں تھی۔ اب چونکہ مثال ہے' اس لیے اب ہم پردہ اٹھا سکتے ہیں۔ کوئی شخص بھی نیک نیتی سے خدا کے رستے پر چلتا ہے اور اپنی اصلاح کرتا ہے' تو اس میں کوئی نہ کوئی اثر ضرور ہوتا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کی اصلاح کا باعث بنتا ہے۔ اس لحاظ سے کئی لوگوں کے میں نے کرشمات دیکھے ہیں۔

جہاں تک تنظیم سازی کا تعلق ہے میں اس کو سخت ناپسند کرتا ہوں کیونکہ تنظیم سازی نے ہی مذہب کو اکیڈیمک اور فنڈامنٹلسٹ میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تنظیم سازی تھی' جس کی وجہ سے لوگ مذہب کی داخلی فطرت کو بالکل بھول گئے بلکہ ہمارا حال وہی ہے جو یہود کے فلسطین کا تھا۔ جب حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے۔ وہ اتنے مذہبی' نیکوکار اور پرہیزگار تھے کہ جس کا کوئی حساب نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کو یہ کہنا پڑا کہ اس طوائف کو پہلا پتھر وہ مارے' جس نے خود یہ کام کیا ہو اور کوئی فرد واحد آگے نہ بڑھا۔

ہمیں بہت ساری باطنی اصلاح چاہیے۔ اصلاح کا جذبہ خطرناک ہے۔ کوئی فرد اس انقلاب کو نہیں روک سکتا' جس کا وقت آ چکا ہے۔ یہ ایک اصول ہے مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ برصغیر میں ہر شخص اس انقلاب کو اس وقت کے بغیر لانے کے لیے کوشاں ہے اور یہ شیزوفرینیا کی ابتداء ہے۔ بہت سارے بندے میں نے اس مرض کا شکار دیکھے ہیں۔

پچھلے برس سیشن میں ایک خاتون محترم نے یہ رائے دی تھی کہ ہم اپنے کام کو منظم کریں' تو اس سے ہم لوگوں کی زیادہ توسیع ہوگی۔ میں نے کہا' نہیں۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو ہم قدرتی انداز میں پیش رفت کریں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قدرتی انداز میں بڑھ رہے ہیں۔ میری بڑھوتری اور توسیع کی خواہش اور ارادے کے بغیر آپ بڑھ رہے ہیں۔

انقلاب بغیر رضامندیٔ خدا

ایک تو ہم ویسے لاعلم ہیں اور دوسرا اس لاعلمی پر ہمیں مصر رکھنے والا ایک معاشرتی نظام

ہے، جو ہمیں متعین رکھتا ہے۔ خداوند کریم نے ارشاد فرمایا ہوا ہے کہ جب ہم کسی قوم کو ذلیل و رسوا اور خوار کرنا چاہتے ہیں تو اس کے امرا کو بدفعلی اور بدکاری پر مائل کر دیتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی اور اکیڈیمک تاثر ہے کہ وقت کے ساتھ جو میں نے سماجی سیٹ اپ میں دیکھا ہے کہ خدا، سچائی اور علم کے لیے خواہش بیدار ہو رہی ہے۔

البتہ بہت سارے وہ لوگ، جو انقلاب کے داعی ہیں، انقلاب لانا چاہتے ہیں، وہ انقلاب مدینہ سے لانا چاہتے ہیں، مکہ سے نہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم فوری طور پر فتوحات کے زمانے میں داخل ہو جائیں۔ بغیر اپنی تربیت کیے، جانے بوجھے، جانچ پرکھ اور بغیر ذات کی اصلاح کیے۔ ہم سب محقق اور نقاد ہیں۔ شاید جب تک ہم ان تیرہ برسوں سے نہ گزریں، جس میں پروردگار کا رسولؐ اور اس کے اصحاب گزرے۔ جب تک ہم بھی اذیت ذہن کرب و بلا کے اس دور سے نہ گزریں جس سے بلال اور صہیب گزرے، میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی انسان اخلاقیات کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے قابل ہو جائے گا۔

ایک بڑے مشہور مفکر نے یہ بات کہی کہ کوئی آدمی اس انقلاب کا رستہ نہیں روک سکتا، جس کا وقت آ چکا ہو۔ ہمارے بڑے بڑے ناصحین اور انقلاب کے لیڈر اس قانون کو صحیح نہیں سمجھتے۔ مگر ہم لوگ چاہتے ہیں کہ وقت آئے نہ آئے، ہم ضرور انقلاب لائیں۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ہر مذہبی جماعت بری طرح ناکام ہوگئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی اللہ پر تھوپ رہے ہیں۔ اس کے لیے وقت موجود ہے نہ خدا کی مرضی دستیاب ہے۔ کوئی بھی اتنی کوشش نہیں کرتا کہ پہلے تھوڑا سا انتظار اور جاننے کی کوشش کر لے کہ خدا کی مرضی کیا ہے؟ وہ مجھے چاہتا بھی ہے کہ نہیں؟ کیا میں وہ فرد ہوں، جو کسی کی قیادت کر سکتا ہے؟ کیا میں وہ منتخب کردہ ہوں؟

یہ برصغیر ہے۔ ہماری سرزمین میں سزوفرینیا بڑی تیزی سے پیدا ہوتا ہے اور بڑی جلدی رخصت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہر رہنما جو آتا ہے، وہ طاقت اور انقلاب کے تصور میں ڈوبا ہوتا ہے۔ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی ہو۔ ان چالیس پچاس برسوں میں بہت سارے آفتاب آئے۔ اترے اور جل کے رخصت ہو گئے۔ انقلاب نہیں آ سکا۔ انقلاب کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے، جب خیال کی انارکی میں انسانی شعور کسی اصول کی طلب کرے۔ اس وقت ہماری جس بقا خطرے میں ہے۔ ہم سالمیت کے اصول کی تلاش میں ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہم اپنی ترجیح کی طرف رجوع کر

رہے ہیں اور یقین ہے کہ ہماری منزل قریب ہے۔

مذہب کا استحصال

اتنی قابلیت ہونے کے باوجود ہمارے ملک میں ممکنہ حد تک مذہب کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ہر مذہبی آدمی خبطی ہے۔ اسے طبعی طور پر مالیخولیا ہو گیا ہے۔ وہ پاگل بن گیا ہے۔ وہ توجہات اپنی ذات کے لیے مرتکب کرتا ہے۔ جو اٹھتا ہے' جماعت بنانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ ہر کوئی امیر المملکت اور امیر المسلمین کے خواب دیکھنے لگ جاتا ہے۔ یہ کیسا احساس ہے؟

تبلیغیوں کو دیکھ لیں' وہ کیوں کعبہ کے مقابلے میں ایک نیا کعبہ تشکیل دے رہے ہیں؟ ان کا کیا مقصد ہے؟ اب ایک شخص کہتا ہے کہ چلو کعبہ نہیں جا سکا' رائے ونڈ ہی ہو آئیں۔ یہ کس قسم کا جملہ ہے کہ کعبہ کے بعد دنیا کے مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع رائے ونڈ ہوتا ہے۔ کیا وہ کعبہ کے مقابلے میں ایک نیا شہر بسانے کی تگ و دو میں ہیں؟ یہ کیسا شماریاتی جملہ ہے کہ بیس لاکھ مسلمانوں نے رائے ونڈ جا کر دعا مانگی ہے۔ وہ دعا کہاں چلی گئی کہ فاسق ترین لوگ حکمران بن رہے ہیں؟ بے ایمانی حد حساب سے بھی گزر گئی ہے۔ تین سو تیرہ لوگوں کی دعا عرش پر جا پہنچتی ہے اور یہاں 20 لاکھ لوگوں کی اجتماعی دعا پاکستان کے لیے کچھ نہیں کر سکی۔ برصغیر پاک و ہند کا اجماع یعنی اکثریت ہمیشہ صحیح فیصلہ کرتی رہی ہے اور اجماع کے کئی فیصلے ہمارے پیش نظر ہیں۔

پاکستان کی تخلیق کے وقت اجماع نے پاکستان کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ تمام دینی جماعتوں کے بڑے بڑے زعما اس کے خلاف تھے۔ ایک عام مسلمان جو فکر و اعمال کی وجہ سے اتنا بلند بھی نہیں ہے وہ تو ایک عام مسئلے پر صحیح فیصلہ کرتا ہے' مگر شیخ العرب والعجم یا شیخ الحدیث اس کے برعکس غلط فیصلہ کرتا ہے۔

جیسے جماعت اسلامی والے بنے بنائے اور گھڑے گھڑائے ذہن ہیں۔ میں اپنے مزاج کے مطابق عمومی لوگوں میں نہیں رہ سکتا' اگر میرا مزاج کڑا یا تنقیدی ہے۔ میرے ذہن پر اصلاح کا خناس حاوی ہے۔ میں عظمت کے خوابوں میں کھویا ہوا ہوں۔ میرے اندر انقلاب' خونی انقلاب کی ایک ناجائز حس جنم لے چکی ہے۔ بیماری پیدا ہو گئی ہے' تو میں ایسی جماعت چنوں گا' جو میرے مقصد کو سوٹ کرتی ہو۔ جماعت اسلامی میں آپ اول و آخر کسی آدمی میں اختراع پسندی

(Ingenuity) نہیں پائیں گے۔ وہ سارے ایک جیسے ہیں۔ وجہ یہ نہیں کہ مذہب انہیں ایسا بنا دیتا ہے' بلکہ انہوں نے ہمیشہ کوشش ہی اسی قسم کی کی ہے۔

تبلیغی جماعت والوں میں آپ کو کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ ان کی درویشانہ اپروچ اور مسکینوں جیسی طبع کو میں اینٹی اسلام سمجھتا ہوں۔ میرے ذہن میں فوری یہ تصور جنم لیتا ہے کہ اگر اسلام کی انہی لوگوں نے تبلیغ کرنی ہے تو میں قیامت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جس قسم کے روّیے کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں' وہ ہرگز خوش اخلاقی نہیں ہے۔ کیا آپ اسے خوش اخلاقی سمجھتے ہیں؟ بلکہ یہ ایک بیماری اور لاغر پن ہے۔ میں تو انہیں دیکھ کر Depressed سا ہو جاتا ہوں۔ ان کے پاس اندازِ گفتگو ہی نہیں کیونکہ دین کی بات کی ترسیل کے لیے آپ کی علمیت بے شمار ہونی چاہیے۔ وجادلھم بالتی ھی احسن اور بحث کرو مگر بحث کا طریقہ اتنا خوبصورت ہونا چاہیے کہ دوسرے پر اثر انداز ہو۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ وہ تو مسجد میں دو چار چلوں کی بات کرتے ہیں اور چلوں سے تو عقل نہیں بڑھتی۔ اس سے دو صفحوں کی معلومات میں اضافہ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اسلام میں اس طریقہ کار اور تبلیغ کے اس طریقے کا وجود نہیں ہے۔

میں کوئی حتمی رائے دینے یا ٹھونسنے کی کوشش نہیں کر رہا لیکن جس قسم کا وہ رویہ رکھتے ہیں' اوّل تو اس قسم کا تبلیغی ڈھانچہ یا چار ماہی چلوں کا نظام اسلام میں کوئی معانی نہیں رکھتا نہ وہ کبھی جگہ بنا سکے گا۔ یہ زیارت کی پرانی تاریخ ہے جو انگلستان میں بھی چلتی رہی ہے اور بعض دوسری جگہوں پر بھی۔ یہ طریقہ Hypnosis (تنویر) کو آگے لاتا ہے جو مذہب میں ایک نام نہاد اور جعلی طریقہ ہے۔ حشیشین کا بھی یہی وطیرہ تھا اور ابھی بھی تمام انتہا پسند مذہبی جماعتوں کا یہی طریقہ کار ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میں رائے ونڈ جا کر دعا بھی مانگوں تو میری سزا میں کوئی کمی ہو جائے گی۔ یہ اجتماعی دعا کی بات کرتے ہیں۔ آج تک اجتماعی دعا کس کی قبول ہوئی ہے؟ جبکہ آپ میں صاحب دعا ہی موجود نہیں ہے۔

مجھے تبلیغ والوں سے قطعی عداوت نہیں ہے۔ ذہنی و فکری طور پر میں انہیں قبول کرتا ہوں۔ مقصد اسلام تو صرف اللہ ہے۔ تم میں کون یہ اعلان کرتا ہے کہ میں اللہ کا شناسا ہوں؟ جماعت اسلامی میں کوئی ایسا شخص ہے' جس کا یہ نعرہ ہو کہ میں خدا شناس ہوں؟ کسی بھی فرقے اور تنظیم میں اللہ کے تصور کا ادراک ہی نہیں ہے۔ وہ کس طرح اسلام کی خیر مانگ سکتے ہیں۔ ان کے ہاں صرف اللہ

ہی غائب ہے' باقی سب کچھ حاضر ہے۔ خدا ان کے درمیان کسی قسم کا نشان اور وجود نہیں رکھتا۔

یہی میرا ان سے بنیادی اختلاف ہے۔ پندرہ کروڑ عوام میں سے ڈیڑھ کروڑ یہ لے جائیں۔ ساڑھے تیرہ کروڑ مفلوک الحال عوام' جو کاروانِ حیات میں تماشا بنے ہوئے ہیں' وہ بھی اللہ اور رسولؐ کے بندے ہیں۔ انہیں پگڑیاں نہیں تبدیل کر سکتیں۔ دو ہزار کا جمگھٹا ادھر لگا ہے۔ پانچ ہزار کا لشکر ادھر بیٹھا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جیسے اکرم اعوان اعلان کرتے ہیں' پانچ لاکھ ادھر ہیں اور باقی پانچ کروڑ پیچھے بیٹھے ہیں۔ اتنے عظیم مذہب کے پیروکار اتنا بڑا سفید جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ نہ ادھر پانچ لاکھ تھے نہ ادھر پانچ کروڑ کا جم غفیر تھا۔ مذہب کے بڑے سٹار اتنے غیر مصدقہ بیانات دیں تو نچلے لوگوں میں جھوٹ و کذب بیانی کا حساب کیا ہوگا؟ اگر اپروچ بھی ناقص ہو اور پہنچ بھی نہ ہو' تو ہم ان مسلمان رہنماؤں اور لوگوں کے ساتھ کیا کریں گے؟

میں کیوں کسی کی پیروی کروں یا اسرار کے پیچھے چلوں؟ میں ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ ان کے دعویٰ کو ہرگز رد نہیں کرتا لیکن مجھے یہ ثابت کر کے دکھائیں کہ یہ نبی کریمؐ کا اسوۂ حسنہ تھا۔ یہ ہمارا نصاب ہے اور ہم نبیؐ کے نصاب کے عین مطابق ہیں۔ اصولی طور پر اگر تبلیغ والے یہ کہتے ہیں کہ یہ محمد رسول اللہؐ کا نہج تھا' تو پھر انہیں ثابت کر کے دکھانا ہوگا کہ زمانۂ نبوت میں اس قسم کے بستر اٹھتے رہے ہیں۔ زمانۂ نبوت میں حضور اکرمؐ عالی مرتبت نے حفاظ کرام گروہ کی شکل میں نہیں' بلکہ ایک ایک کر کے بھیجے ہیں۔ اگر گروہ کی شکل میں بھیجے بھی ہیں تو ان کے نتائج اتنے غلط نکلے کہ ایک جگہ پورے اسّی حفاظ مارے گئے۔ اس پر نبی کریمؐ نے منع فرما دیا۔ مدینہ منورہ میں لوگ آتے تھے۔ وہ ایک علمی و دینی اکیڈمی تھی۔ بہت سارے صحابہ کرامؓ کے جانی نقصان ہونے پر نبی کریم کو گہرا رنج ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قنوتِ نازلہ کا نزول ہوا۔ خداوند کریم نے بہت بڑے نقصان کے ذریعے ہمیشہ کے لیے اس طریقے سے باز رکھنے کا حکم بھی دیا۔ یہ خدا کا انتخاب ہے کہ کس نے اللہ کی طرف آنا ہے' کس نے نہیں۔ آپ کو انتظار کرنا چاہیے کہ لوگ آپ کے بارے میں جان جائیں' پھر درِ مصطفیٰؐ پر آئیں۔ وہاں آ کر علم سیکھیں۔ واپس جائیں اور باقی قوم کی رہنمائی کریں۔ ایک ایسا واقعہ' جس کے بعد کیا تبدیلی آئی' ہم دیکھتے ہی نہیں۔ اس حادثے کے بعد یہ نظام ہی

ترک کر دیا گیا۔ تب آنحضرتؐ کے زمانے میں حفاظتی انتظامات کیے گئے۔ لوگ مدینہ میں آتے تھے۔ سبق لیتے' تربیت حاصل کرتے اور بعدازاں چلے جاتے۔

ایک ہی قبیلے کے لوگ آتے' سیکھتے' واپس جاتے اور جا کر تعلیم دیتے۔ اس طرح کبھی نہیں ہوا کہ امریکہ جائیں اور وہاں تبلیغ کریں۔ کیوں جائیں؟ کیا وہاں کی زبان آتی ہے؟ کلچر سے متعارف ہیں؟ وہاں کے انداز و ادا کا علم ہے؟ آپ وہاں پر طعن و تشنیع کا سبب بن جاتے ہیں۔ وہ آپ سے متاثر بھی نہیں ہوتے۔ آپ دنیا کو تماشا لگتے ہیں۔ ان کے کلچر اور تہذیب کے سامنے آپ اس بات پر ناز کر رہے ہیں کہ ہم نے پانچ ہزار مسلمان بنا لیے ہیں۔ ٹھیک ہے' لیکن ہندو راج نیش پانچ لاکھ ہندو بنا کر گیا ہے۔ حال ہی میں وہاں ایک بڈھسٹ گیا۔ اس نے امریکہ میں دس لاکھ انسان اپنے ساتھ ملا لیے۔

وہ ایک ایسی ہی تھڑی' بنجر اور ویران قوم ہے کہ کوئی بھی انہیں جوش و جذبے دے کر اور چمتکار سے اپنے ساتھ ملا سکتا ہے۔ وہاں پر ہندو برادری میں سے کوئی جادوگر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا سحر لوگوں کو حیرت زدہ کرنے لگا۔ اس نے وہاں پر تین لاکھ آدمیوں کی جماعت بنالی۔ یہ کوئی کریڈٹ نہیں ہے کہ ہم نے پانچ ہزار مسلمان کر لیے ہیں یا جاپان میں تبلیغ سے دو ہزار مسلمان کیے ہیں۔ اگر یہ حقانیت کا ثبوت ہے کہ تم نے پانچ ہزار مسلمان کیے ہیں' تو پھر اس ہندو جوتشی کو داد دیں' جس نے پانچ لاکھ ہندو بنا لیے۔

میں کہتا ہوں' بیس لاکھ تبلیغی پاکستان میں موجود ہیں۔ مجھے تو کسی قسم کی پاکستان میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔ کوئی واضح فرق نظر نہیں آتا۔ بدقسمتی سے لوگوں کے اندر قلوب کی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ تو عیسائیت کی طرح ایک فلسفہ تلافی ہے' یعنی نجات کا فلسفہ۔ ہم میں سے جو جتنا بڑا مجرم اور گنہگار ہوتا ہے' وہ اس میدان میں اپنا جرم دھونے جاتا ہے یا تبلیغ کے ذریعے اپنا جرم دھونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تو ازالے کا فلسفہ ہے۔

میں مصر ہوں کہ تبدیلی کیوں نہیں آتی؟ میں کسی چیز کا دعویٰ نہیں کرتا' لیکن میرے شاگردوں میں سے کوئی اگر ایسی چیز موجود ہو تو وہ تبدیلی لے آئے گا جہاں کہیں میرے احباب موجود ہیں' ان میں احساس ذمہ داری اور جواب دہی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ جہاں جاتے ہیں' کار خیر کرتے ہیں۔ میں ان کی برائیاں نہیں دیکھتا۔ وہ اکمل اور کامل نہیں ہیں۔ وہ میری طرح

ہیں۔اتنے کمزور کہ جیسے تھے یا جتنے تھے، لیکن ان میں کچھ کرنے کا احساس ذمہ داری ضرور موجود ہے۔وہ جہاں جاتے ہیں، خوش اسلوبی سے کام کرتے ہیں، تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔

"یہ تبلیغی کہاں جاتے ہیں؟ غرقابی دریاء آفات تو نہیں ہو جاتے؟ یہ کدھر جاتے ہیں؟ مجھے بتائیں کہ وہ کہاں ہیں؟ وہ اپنے علاقوں میں محسوس کیسے جانے چاہئیں۔تبلیغ کا اصول سب سے سنہری ہے۔حضور عالی مرتبتؐ کے آغاز سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس معاشرے میں وہ امین و صادق کے لقب سے موسوم ہیں، وہاں جا کر تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔بلکہ پہلے استفسار کرتے ہیں کہ آپ کو مجھ پر اعتبار ہے کہ نہیں؟ کیا میں امین ہوں کہ نہیں؟ صادق ہوں یا نہیں؟ میرے پاس سال بعد کوئی آدمی تبلیغ کرنے آجائے، تو مجھے قطعی طور پر علم نہیں ہے کہ وہ چور ہے، نیک یا بد ہے؟ بزرگ ہے یا عابد ہے؟ میں جس آدمی کی خبر ہی نہیں رکھتا، کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ میں اس پر کیسے اعتبار کرلوں؟ تبلیغ کے لیے ایک علاقہ طے کیا جاتا ہے۔

میں یہاں ایک جگہ بیٹھا ہوا ہوں۔لوگ میرے پاس آتے ہیں۔انہیں پہلے پوچھنا پڑتا ہے کہ پروفیسر صاحب آپ سے کتنا فراڈ کرتے ہیں؟ انہوں نے کس کس کے ساتھ زیادتی کی ہے؟ نقاد آئیں گے۔لوگوں سے بار بار پوچھیں گے۔میرے ماننے والے دس آتے ہیں تو نہ ماننے والے بیس آتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔وہ ہر لحظہ مطالعہ اور مشاہدہ کے عادی ہوتے ہیں۔میں یہاں الیکشن لڑا ہوں تو اخبار والوں نے مجھ پر ایک پورا ضمیمہ لکھ ڈالا۔یہ جماعت اسلامی کا اخبار تھا۔اس نے لکھا کہ پروفیسر صاحب کو نااہلی کی وجہ سے لاہور سے نکال دیا گیا لیکن میں ایسی چیزوں کی ہرگز پروا نہیں کرتا۔اگر لوگ مجھ پر یقین کرتے ہیں۔اظہار رائے کی آزادی رکھتے ہیں، تو وہ ہمیں منتخب بھی کر سکتے ہیں۔

اگر آپ کے پاس کسی شہر کا مسافر آئے اور پوچھے کہ مجھے پروفیسر صاحب کے پاس جانا ہے۔چار معززین کا تو مجھے علم نہیں، جو میرے خلاف ہیں لیکن آپ یہ ضرور دیکھیں گے کہ ایک سادہ لوح آدمی کے دل میں میرے لیے کیا تصور ہے۔وہ اس کو ساتھ لیتے ہیں۔میرے گھر لے کر آتے ہیں۔خاطر داری کے لیے بھی کہتے ہیں۔یہ وقار، یہ تعظیم باہر نکل کر نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔یہ ان کا اپنے دلوں میں پیدا کردہ مقام ہے۔ان کے اپنے مشاہدوں پر مبنی ہے۔میرا اندرونی باطن تو ان تک نہیں پہنچ رہا ہوتا۔میری سوچ بھی ان تک نہیں پہنچ پاتی۔وہ سادہ لوح لوگ ہیں

لیکن ان تک میری سوچ کا عمل پہنچتا ہے۔

اللہ کے لیے میں ان کی سڑکیں یا گلیاں تعمیر کروا دیتا ہوں۔ پچاس ساٹھ فی سبیل اللہ پانی کے نلکے لگوا دیئے ہیں۔ یہ میری ذاتی جیب سے نہیں نکلے بلکہ یہ رقم میں نے اکٹھی کی ہے۔ لوگ باخبر ہیں کہ وہ سب کچھ ہماری فلاح و بہبود کے لیے سرانجام دے رہا ہے۔ یہ ایسا کام ہے جس کی سیاست میں بھی اشد ضرورت ہے۔ میں نے تو صرف تھوڑا سا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا ہے۔لوگ چار چار گھنٹے میری باتوں کو کیوں انہماک سے سنتے ہیں؟

یہی وجہ ہے۔ میں جو کہتا ہوں' اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ اگر میں حب الٰہی کی بات کرتا ہوں تو میرا اس پر کامل یقین ہے۔ اگر میں رحمت خداوندی کا ذکر کرتا ہوں تو میرا اس پر کامل یقین ہے۔ اگر گناہوں کی بات کرتا ہوں تو اس پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ میں اپنی خطا پر یقین رکھتا ہوں۔ یہ میرا ایک حصہ ہے۔ یہ میرے کمپیوٹر کا ایک حصہ ہے۔ اگر وہ خطا کرتا ہے تو میں کس طرح غافل ہو سکتا ہوں۔کوشش تو میں بھی یہی کرتا ہوں کہ نہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں اپنی قوتِ ارادی اور مرضی سے اس سے اجتناب کرنے کی ہر تگ و دو کروں گا۔مگر مجھے علم ہے کہ اپنے بہترین علم و ذہن کے ہوتے ہوئے بھی میں غلطی کر سکتا ہوں' لیکن یہ ہمارے بزرگ وہ ہیں جو کبھی غلطی نہیں کرتے۔ یہ غلطی سے ماورا بنتے ہیں۔

انسانی جبلت کسی استعداد کی تکمیل کا نام ہے کیونکہ انسان کی ایک مستقل عادت یہ ہے کہ وہ اپنی کسی عادت سے جان نہیں چھڑاتا جیسے میں پچھلے پچاس سالوں سے سگریٹ نوشی کر رہا ہوں۔ بہت سارے لوگ مجھ سے استفسار کرتے ہیں کہ تم اس سے کیوں نہیں بچتے؟ تمہاری قوت ارادہ اور ارادہ دونوں مضبوط ہیں۔ آپ خدا کے راستے کی طرف گامزن ہیں یعنی صراط مستقیم کی طرف۔آپ میں اتنا حوصلہ ہونا چاہیے کہ آپ اسے ترک کر سکیں۔

ہاں مجھ میں اتنی ہمت و حوصلہ ہے کہ میں اسے چھوڑ سکوں۔ اس لیے نہیں کہ میرے پاس قوت ارادی موجود ہے۔ میرے ہاں قوت ارادی نہیں ہے۔ جب سے لاحول ولا قوۃ کا ذکر شروع کیا ہے' اس کے بعد میری قوت ارادی نہیں رہی۔ میں تو صبح و شام یہ کہتا ہوں کہ نہ میرے پاس قوت ہے نہ ہی ارادہ ہے۔ جو کچھ ہے' میرے اللہ کریم کا ہے۔ پھر میں اپنی قوت ارادی اور پُرعزم ارادوں کا کیسے دعویٰ کر سکتا ہوں۔ سگریٹ نوشی صرف میری جبلت اور عادت ہے۔ مسئلہ یہ

ہے کہ میں اس عادت کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو اپنی اس عادت سے ہمدردی کر رہا ہوں۔ اب مجھے خوف وخطرات نے بھی آن گھیرا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے۔ خوف کینسر کا ہے' گلے کی خرابی کا ہے۔ میں پچھلی دفعہ شفا انٹرنیشنل گیا تو میں نے گلے کے بارے میں معلوم کیا کہ بیماری سنجیدہ تو نہیں ہے۔ وہ خوف ختم ہوا تو میں اپنی عادت پر آ گیا۔

تشخیص کے ساتھ علاج

جب بھی میری زندگی میں کوئی فرد آیا تو جو کچھ میں جانتا تھا' وہ ضرور اس تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جس طریقہ سے تھوڑی بہت اپنی اصلاح کر سکا' وہی طریقہ میں نے اس کو بتایا ہے۔ اکیڈیمک سے تو کسی مسلمان کو انحراف نہیں ہے۔ اس مقام پر اتنے بڑے عالم موجود ہیں کہ غالباً ہمیں کسی تازہ اکیڈیمک ورشن کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر بدقسمتی سے وہ اکیڈیمک کہیں استعمال نہیں ہو رہے۔ ہم ذاتی زندگی اور انداز فکر میں مصلح ضرور ہیں مگر اپنے ماحول اور پیش منظر میں ہمیں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔ ہر دفعہ یہ خبر اخبار میں پڑھنے کو ملتی ہے کہ رائے ونڈ میں اس سال بیس لاکھ فرزندانِ توحید حاضر تھے۔ اگلے سال پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعداد پچیس لاکھ ہو گئی ہے۔ یہی حال رہا تو شاید اگلے چند سالوں میں ان کی تعداد پچاس لاکھ تک پہنچ جائے لیکن جس جگہ ایک بھی شریف آدمی موجود ہو' وہاں شمع سے شمع ضرور جلتی ہے۔

اکو کوک فرید دی سُنجے کر گئی تھل

مگر یہ عجیب سی بات ہے کہ 25 لاکھ فرزندانِ توحید جب رائے ونڈ سے نکلتے ہیں تو اس کے بعد ان کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ کہاں جاتے ہیں اور ملک مزید ذلت' ادبار' رشوت ستانی و خرابی کو بڑھ جاتا ہے۔ شاید کوئی نقص ایسا ہے جو ان فرزندانِ توحید میں جاری ہو۔

میں ممکنہ حد تک اس نقص کی نشاندہی بھی کرتا ہوں اور ممکنہ حد تک اس کے حل کی کوئی صورت بھی پیش کرتا ہوں۔ ہم تقویٰ اور تزکیہ کے بہت اعلیٰ معیار سے شروع کرتے ہیں۔ خدا کو اعلیٰ ترین ترجیح دیتے ہوئے ہم اپنے ظاہر و باطن میں سے کچھ نہ کچھ' کوئی نہ کوئی شے سنوارنے کی کوشش ضرور کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس مقصد میں کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہوں گے۔

ہمارا یہ دوسرا اجتماع ہے۔ یہ اجتماع بھی مذہبی سیشن نہیں ہے۔ بلکہ عید کے بعد ہم ملا کرتے ہیں۔ اس مرتبہ ہم اتنے سارے اکٹھے ہو کر چل رہے ہیں۔ اس کا مقصد جماعت بنانا یا کوئی تنظیم کھڑی کرنا نہیں ہے' البتہ جائزے کا ضرور ہے۔ ہم اپنی ذہنی و اخلاقی اور ظاہر و باطن کی جدوجہد میں کوشش کرتے ہیں کہ توازن حاصل کریں۔ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ بہت سے علم حاصل کریں' کم تر تک پہنچائیں تا کہ اللہ ہمیں یہ توفیق بخشے کہ آیندہ آنے والے وقتوں میں ہم اپنی نسلوں کو بہتر سراغ علم اور بہتر آئیڈیل دے سکیں۔

اسلام میں تصوّف

اسلام میں تصوف کا وہی مقام ہے جو مسلم اور مومن کے مقامات ہیں۔ اگر آپ اللہ کے ارادے سے عبادات کریں گے تو آپ صوفی اور مومن ہیں اور اگر اللہ کے لیے اعمال شرح کا نفاذ نہیں کر رہے' تو آپ مسلم ہیں۔ حضرت سعدؓ حضور گرامی مرتبتؐ کے پاس کھڑے تھے۔ ایک اعرابی آیا' آپ نے اس کو کم مال دیا۔ حضرت سعدؓ نے کہا' یا رسول اللہ! یہ مومن ہے۔ فرمایا' بلکہ مسلم ہے۔ فرمایا' نہیں یا رسول اللہ! میرے خیال میں یہ مومن ہے۔ فرمایا' نہیں سعد! یہ مسلم ہے۔ جب تیسری مرتبہ کہا' تو حضورؐ نے فرمایا کہ سعد' تو مجھ سے اس بات پر جھگڑتا ہے' جو میں تجھ سے بہتر جانتا ہوں۔

صوفی ہم معنی مومن اور مسلم ایک ابتدا کرنے والا مسلمان ہے۔ دونوں میں فاصلہ صرف نیّات کا ہے کیونکہ انما الاعمال بنیّات صوفی کوئی انوکھی شے نہیں۔ عجیب وغریب ہستی اور معجزانہ وجود نہیں ہے۔ ایک ایسا صاف ستھرا انسان ہے' جس نے ترجیحات میں اللہ کو اولین ترجیح بنایا اور اسی کے لیے اپنی زندگی کی ترجیحات مرتب کیں جو مشقیں آپ دیکھتے ہیں' وہ صوفی کا حصہ نہیں ہیں' یہ آرڈر کا حصہ ہیں۔ صوفی غیر معمولی اس لیے ہوا کہ جب علم وادب کے رستے بند ہو گئے' تو صوفیا نے جسمانی مشقت شروع کر دی اور خیال کیا کہ شاید اس طریقے سے خدا ملتا ہو۔ ویسے آج تک جسمانی مشقت سے خدا ملا نہیں۔ اللہ میاں نے خود ہی پابندی لگادی کہ لا سرورة فی الاسلام لا رھبانیة فی الاسلام' اسلام میں رہبانیت ہے' نہ اسلام میں فاقہ ہے۔

Mystic or Mystique

لفظ Mysticism کی لفظی تعریف پر جائیں، تو آپ حیران ہوں گے کہ تمام ڈکشنریوں میں اس کا صرف ایک مطلب لکھا ہے کہ The relationship of individual to God۔ آپ نے جو اصطلاح استعمال کی ہے یہ Mystique ہے Mystic نہیں ہے۔ ہم ادب اور اعلیٰ ترین ادبیات میں دونوں لفظوں کو بالکل علیحدہ استعمال کرتے ہیں جہاں Mysticism کی تعریف فرد کا خدا کے ساتھ تعلق ہے، وہاں Mystique کی تعریف میں ذات اور خارج کے بارے میں پراسرار ہیولے تخلیق کرنا شامل ہے۔ جب دھوکہ ڈالا جائے تو Mystic کو Mystique سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف زبان دانی کی بات ہے۔ انگریزی زبان میں دونوں لفظ ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم نے کسی پر طنز کرنا ہو تو ہم کہتے ہیں You are a mystique مگر کسی کو داد دینے کے لیے Mystic کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

تصوف عربی لفظ ہے۔ میں لفظ صوفی کی مختصراً تعریف سیدنا ہجویریؒ کے قول سے کرتا ہوں۔ اس کے چار ذرائع ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اصحاب صفہ سے نکلا ہے۔ ان کے اندازِ زندگی کو اپنانے کا نام تصوف ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ لباس صوف سے نکلا ہے۔ درویش لوگ زیادہ تر غربت کا لباس یعنی اونٹ کے بالوں سے بنا لباس پہنتے تھے، اس لیے صوف ہو گیا مگر سیدنا ہجویریؒ نے لکھا کہ ہم صوفی اس کو سمجھتے ہیں جو صفائے قلب پر مشتمل ہو۔

تصوّف کی مزید وضاحت

(ڈاکٹر عبدالجلیل خان) ایک چیز Mysticism ہے، جس پر بڑی بحث ہوئی۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنے اور خدا کے درمیان رابطہ استوار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شطرنج کے مہروں کی تعداد شاید 16 ہوتی ہے اور ان کی چالیں اگر کمپیوٹر پر شمار کی جائیں، تو ایک بلین سے زیادہ بنتی ہیں لیکن نفس انسانی کے محرکات کی تعداد شاید نوے سے زیادہ ہے۔ اگر ان کی چالیں شمار کی جائیں تو وہ ٹریلین کو کراس کر جائیں، لیکن اگر ان میں سے کوئی مہرہ اکیلے حرکت کرے۔ جیسے نفرت اکیلے

حرکت کرے۔ تو آپ کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ کسی سے نفرت کر رہے ہیں لیکن اس وقت جو میں گفتگو کر رہا ہوں وہ میں جانتا ہوں کہ یہ گفتگو میں اللہ کے لیے کر رہا ہوں یا اپنی پروجیکشن کے لیے کر رہا ہوں۔ یہ ایک پیچیدہ حملہ ہے' جو میرے نفس نے مجھ پر کیا ہے۔ اب اگر میں اس کی پہچان کرلوں اور اپنے نفس کے تمام پیچیدہ واروں کو سمجھ جاؤں' جو وقتاً فوقتاً وہ مجھ پر کرتا رہتا ہے تو جیسے کسی صوفی نے کہا ہے کہ دو چیزوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ایک نبی کا مقام اور ایک نفس کے حملے۔ وہ شخص جو اپنے نفس کے پوشیدہ اور پیچیدہ واروں کو سمجھ جاتا ہے وہ اپنے جبلی تقاضوں سے آگے نکلتا ہے اور جب ایسا کرتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق استوار کرے۔ وہ شخص جو میری طرح بسیار خور ہو یا جسے لباس فاخرہ پہن کے اپنا قد بڑھانے کا شوق ہو' اس کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔

صوفی تو وہ ہے کہ وہ لباس فاخرہ یا پھٹا ہوا لباس پہنے' اس کے نفس میں تغیر نہ آئے۔ اگر مقام اس کو اپنی بزرگی کا احساس دلا دے تو وہ صوفی نہیں ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایک دفعہ ایک محفل میں بیٹھے تھے کہ کسی نے آکے خبر دی یا شیخ! آپ کا بحری جہازوں کا قافلہ' جس پر گرم مصالحے لدے ہوئے تھے' ڈوب گیا۔ شیخ نے سر نیچے کیا اور کہا' سبحان اللہ! پھر کسی نے خبر دی کہ شیخ وہ خبر غلط تھی۔ وہ قافلہ نہیں ڈوبا۔ شیخ نے پھر نگاہ کی اور کہا' سبحان اللہ! کسی شخص نے کہا' یا شیخ! سمجھ نہیں آئی۔ دونوں دفعہ آپ نے سبحان اللہ کہا۔ آپؒ نے جواب دیا کہ پہلے نقصان ہوا تھا۔ میں نے اس کم بخت کو دیکھا کہ پریشان تو نہیں؟ تو یہ متغیر نہیں ہوا۔ میں نے کہا' اللہ تیری ذات پاک ہے۔ پھر جب خبر آئی کہ قافلہ نہیں ڈوبا' تو پھر میں نے نگاہ کی کہ کم بخت خوش تو نہیں ہوا؟ تو اس میں تغیر نہیں آیا۔ میں نے اللہ کی تعریف کی۔ اس کا احسان ہے کہ مجھے اس نے ان پھندوں سے بچایا۔ اسی چیز نے شیخ عبدالقادر کو پیران پیر بنا دیا۔ باقی پاکھنڈ بھی پہچانے جاتے ہیں اور اصلی بھی پہچانے جاتے ہیں۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) جب صوفی ازم شروع ہوا۔ جدید خیالات آئے۔ تضادات شروع ہوئے۔ متقابل نظریات متصادم ہونا شروع ہوئے تو دیکھا یہ گیا ہے کہ وہ نظریہ جس کے ساتھ ان کی کمٹمنٹ مضبوط نہیں ہوئی' ہمیشہ اس نظریے سے شکست کھا جاتا ہے جس کے ساتھ انسان کی بہتر کمٹمنٹ ہو۔ صوفی کا لفظ دو مرتبہ اس معنے میں استعمال ہوا ہے کہ شاید یہ زندگی سے

گریز ہے۔ شاید یہ ٹوٹے پھوٹے لوگوں کے دلوں کا سہارا ہے۔ شاید احساس کمتری کا مداوا ہے' یا شاید احساسِ محرومی کا پُرتکلف لباس ہے مگر ایسا نہیں ہے۔

میں لفظ صوفی پر اتنا ہی معترض ہوں جتنے کہ کوئی اور صاحب ہیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ جب ہم لفظ صوفی پر غور کرتے ہیں تو ازمنہ وسطیٰ کی ڈکشنری ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے صرف حافظ شیرازی ہے۔ سعدی شیرازی ہے۔ ہمارے سامنے وہ تمام ملاتی ہیں جو رقص و سرود میں صوفی ازم کو ڈھونڈتے ہیں مگر کیا ہمیں اس وقت یہ حدیث یاد نہیں آ سکتی' جب جنگ تبوک سے رسولؐ پلٹے اور تھکے ہارے مسلمانوں کو خطاب کیا اور کہا' اب ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کو پلٹ رہے ہیں۔ اصحابِ رسولؐ نے عرض کی' یارسول اللہؐ! میدانِ قتال میں تلواروں کے ساتھ خدا کی راہ میں خون بہانے سے بھی بڑا کوئی جہاد ہے؟ فرمایا' ہاں جہاد بالنفس ہے۔ صوفی کمزور اور بزدل نہیں ہوتا۔ وہ واحد ایک ایسا شخص ہے جو خارجی بحران سے تو لڑتا ہے ہی' مگر وہ اپنے وجود کی عریانیت اور احساس کمتری کا بھی مطالعہ کرتا ہے۔ وہ محرومیوں کے سیلاب سے بھی گزرتا ہے مگر اپنے ہی سیلف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی نفی اور اس کا بطلان کرتا ہے۔ وہ خداوند کریم اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں بڑھتا ہوا' اعمال صالح کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر ایک فکر مسلسل کے ساتھ اپنی ہر اندرونی کمزوری کا سامنا کرتے ہوئے ہر روز مرتا ہے۔ اگر وہ ہر روز نہ مرتا تو وہ بڑا مجاہد نہیں ہو سکتا تھا۔

مجاہد ایک وقت اشتعال میں مبارزت میں تلوار سے بچنے کی بھی امید رکھتا ہے مگر صوفی یہ امید نہیں رکھتا۔ اس کو پتہ ہے کہ میں نے ہر حال میں ہر رنگ میں اپنے آپ کو قتل کرنا ہے' کیونکہ ہوائے نفس ہے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلط فکری کو جائے گا۔ اس میں کوئی چیز میرا ساتھ نہیں دے گی۔ اس لیے کہ خداوند کریم کے قانون کے مطابق اس کو پتہ ہے واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی' ہمارے صوفی کی تعریف یہی ہے کہ وہ جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کو بڑھتا ہے۔ دنیاوی جدوجہد میں توازن تخلیق کرنے کے بعد ایک باطنی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اس آیت پر عمل کرتا ہے کہ خارجی گناہوں سے بھی بچو اور باطنی گناہوں سے بھی بچو۔

مسئلہ یہ ہے کہ باطنی یا خارجی گناہ میں کیا صوفی کے دل میں کوئی واپسی نہیں ہو سکتی اور اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم پلٹ نہیں سکتے؟ کیا کہیں وہ شکست نہیں کھا سکتا؟ اس کے دو

بڑے حریف ہیں‘ جن کی اللہ نے خود خبر دی ہے کہ شیطان تمہیں چھپ کے دیکھ لیتا ہے۔تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔اس کے پاس بھی کوئی ایسا اثاثہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اس خفیہ دشمن سے اپنا بچاؤ کر سکے۔ دونوں ہی اس کے خفیہ دشمن ہیں۔اس کا نفس اور اس کا شیطان بھی۔ Recurrence Of Thought اندر بھی اور External Thought بھی۔اب ان دونوں کے درمیان توازن اور اعتدال صرف اور صرف متابعت رسولؐ میں ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ حدیث پر غور کرنے والے اور بہت سارے حدیث کو پڑھنے والے حدیث کے ظاہرہ معنوں پر اتنے سختی سے کاربند ہوتے ہیں کہ پیغمبر کا مقصد ہمیشہ گم ہو جاتا ہے۔یہی وہ وجہ ہے کہ بخاری اپنی کتاب میں جو پہلی حدیث لائے‘ تو یہ لکھا کہ میں اعمال رسولؐ نقل کر رہا ہوں‘ مگر جب تک نیاتِ رسول تک نہیں پہنچو گے‘اس وقت تک تم کبھی بھی مراد کو نہیں پہنچ سکو گے۔

صحاح ستہ کا ایک ایک صفحہ کھول لیجیے۔یہ بڑے عجیب پیغمبر ہیں کہ کہیں ایک حدیث بھی اپنی ذات کی تعریف میں نہیں ہے۔وہ شخص کریم‘ جس کو خدا خود رؤف ورحیم کہتا ہے وہ ایک لفظ بھی اپنی تعریف میں نہیں کہتا۔اتنا ٹو دی پوائنٹ اور ٹو دی ٹیکسٹ استاد میں نے آج تک زمین وآسمان میں نہیں دیکھا جو صرف ایک سبق دینے آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا واحد ہے۔اس میں کسی کو شریک نہ لاؤ۔ مجھے بھی شریک نہ کرو بلکہ رسولؐ سے سوال کیا گیا کہ جنت میں لوگ کیسے داخل کیے جائیں گے؟ فرمایا‘ اللہ کی رحمت کے ساتھ۔ایک صحابی نے پوچھا کہ آپؐ بھی؟ فرمایا‘ ہاں میں بھی اللہ کی رحمت سے داخل کیا جاؤں گا۔

یہ وہ شخص فرما رہے ہیں جن کے بارے میں قرآن اور خود خدا یہ کہتا ہے کہ وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین جو خود مجسم رحمت ہے۔احتیاط رسول کا یہ عالم ہے کہ پوری احادی میں اپنے اس خطاب کو بھی استعمال نہیں کرتے اور ان کی نگاہ پورے اسباق میں صرف ایک چیز پر ہے کہ حتمی ترجیح اللہ ہونی چاہیے نہ کہ میں۔آج جب ہم اللہ کی ترجیح کی بات کرتے ہیں جو متابعت رسولؐ میں۔ اللہ کے رسولؐ نے جو بات ذہنی اور عملی سطح پر اجاگر کرنا چاہی‘ یہی تھی کہ خدا کی صفات اور اس کے معاملات میں کسی فرد بشر کو اتنی اہمیت نہ دینا اور مجھے بھی نہ دینا۔

شیخ جنیدؒ نے توحید کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ قدیم کو حادث سے علیحدہ کرنے کا نام توحید ہے۔سچ پوچھیں کہ بغیر نبی اکرمؐ کے یہ دانشورانہ استعداد پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور یہ صوفی ازم

خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ رسول کی پیروی میں سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ ہمیں اپنے نفس کے خلاف جانا پڑتا ہے۔ایک خصوصی تہذیب نفس سے آ گہی حاصل کرنا پڑتی ہے۔اس کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔خدا تک کوئی بھی راستہ بغیر محمدؐ کے طے نہیں ہوسکتا۔

شریعت یا طریقت

مذہب چلنے کا رستہ ہے' یہ منزل مقصود نہیں ہے۔جب لوگ مذہب کی چار دیواری میں قید ہوتے ہیں تو وہ فرقہ بن جاتے ہیں۔ایک قسم کا بت کدہ' جس میں نیت اور اخلاص اللہ کے لیے شامل نہیں ہوتا۔ہم نے دیکھا ہے کہ تمام پرانے مذاہب اسی لیے خوار اور رسوا ہوئے۔خاص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں بنو اسرائیل جن کو ہم فلسطین کہتے ہیں' اتنے پکے نمازی اور کٹر تھے مگر ساتھ ساتھ سود اور محتسب کا کام کرتے تھے۔اس لیے جب مذہب روایت کا حصہ بن جاتا ہے وہ ایک علمی موومنٹ اور تحریک نہیں رہتی۔آج کے زمانے میں بھی بد قسمتی سے یہ دیکھا گیا ہے کہ تمام مذہب سکولوں کی چار دیواری میں قید ہوگیا ہے۔وہ سکول اس طرح طالب علم کا ڈیٹا قید کرتے ہیں کہ اسے کسی دوسرے سکول کی ہوا لگنے نہیں دیتے۔مسلمان کا کام یہ تھا کہ جہاں اسے عقل و معرفت اور دین و مذہب کی بات ملتی' وہ وہاں سے اسے سیکھتا۔چاہے وہ بریلوی ہے' دیو بندی یا اہل حدیث ہے۔

سکولوں کی قید اور بندش سے علم اپنے اپنے مقاصد کے تحت محدود ہوا اور تمام غرض و غایت دین ایک لوکل اتھارٹی تک محدود ہو کر رہ گئی۔میں نے اسی حقیقت کی طرف دھیان دلایا تھا۔مذہب کا صرف ایک مقصد ہے۔حضرت آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ تک تہذیبیں اور شریعتیں بدلتی رہی ہیں۔وہ کبھی ایک نہیں ہیں۔کبھی انسان اتنا میچور نہیں تھا کہ اس پر یہ اصول لاگو ہوتے' جو آج ہم پر بحیثیت مسلمان عائد ہیں۔دو دو تین تین قوانین پر معاشرے اور تہذیبیں چلیں۔حمورابی کے زمانے میں ایک قانون قصاص پر سارا مذہب چلا' جس کو آپ آج بھی قرآن میں پڑھتے ہیں۔پوری قوم اسرائیل دس قوانین جسے Ten Commandments کہتے ہیں' پر چلتی رہی۔صرف مسلمان کو پوری کی پوری کتاب پچھلی تہذیبوں سے لے کر آج تک کی دی گئی مگر یہ تہذیبیں اور معاشرتی انداز بدلتے رہے ہیں مگر ایک مقصد دین کا ہمیشہ رہا کہ جس شخص نے

بھی خدا کو طلب کیا' خدا کی جستجو کی' خدا کی محبت کا بیج اس کے دل میں پڑا' جب اس نے راستہ ڈھونڈا تو مذہب کو پایا۔

اب آپ خود ہی سوچیے کہ کیا ہم رستے کو چومتے چاٹتے رہیں اور منزل کی کوئی فکر نہ کریں۔ جب عمل خدا کے لیے نہ کیا جائے تو وہ ایک شرعی نظام کہلائے گا؟ جب عمل خدا کے لیے اور اس کی انس ومحبت کے لیے کیے جائیں گے تو وہ طریقت کا نظام کہلائے گا۔ اسلام میں داخل ہونا آسان ہے مگر مومن بننا ذرا مشکل ہے۔

رہبانیت اور مناقب تصوّف

کوئی بھی بڑا صوفی راہب نہیں ہے۔ میں آپ کو چار بڑے صوفیاء کے اقوال بتاتا ہوں۔ لا اکراہ فی الدین' لا رہبانیۃ فی الاسلام اور لا سرورۃ فی الاسلام' یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی بڑا صوفی ہو اور معاملاتِ دین میں اس کی سند مکمل نہ ہو۔ وہ جنید بغدادیؒ ہو یا عبدالقادر جیلانیؒ۔ ابن تیمیہ جیسے سخت نقاد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب علم کی تلاش میں کوئی صوفی اپنے مقام سے آگے بڑھتا ہے' تو اس کو شروع میں اپنی جبلتوں کی سختی کی وجہ سے کچھ اقدامات بھی سخت کرنے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں یہ محسوس کروں کہ میں بہت بھوک والا آدمی ہوں تو مجھے اپنے اندر بھوک کی بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہوس کو کنٹرول کرنے کے لیے اپنے آپ کو دو چار فاقے دینے پڑیں گے۔ اس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ صرف کبھی کبھی اپنے مقام پر سخت ہو جاتا ہے۔ مگر بالعموم تمام صوفیا انتہائی نارمل رہے۔

خواجہ ابوالحسن شاذلیؒ' جن کو امام مغرب کہتے ہیں اور جو شاذلیہ کے امام ہیں' کی ایک بات بتاؤں۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کے صوفیا کو کیا ہوا ہے کہ یہ اپنی بیویوں کے ساتھ اس لیے نہیں چلتے کہ لوگ کہیں گے صوفی اور بیوی! یہ بازوں میں اس لیے سبزی نہیں خریدتے کہ لوگ کہیں گے' صوفی کو سبزی خریدنے سے کیا کام ہے۔ یعنی اتنے نارمل تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کتنے ہی سخت وظائف میں ہوتے' اگر کوئی ملنے آجاتا اور کوئی مانع نہ ہوتا' تو وظائف تک چھوڑ کر ان سے ملنے آجاتے۔ آج بھی وظائف میں بہت بڑا وظیفہ انہی کے نام سے منسوب ہے' جسے دعائے حزب البحر کہتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ پچاس سال کی ریاضت شاقہ کے بعد جب خلق میں آئے ہیں تو ان کا عالم یہ تھا کہ کتان' جو اس وقت سب سے مہنگی کاٹن تھی' کا جو کرتہ پہنتے' دوسرے دن نہ پہنتے تھے۔ اتنا نفیس لباس اور وہ اس قدر اپنے آپ کو بہترین حالت میں رکھتے تھے کہ یہ امر محال تھا مگر دوسری طرف یہ عالم تھا کہ ان کا خلیفہ خاص اس خیال کے ساتھ شیخؒ کے ساتھ چلا کہ جمعہ کا دن ہے۔ حضرت کو بہت ساری سلام دعا ہوگی۔ میں بھی ساتھ ہوں' مجھے بھی سلام دعا ہو جائے گی۔ میں ایک مشہور آدمی ہو جاؤں گا۔

جب وہ چلنے لگے تو دیکھا کہ رستے میں کسی نے سلام ہی نہیں کیا۔ اب ہر آدمی کو وہ اس نظر سے دیکھتے کہ شاید یہ آئے اور ہاتھ ملائے۔ کسی نے سلام ہی نہیں کیا۔ شیخ عبدالقادرؒ نے اسے کنکھیوں سے دیکھا اور مسکرائے۔ پھر جامعہ بغداد آئے۔ نماز پڑھائی۔ جب نماز پڑھا کر نکلے تو پھر ایک دم خلق کا رش پڑ گیا۔ کوئی پاؤں چھور رہا ہے' کوئی ہاتھ چھور رہا ہے۔ یہ بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ جب میں آگے گیا تو شیخ نے مجھ دیکھ کر کہا' بھائی! اللہ نے ہمیں تصرف فی القلوب بخشا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ تیری کیا خواہش تھی؟ مگر آتے ہوئے میری خواہش نہیں تھی کہ کوئی مجھ سے ملے۔

یہ تمام اکتساب محض بات چیت سے نہیں آ سکتا۔ اس کے پیچھے ان کی اضطرابی کیفیتوں کی مسلسل مشقت ہوتی ہے۔ ایک صورت حال بار بار اعادہ کرتی ہے۔ اس کے پیچھے توقف کرتے ہیں۔ اس پر محنت ہوتی ہے۔ صوفی اس پر مسلسل سوچتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کا سب سے بہادر انسان ہوتا ہے اس لیے کہ وہ سب سے بڑے خطرے یعنی اپنے آپ کا سامنا کرتا ہے۔ وہ خطرہ' جس کی رسولؐ نے نشاندہی کی ہے۔ انسان ایک مرتبہ مرتا ہے لیکن صوفی روز مرتا ہے۔ اسی لیے تصوف میں ایک اصطلاح ہے کہ صوفی کا قتل ہر ایک پر مباح ہے کیونکہ اس نے بدلہ نہیں لینا ہوتا۔

اسلام میں ان لوگوں کے لیے قانون آیا ہے اور ہر جگہ آیا ہے۔ اگر تم برابر کا بدلہ لو تو ٹھیک ہے اور اگر معاف کر دو تو بڑی بات ہے۔ یہ قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر جو بڑی بات کے لوگ ہیں' یہ صوفیا ہیں۔ اسی طرح ایک اور محاورہ مشہور ہے کہ چھوٹے لوگوں کی نیکیاں بڑے لوگوں کے گناہ ہیں جس کو عام آدمی نیکیاں سمجھتے ہیں' صوفی اسی بات کو گناہ سمجھتا ہے۔

تصوّف اور انتقال پذیری

ہم پچھلوں سے اگلوں کا گلہ نہیں کر سکتے جیسے کہ اقبالؒ نے کہا کہ:

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

(بغیر علم کے کوئی چیز جاری نہیں رہتی۔ ایک وقت میں جب ایک عالم زمانہ کا ظہور ہوتا ہے تو اس کی اولاد اس کے مشرب اور اس کے اخلاق پر تو قائم رہ سکتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کا علم بھی میراث میں حاصل کرے اور وہ کیوں نہیں؟ اس لیے کہ علم وہ نعمت خصوصی ہے جسے اللہ بڑی جان پہچان کے بعد کسی بندے میں رکھتا ہے۔ اگر آپ نے قرآن شریف دیکھا ہو تو اللہ کہتا ہے' یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نے محمد رسول اللہؐ کو نعمت علم کیوں بخشا؟ ان کو پتہ نہیں کہ یہ وہ چیز ہے جو خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کے ہم انسانوں میں رکھتے ہیں۔ یہ منتقل نہیں ہوتی۔ تصوّف میں بھی نہیں ہوتی۔ کوئی صوفی کتنے بڑے درجے کا کیوں نہ ہو' وہ اپنے بچے کو بھی بغیر تحصیل علم کے علم منتقل نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ اس کے بچے میں اہلیت ہے۔

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک بچہ یا شاگرد اپنے استاد سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ تمام محققین تصوف اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ جناب شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ اپنی جدوجہد میں اپنے اساتذہ جنیدؒ سری سقطیؒ اور ابوالفضل قطلیؒ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے۔ بعض شاگرد اپنی طلب خالصہ' محنت اور تجسّس علیمہ سے اپنے اساتذہ کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ احترام و محبت اور خدمت میں نہیں' علم میں۔

اس کی مثال سیدنا ہجویریؒ یہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے شیخ ابوالفضل قطلیؒ کے ہاتھ دھلوا رہا تھا اور سردی بڑی سخت تھی۔ میرے دل میں آئی کہ ہم کیوں ان لوگوں کی اتنی عزت کرتے ہیں؟ جو کچھ دینا ہے' اللہ ہی نے دینا ہے تو پھر ہم ان کی اتنی خدمت کیوں کرتے ہیں؟ میرے شیخ نے خطرۂ قلب پر آگاہی پائی اور کہا' اے سپاہی زادے! بات تو تو ٹھیک کہہ رہا ہے مگر ہر آدمی کا دوسرے آدمی کے پاس حصہ ہوتا ہے۔ تیری تعلیم کا کچھ حصہ میرے پاس ہے۔

اسی طرح جو بڑے استاد ہیں' وہ بعض بہت ہی قیمتی سبق ذاتی سطح پر اور صورت حال

کے مطابق ودیعت کرتے ہیں۔تصوّف کی ایک کتاب پڑھ لینا اور معنی رکھتا ہے' مگر تصوّف کا ایک مطلب حاصل کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ جب تک صورتحال پیدا نہیں ہوگی' وہ درس آپ پر لاگو نہیں ہوسکتا۔ کتابیں رٹ لینے سے تصوف نہیں آتا۔ تصوف اذیت اور کیفیتِ نفس سے گزرنے کے بعد قرار حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ گنجائش ذات پر ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر میں ایک دفعہ اپنے دوست سے ناراض ہوا۔ بڑی سخت رنجش میرے دل میں تھی۔ کہیں انتقامی حس چنگاری مارتی اور کہیں غصہ میرے اعصاب پر حملہ آور ہوتا تھا۔ گھن گرج بھی تھی اور بادل بھی تھے (میں نے شیخ ہجویریؒ کی کتاب کے آخر میں ایک بات لکھی دیکھی کہ میرے دل میں ایک بھائی کی طرف سے رنجش تھی۔ وقت آخر تھا اور میرے شیخ کا سر میری آغوش میں تھا۔ مجھے انہوں نے کہا' علی بن عثمان! اگر تو ایک بات کو جان لے تو تو ہر غم وفکر سے بے نیاز ہو جائے گا کہ بدی اور خیر وشر' جو کچھ اللہ نے کسی کو چنا' وہ بامر مجبوری اس کو ادا کر رہا ہے۔ تو پھر تجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں رہ جائے گا۔)

اب یہ سبق ہم بالعموم بیان نہیں کرتے۔ یہ مقدرات کے وہ سبق ہیں کہ جب تک آپ کا انٹلکچوئل لیول حتمی سطح پر نہیں جاتا' یہ بات عام حالات میں کہہ دینا خطرناک ہے' مگر ایک صوفی کے مقامِ فکر پر پہنچ کے کہہ دینا بہت زیادہ ہے۔

اسی طرح شیخ محترم نے فرمایا کہ جوں جوں انسانوں کا علم بڑھتا ہے' وہ جبر مستقل کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کم ہوگا تو انسان اختیار کو نکلے گا۔ یہ منازلِ فکر آہستہ آہستہ طے ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے اب کہ علم برائے علم کی ہوس بھی نہیں رہی۔ جو یورپ میں ہے' ان میں علم برائے خدا کی ہوس نہیں ہے مگر آج بھی ان کی علم اور تحقیقات میں سرگرمی' علم کی تحقیق وجستجو میں انہیں آگے بڑھا رہی ہے۔ مسلمانوں سے علم برائے خدا کی ہوس بھی کھوئی گئی اور علم برائے علم کی ہوس بھی کھوگئی (علم کے بغیر کسی فرد کا کوئی پرسپشن نہیں ہے اور نہ خدا ہی کا کوئی پرسپشن ہے۔ وفی انفسکم افلا تبصرون' ابھی غور وفکر کرو گے تو تمہیں اپنی ذات میں آیاتِ الٰہی نظر آئیں گی۔ غور وفکر کی صلاحیت نہیں ہے تو یہ نہ ہوگا۔)

آج تصوف کے میدان میں سو فیصد لوگ ان پڑھ ہیں' جو تمام تصوف کا دارومدار ابنارمل اور سب نارمل کیفیات کو رکھتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ تصوف صرف تین چیزوں پر

مبنی ہے۔ کوئی چوتھی چیز نام کو بھی تصوف میں شامل نہیں ہے۔ جب یہ لوگ غیر معمولی کیفیات کو تصوف سمجھیں گے' تو سب سے پہلے عام لوگوں کو جو اپنا معیارِ عقل ہے' وہ خبط ہو گا۔ پھر اس کے بعد وہ استدراج شیطان کا شکار ہوں گے۔ وہ کس قسم کا شخص ہو گا جسے آپ خود ہی خدا سمجھنا شروع ہو جائیں گے۔ نہ صرف یہ کہ وہ خود کرپٹ ہیں بلکہ مذہبی لوگوں کو کرپٹ کرنے کا ذریعہ ہیں۔

ابھی آپ کے سامنے ایک خاندان کی تین نسلیں گزریں۔ میرا یقین ہے کہ 36ء اور 38ء میں برصغیر کا سب سے بڑا مذہبی اور صوفی عالم گولڑہ شریف والے خواجہ مہر علیؒ تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت مشکل مقاماتِ تصوف پر گفتگو کی ہے۔ زماں اور مکاں پر اظہارِ خیال کیا ہے اور ان کی حیثیت کو ابھارا ہے۔ اگرچہ میرے پاس وجوہ موجود ہیں کہ میں ان کی کہی کچھ باتوں کو تسلیم نہ کروں' مگر ان کے زمانے کو دیکھتے ہوئے کوئی شک نہیں پڑتا کہ وہ برصغیر کی تاریخ میں ایک بہت بڑے اسکالر تھے' جو پیدا ہوئے۔ وہ اس معاملے میں آخری چشتیہ تھے۔ وہ صوفی ٹیچر تھے۔

ان کے بچوں کے پاس وہ اوریجنل تعلیمی اظہار کا ٹیلنٹ نہیں رہا' وہ علمیت نہیں رہی' مگر روایت' محبت' انس سب کچھ باقی ہے۔ چنانچہ وہ اپنا کردار اچھے طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔ جہاں علم اور کرامت وفضیلت نہ رہی' وہاں عمومی کرامت آ گئی' وہاں علم نہیں رہا۔ اب انہوں نے اپنا وقت پاس کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دفعہ مجھے شبِ قدر کی علامات پر گفتگو کرنا تھی کیونکہ میرے خاندان کے کچھ لوگ بھی یہاں وابستہ تھے۔ اگرچہ میرا وہ عالم کبھی بھی نہیں تھا۔ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لاہور سے اس مسئلے کی تحقیق کے لیے سیدھا گولڑہ شریف پہنچا۔

مجھے پتہ چلا کہ ایک صاحب بڑے علم والے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ میں شبِ قدر کی داخلی علامات پر آپ سے گفتگو کرنے آیا ہوں۔ انہوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں نہیں جانتا۔ ایک آدھ اور بحث' جو میں نے وہاں سنی' وہ قطعاً تحقیقی اور علمی نہ تھی۔ میں واپس آ گیا مگر آتے ہوئے بھی مجھے یہ کبھی خیال نہیں آیا کہ بڑے شیخ میں کوئی نقص ہو گا یا بعد کے شیخ میں کوئی نقص ہو گا۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ معاملات علمیہ نسل در نسل نہیں چلتے۔ نسب جا سکتا ہے' علم نہیں جا سکتا' اس کے لیے اپنی اپنی تحصیل ہے۔ یہ قابل انتقال نہیں ہے۔ کوئی علم بھی غیبی طور پر منتقل نہیں ہوتا۔

وحدت الوجود اور تصوّف

جمع وحدت میں جناب شیخ ہجویرؒ نے گفتگو کرتے ہوئے ایک بڑی سادہ سی بات کہی ہے۔ہم وجود اور شہود کی بحث کیوں پڑھتے اور سیکھتے ہیں۔بحیثیت ایک طالب علم کے جو تصوف میں دلچسپی رکھتا ہے' اس کا قطعاً کوئی تعلق اللہ کے علم سے نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف جاتے ہوئے کہ ذہنی پیچیدگیوں کو ختم کر کے ایک بڑی سی سادگی اختیار کرتے ہیں جہاں ہمیں عذرِ بندگی ہو اور اللہ کو شانِ خداوندی نصیب ہو۔

اصل میں یہ نظریات اس لیے حاصل کیے جاتے ہیں جیسے پروردگار نے کہا' ادعوا الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ' خدا کی طرف بلاؤ حکمت اور اچھی بات سے۔ وجادلھم بالتی ھی احسن اور بحث کرو احسن طریقے سے۔بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ جب ہم بحث مباحثے میں پڑتے ہیں تو ایک آدمی دوسرے آدمی سے نمبر اس لیے لے جاتے ہے کہ اس کو ایک اصطلاح کی آگہی نہیں ہوتی۔چنانچہ صوفی جدلیات فکر و ذہن اس لیے سیکھتے ہیں کہ وہ غیر اقوام سے گفتگو کرتے ہوئے کسی معاملے میں کم نہ پڑ جائیں۔ورنہ اس کا تعلق خدا یا خدا کی شناخت سے بالکل نہیں ہے۔

ایک دفعہ ایک یونانی Agnostic شیخ ہجویرؒ کے سامنے آ گیا۔Agnostic یونان کا ایک فلسفیانہ سکول ہے' جس کا کہنا یہ ہے کہ تمام علم بے سود ہے۔وہ شیخ ہجویرؒ کو کہنے لگا کہ تمام علم بے سود ہے' تم کس چکر میں پڑے ہوئے ہو۔شیخ ہجویرؒ نے کہا کہ اگر تم نے یہ نتیجہ کسی علم کی بنیاد پر نکالا ہے تو تم علم کے ایک حصے کو صحیح اور دوسرے کو غلط کہہ رہے ہو اور یہ تضاد ذہن ہے۔اگر تم نے یہ نتیجہ بغیر علم نکالا ہے تو تیری بات میں وزن ہی کوئی نہیں۔میں جاہل کی بات نہیں سنتا۔

کسی شخص کو کم ہی پتہ ہوگا کہ تمام بڑے صوفی جدلیات کے ماہر ہوتے ہیں جو پڑھے لکھے ہوتے ہیں' وہ علم کی ہر صنف پر نگاہ رکھتے ہیں۔اسی لیے سیدنا ہجویرؒ نے کہا کہ تمام علوم سے' جتنا خدا کی شناخت کے لیے ضروری ہے' لے لو مگر واحدت الوجود اور شہود کا تعلق اللہ سے قطعاً کوئی نہیں ہے۔جمع وحدت کے باب میں وجود و شہود کی گفتگو جب شیخ ہجویرؒ نے ختم کی تو ساتھ ایک جملہ ارشاد فرمایا' کہ اے بھائی! یہ صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ان کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اللہ

تک تو صرف نیّت کے اخلاص اور سادہ سی آرزو سے پہنچا جا سکتا ہے۔

قرآن حکیم میں بڑے پیمانے پر وجود اور شہود کو واضح کیا گیا ہے۔شاید ابھی فلاسفر اپنے ذہن یا محدود ڈیٹا کی وجہ سے اس مقام تک نہیں پہنچ سکے، جہاں اللہ ہے۔خدا نے کہا کہ ھو الاول و الآخر والظاھر والباطن وھوبکل شئی علیم' وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن ہے۔اسی نے کائنات و حادثات کو اپنے علم سے گھیرا ہوا ہے۔یہ وجود سے بہتر بات ہے، جو اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

اولیاء اللہ میں درجات

درجاتِ اولیاء میں ایک درجہ ہوتا ہے جسے ہم عارف کہتے ہیں۔ یعنی جاننے والا۔ لوگوں میں بھی نیک لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں اور جو ایمان کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں' ان کو بھی ولی کہہ سکتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک دو ہی قسم کے بندے ہیں۔ یا اولیاء رحمٰن ہیں یا اولیاء شیطان۔ اولیاء اللہ تعالیٰ کثرت سے ہوتے ہیں' مگر وہ عارف نہیں ہوتے۔ عارف کو تکنیکی اعتبار سے ہم قطب ارشاد کہتے ہیں۔ جب بزرگوں کے درجے بنے تو سب سے بڑے عالم کو' جو علوم ظاہری اور باطنی میں سب سے مکمل ہوتا ہے' اس کو ہم عارف کہتے ہیں۔ ہر عارف عالم ہوتا ہے' لیکن ہر عالم عارف نہیں ہوتا۔

یہ اتنی عجیب و غریب بات نہیں ہے۔ یہ آپ کے سیاسی عہدوں کی طرح ہی ہیں۔ جیسے کسی بھی جگہ کوئی تنظیم بنائی جائے تو ان میں بہتر سے بہتر کی تلاش کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح زمین پر وہ لوگ' جو اللہ کی طرف رغبتیں رکھتے ہیں' انہیں چنا جاتا ہے۔ اصحابِ رسولؐ کے دور میں اس کی سلیکشن کی ضرورت نہیں تھی اور دھڑا دھڑ اللہ کی طرف سے اسناد جاری ہو رہی تھیں۔ وہ وقت اب نہیں آئے گا۔ کوئی ولی اللہ نہ کوئی خدا کا بندہ کسی صورت اپنا تقابل اور دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ اصحابِ رسولؐ کی خاکِ پا کے بھی برابر ہے۔ یہ لوگ وہ تھے' جن کے بارے میں اللہ نے کہا' رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ' اللہ ان سے راضی ہوا' وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ جن کے بارے میں خداوند کریم نے کہا کہ میں اصحابِ شجرہ سے خوش ہوا۔ انہوں نے تیرے ہاتھ پر نہیں'

میرے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسی طرح اصحاب بدر کو کہا کہ ان کے میں نے پچھلے سب گناہ بخش دیئے۔ اب اس طرح کی اسناد آنے سے رہیں۔ آج کوئی دعویٰ امانت نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی شخص اپنے آپ کو اصحاب کے بعد مومن نہیں کہہ سکتا۔

افغانستان میں جب وہ امیر المومنین ٹھہرے' تو مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ تکنیکی اعتبار سے نام کے تو ہم سب مسلمان ہیں مگر مومن ہونا ایک باطنی کیفیت کا دعویٰ ہے' جو بندہ از خود نہیں کر سکتا۔ جب ہم اصحاب کو مومنین کہتے ہیں' تو اس وجہ سے بالکل نہیں کہتے کہ اصحاب نے اپنے آپ کو مومنین کہا' بلکہ اس لیے کہ اللہ نے ان کے حق میں شہادت دے دی کہ یہ مومنین ہیں۔ قرآن میں لکھا ہوا آ گیا۔ سند جاری ہو گئی۔ چنانچہ اصحابِ رسولؐ کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں مومن ہوں۔

اندرونی کیفیات کا حال جاننے والے صرف اللہ ہے اور اس کا دعویٰ کرنا باطنی کیفیت ہے۔ جبکہ مسلم ظاہری حالت ہے۔ ہم سب دعویٰ اسلام کر سکتے ہیں لیکن ایمان باطنی کی پرکھ صرف اللہ کے پاس ہے۔ چہ جائیکہ آپ امیر المومنین ہو جائیں۔ وہ اگر اپنے کو امیر المسلمین لکھتے تو زیادہ اچھی بات ہے۔

جب بہت سارے بزرگوں کی جانچ پرکھ ہو جائے' تو ذہین اور متقی لوگوں کو اللہ تعالیٰ مزید ٹیسٹ دینا شروع کر دیتا ہے۔ ذہانت اور تقویٰ کا باہمی جوڑ ہے۔ شیخ عبد القادر جیلانیؒ لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے' سو میں سے پانچ اس قابل نکلیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مختلف امتحانات سے روشناس کرائے۔ ان پانچ فیصد میں ناکام بڑے ہوتے ہیں۔ جب دنیا میں خواتین کا خوبصورتی کا چناؤ ہوتا ہے' تو پیچھے سے گریڈ تھرڈ تک گریڈ ٹھیک بنتے چلے آتے ہیں۔ سیکنڈ تک بھی ٹھیک ہوتا ہے مگر جب فرسٹ آتا ہے تو دو خواتین سامنے کھڑی کر دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک مس یونیورس کا انتخاب کرتے ہیں تو دوسری بے چاری کچھ بھی نہیں ہوتی۔ وہ ویسے ہی تکمیل یونیورس کے لیے آئی ہوتی ہے۔

(اسی طرح خیر کو جب آگے بڑھایا جائے تو عین ممکن ہے کہ آخر کے دو مقابلہ کرنے والے چنے جائیں۔ ان میں سے ایک اللہ کا قطب الاقطاب اور دوسرا کچھ بھی نہ ہو۔ آگے خالی تقویٰ عبادت' ذہانت اور خالی رکھ رکھاؤ ٹیسٹ نہیں ہوتے بلکہ تمام انسانی صفات کا جزوی ٹیسٹ ہوتا ہے۔ ہر چیز کو تھوڑا تھوڑا پرکھا جاتا ہے۔ جو درجۂ اعتدال پر ممیز ہوگا' اسی کو قطب الاقطاب بنایا

جائے گا۔)

اس سو سال کے عرصے میں چونکہ وسیلۂ تعلیم اور وسیلۂ علم بھی اولیاء بنتے ہیں تو سو سال کے عرصے میں ایک Mystic ٹیچر بھیجا جاتا ہے۔ یہ پورے سو سال کے عرصے کے لیے ہوتا ہے۔ اسے آپ عرفِ عام میں مجدد بھی کہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ مجدد لفظ علما کے ہاتھ چڑھا' تو ایک ایک صدی میں دس دس مجدد پیدا ہونا شروع ہو گئے مگر یہ مجدد وہ نہیں ہوتے (مجدد کی خوبصورت تعریف اللہ کے ایک ولی سیدنا علاؤ الدین علی احمد صابر نے کی ہے۔ جب ان سے شاہ شمس ترک پانی پتی نے پوچھا کہ حضرت مجدد کسے کہتے ہیں؟ فرمایا' جو قدیم کی پوری خبر رکھتا ہو۔ حاضر کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہو اور ان کی اصلاح کرنا جانتا اور کرتا ہو اور جو مستقل کے لیے ارشادات کاملہ چھوڑے' وہ مجدد ہے۔ مجدد ماضی کا مکمل علم رکھتا ہے۔ حاضر کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہو اور ان کی اصلاح کرنا جانتا اور کرتا ہو اور جو مستقبل کے لیے ارشادات کاملہ چھوڑے' وہ مجدد ہے۔ مجدد ماضی کا مکمل علم رکھتا ہے۔ حاضر میں اپنے مسائل کو سمجھ کر علم کو صاف شفاف مرتب کرتا ہے اور مستقبل کے لیے اس کے مطابق ارشادات چھوڑ دیتا ہے تاکہ آدھی صدی کے لوگ گمراہی سے بچیں۔)

سو حدیث مبارک کے مطابق مجدد سو سال میں ایک پیدا ہوتا ہے۔ مجدد تو چھپا رہ ہی نہیں سکتا۔ قطب ارشاد اور مجدد چھپے نہیں رہ سکتے۔ یہ دونوں ایک ہی آفس ہیں۔ باقی لوگ اپنے تقویٰ اور طہارت سے عجیب وغریب قوتوں کے مالک نہیں ہوتے' بس نیک لوگ ہوتے ہیں۔

مناصب کی تلاش

لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ لوگ یہ عہدے بانٹتے پھرتے ہیں۔ جب کوئی کسی مرشد کے پاس جاتا ہے اور وہ نگاہ مارتا ہے کہ میں چار دن میں تمہیں قطب بنادوں گا تو وہ بے چارہ چار دن انتظار کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک مفروضہ ہے کہ پیر صاحب اسے قطب نہیں' تو قطب نما ضرور بنا دیتے ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ دنیا میں جیسے باقی درجات ہیں' اسی طرح یہاں بھی ہیں۔ آپ نے حکومتوں اور ان کی طاقتوں کا تعین کیا اور فیصلہ کیا کہ زمین پر امریکہ اور اس کا صدر دنیا کا طاقتور ترین صدر ہے۔ یہ آپ کے اپنے اندازے ہیں۔ پھر آپ نے اپنے آپ کو دیکھا تو پتہ چلا

کہ آپ تو کہیں بھی نہیں ہیں۔ پھر ایک عرصہ بعد اچانک پتہ چلا کہ آپ ان سات اپٹمی ملکوں کی صف میں آ گئے۔

زمین پر جب ہم دوسرے لوگوں کی طرح مراتب اور درجات بناتے ہیں' اسی طرح آسمانوں پر دنیا اور مافیہا میں جتنے بھی لوگ ہیں' ان کے مراتب بنتے ہیں۔ یہ مراتب غیر معمولی نہیں ہوتے۔ یہ وہاں اسی طرح ہوتے ہیں جیسے یہاں پر ہوتے ہیں۔ پھر اللہ کے نزدیک یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے قرآن پر اتنا عمل کیا۔ اس نے حدیث پر اتنا عمل کیا۔ یہ اتنی فقہ جانتا ہے۔ یہ اتنا عالم ہے۔ ان کی لسٹ اکٹھی کی گئی۔ اس میں لاکھوں لوگ ہوں گے۔ اسے مختصر کیا گیا۔ ان میں علم وعرفان کی حیثیت دی گئی۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو معاف کیا گیا۔ پھر ایک اعلیٰ ترین علمی حیثیت پر اللہ تعالیٰ نے درجات کا تعین کیا اور فرمایا' ونرفع درجت من نشاء' جس کے چاہتا ہوں درجے بلند کرتا ہوں' وفوق کل ذی علم علیم اور ہر ایک علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔

جب یہ درجات آئے تو بقول کچھ لوگوں کے جن کی تصدیق ہمارے پاس نہیں ہے کہ تمام دنیا سے 313 لوگ چنے لگے۔ یہ 313 کی تعداد شاید اس لیے ہے کہ اتنی ہی تعداد میں وہ اصحاب تھے جو رسولؐ کے ساتھ مل کر مقامِ بدر پر لڑے۔ جن کو خدا نے ہر قسم کی مغفرت کا وعدہ دیا اور جن کے بارے میں اللہ نے کہا کہ میں ان سے راضی ہوا' یہ مجھ سے راضی ہوئے۔ جب 313 کی باری آئی تو مقابلہ سخت ہو گیا۔ وہ جو حتمی فیصلہ ہے' وہ کسی کے تقویٰ اور عبادت ظاہرہ پر نہیں ہوتا۔ یہ اسی طرح ہوتا ہے' جس طرح ایک مباحثے میں چار ٹیسٹ کرنے والے افراد بیٹھ جاتے ہیں اور کہا کہ ایک کی زبان بڑی اچھی ہے۔ ایک کی شخصیت' ایک کا اظہار اور ایک کا مواد بڑا اچھا ہے۔

مجموعی طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ ہمیں خالی متقی نہیں چاہیے کیونکہ اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ صرف عالم نہیں چاہیے۔ یہ تو بے عمل ہے۔ تمام لوگوں میں ایسی معتدل روایات کو بلند کیا گیا جس کو تھوڑا تھوڑا کمال حاصل تھا۔ دو دو نمبر تمام شعبوں سے لیتا آیا اور اس طرح اس کے بھی سو میں سے نوے ہو گئے۔ جبکہ متقی کے نمبر 33 رہ گئے۔ اب اس منزل پر آ کے انہوں نے اعلان کیا کہ یہ قطبِ عالم ہے۔

اب ذرا قطبِ عالم کا منصب سن لیجیے۔ قطب ستارے کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ

رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ وہ صرف ایک ہوتا ہے۔ اس میں تین گریڈ ہیں۔ قطبِ عالم، مجدّد اور قطب ارشاد۔ قطب عالم کے لیے ضروری نہیں کہ وہ قطب ارشاد ہو مگر جب قطب ارشاد کا علم بلند ہوتا ہے تو باقی اقطاب ساقط ہو جاتے ہیں۔ قطبِ عالم اور مجدّد ایک حیثیت رکھتے ہیں۔

حضور گرامی مرتبت ﷺ کی حدیث کے مطابق ہر سو برس میں علم کا خاصا بگاڑ اور زوال آ چکا ہوتا ہے۔ اصول سے لوگ ہٹ گئے ہوتے ہیں اور بہت سی خرافات درونِ خانہ سرایت کر چکی ہوتی ہیں۔ دین میں ادھر ادھر سے بہت ساری باتیں شامل ہو کر ایسا کنفیوژن پیدا کر دیتی ہیں کہ بڑے سے بڑے متقی کو رستہ نہیں ملتا۔ مذہب کے ہزاروں دعوے دار ایسے اٹھ آتے ہیں، جن کی بصیرت نہ بصارت ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر گرین وچ ٹائم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس سے سب دنیا کی گھڑیاں درست ہو سکیں! سو حضورؐ نے فرمایا کہ ہر صدی کی ابتدا یا انتہا پر مسلم امت میں کسی مجدد کا خروج ظہور ہوتا ہے!

خواتین، ولیہ کاملہ

اسلام میں سینکڑوں عورتیں ولیہ کاملہ کی حیثیت تک پہنچتی ہیں اور یہ کسی بھی صورت میں کسی بھی عورت کا استحقاق ہے۔ جب میں قرآن حکیم کی فہرست پڑھتا ہوں تو میں نے دیکھا کہ پیچھے آنے والا اگلے پر غائب ہوتا ہے۔ مجھے لگا کہ ایک عورت خدا کی طرف جاتی ہوئی بہت سارے مردوں پر غالب آ جاتی ہے۔ اگر آپ وہ فہرست پڑھیں تو آخری لسٹ ہے والذکرین والذاکرت، ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں۔ چونکہ ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں پہلے تمام لوگوں پر حاوی ہیں، تو پھر ان دونوں میں ذکر کرنے والی عورت ذکر کرنے والے مرد پر حاوی ہے۔

اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ ہمیں کوئی چیز اللہ کے ذکر سے نہیں روکتی، لیکن عورت کو بڑے کڑے مناسک اللہ کے ذکر سے روکتے ہیں۔ اس میں اولاد، خاوند کی متابعت اور اس کے علم کی محدودیت یہ تینوں وہ بڑے نکات ہیں، جو عورت کو تحصیل علم خداوندی سے روکتے ہیں۔ پھر اگر عورت ان تینوں بڑی رکاوٹوں کو عبور کرتی ہے تو وہ کسی بھی ذاکر مرد سے آگے بڑھ جاتی ہے۔!

پیر کی حقیقت اور شناخت

جب ہم یہ دعا مانگتے ہیں کہ اللھم الھمنی رشدی واعزنی من شر نفسی' کہ اے اللہ مجھ پر خیر کا خیال الہام کر اور مجھے نفس کے شر سے بچا۔ چونکہ ابتدائے کار میں یہ آتنا آسان نہیں ہوگا کہ تمام نفس کے تجربے اور ٹیکنالوجی کو ایک آغاز کنندہ جانتا ہو۔ اسی طرح الہام خیر میں تفریق کرنا نہ کرنا یہ بھی کسی ماہر کا کام ہے' اس لیے ممکن ہے ہم سے آگے کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو انہی دونوں صورت حال میں نفس کے ماہر ہوں۔ ایک شر نفس کے اور دوسرے الہام خیر کے ماہر ہوں۔

''کشف المحجوب'' میں سیدنا ہجویرؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شیخ اپنے ایک مرید کے ساتھ جا رہے تھے۔ مرید کے دل میں خیال آیا کہ شیخ ننگے پاؤں چل رہا ہے۔ سردی بڑی سخت ہے۔ اگر میں اپنے گلے کا گلوبند اتار کر شیخ کے پاؤں میں لپیٹ دوں تو شیخ کے پاؤں بھی بچ جائیں گے اور مجھے ثواب بھی مل جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے دل میں خیال آیا کہ بھلا اتنے بڑے متقی' پرہیزگار اور مجاہد انسان کو میری پیشکش کہاں قبول ہوگی؟ یہ نہ ہو کہ کہیں شیخ جھاڑ دیں۔ اس نے کہا' کچھ اور آگے چل کر اس نے اپنے شیخ سے پوچھا' حضرت الہام اور وسوسہ میں کیا فرق ہے؟ فرمایا' جو تجھے پہلے آیا' وہ الہام تھا اور جو بعد میں آیا' وہ وسوسہ تھا۔

سو ہم سے بہتر کچھ لوگ ضرور ایسے ہوتے ہوں گے' جو نفس کی سائنسز کے ماہر ہوتے ہیں۔ پیر ہے بھی وہی' جو اس لیے خدا شناس ہے کہ وہ خود شناس ہے من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا' اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ جو اپنے آپ کو پہچانتا ہے' وہ آپ کے لیے ایک ایسا ماہر ہے کہ اسی قانون اور محرک میں چلتے ہوئے اس کی رہنمائی آپ کے کام آئے گی۔ اس سے آپ کو الہام کے انتخاب میں بھی مدد ملے گی اور آپ شر نفس سے بھی بچ سکیں گے۔

جیسے ایک شخص شیخ جنیدؒ کے پاس آیا اور کہا' اے جنید! مجھے نہیں پتہ' تجھے عبادات سے کیا ملا مگر میں نے تیرے چند ایک وظائف کیے ہیں۔ میں روز جنت کو دیکھتا ہوں اور وہاں جاتا ہوں۔ جنیدؒ نے کہا' اے مردود! تو جنت میں نہیں جاتا' تو عذاب دوزخ میں ہوتا ہے۔ اس نے باہر جا کر کہا جنیدؒ اتنا بڑا مرشد ہوتے ہوئے میرے تجربات نہیں حاصل کر سکا۔ اس لیے ہو سکتا ہے' مجھ سے حاسد ہو۔ کافی عرصے بعد کسی شخص نے جا کر اس سے کہا کہ تو جنیدؒ کا حکم ایک دفعہ مان تو لے۔ جو وہ

کہہ رہا ہے' کر لے۔اس میں ٹیسٹ بھی ہو جائے گا۔ چنانچہ اس رات جب اس کی جنت میں پیشی ہوئی اور اس نے ولا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا' تو آناً فاناً سحر ٹوٹ گیا اور اس نے دیکھا کہ وہ غلاظت کے ایک ڈھیر پر بیٹھا ہے۔

بعض اوقات ہمارے وجود میں ہماری اپنی اتنی پیچیدگیاں ہیں۔خود پسندی' خود ستائی' خودلذتی اور خودخیالی سے اس قسم کا مکروفریب جنم لیتا ہے کہ ہم اس کی مناسب طور پر توجیہہ نہیں کر سکتے۔نفسیات ہم میں سے بہت سوں کو اذیت پسند اور گھٹا ہوا قرار دے گی۔Neurotic یا Psychotic قرار دے گی۔اس کے باوجود ہم اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتے۔ہم میں سے کئی باوجود نفسیاتی مشکل کے اپنی ذات کے بارے میں اس کوفت سے آگاہ نہیں ہوتے' تاکہ کسی فوری مشکل کے باعث ہم کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس نہ چلے جائیں۔ وہ ہماری نشاندہی کرے کہ ہمارے باطن میں' ذہن میں' تھرمائنڈ یا فرسٹ میں یہ موجود ہے۔پیر دراصل روحانی سائیکاٹرسٹ ہے۔خیالات اور ذہن کے بعض شعبوں میں اپنے لوگوں کو یہ سکھا سکتا ہے کہ آپ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں نہ رہیں۔یہ بیلنس اور یہ عدم بیلنس ہے۔زمانہ قدیم کے سارے اولیاء اور سارے ہی پیر اس علم سے مختص تھے۔بدقسمتی سے آج آپ کو ڈھونڈنے پڑیں گے۔

پیر کی بیعت ضروری

جن صاحب نے یہ بات لکھی ہے' میں ان سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ غزالی کے پیر کا کیا نام تھا؟ تاریخِ تصوف میں حجتہ الاسلام محمد بن محمد الغزالی کے کسی مرشد کا کوئی ذکر نہیں۔ایک سیکھنے کا پراسیس ہے۔حجتہ الاسلام نے بہت سارے سبق سیکھے اور یہ بات انہوں نے نہیں کی۔اگر کہی ہے' تو پھر ان کے اپنے اوپر ہی صادر ہوتی ہے اور یہ بڑی السیائی سی بات ہوگئی۔

مگر سیّد اور غیر سیّد کی پہچان کے لیے میں آپ کو مختصر سی بات بتادوں کہ آئمہ تصوف میں حضرت حسن ابن علیؓ کے بعد خواجہ حسن بصریؒ ہیں' جو آزاد کردہ غلام اور سیّد بھی ہیں۔ان کے بعد حضرت سری سقطیؒ ہیں' جو آزاد کردہ غلام ہیں اور سیّد نہیں ہیں۔جنیدؒ بغدادی کو سیّد الطائفہ ضرور کہتے ہیں' یعنی وہ گروہ صوفیا کے سردار کہلواتے ہیں' مگر سیّد نہیں ہیں۔اب خواجہ ابوالفضل قطلی بھی سادات میں سے نہیں ہیں۔

جو معتدل قبضہ خیال ہے اس میں سیّد اور غیر سیّد کی ایسی کوئی تخصیص موجود نہیں ہے۔
اگرچہ سادات عالی قدر نے بڑے ولایت کے مقام پائے اور وہ بڑے نمایاں ہوئے مگر یہ تخصیص نہیں تھی کہ خدا نے صرف سادات کو اپنا اولیا مقرر کیا بلکہ کچھ گنہگار اُمتیوں کے ہاتھ بھی یہ نعمت آئی۔

مُرشد کی بیعت اور فیض

مُرشد لفظ بڑا کڑا ہے۔ اگر آپ اس کو سادہ سا لیں کہ تصوف سیکھنے کے لیے اسی طرح دو چار استادوں کی ضرورت پڑتی ہے' جیسے کہ باقی علوم ہیں۔ ہوسکتا ہے استاد سے آپ کو اصل علم حاصل نہ ہو' تو آپ زندگی میں ہی کسی دوسرے استاد سے علم حاصل کر سکتے ہیں۔ سیدنا ہجویرؒ نے اپنی کتاب میں بڑی اچھی طرح لکھا ہے کہ انہوں نے کم از کم 64' 65 استادوں سے کسب فیض کیا حالانکہ ان کی بیعت حضرت شیخ ابوالفضل قطلی سے تھی۔

کسی بھی جگہ فیض ہو' وہ حاصل ہوسکتا ہے اور کسی بھی ایسی جگہ خواہ کتنا ہی بڑا استاد سمجھ کر آپ اس کے پاس جائیں' فیض ہے ہی نہیں' تو کہاں سے حاصل ہوگا۔ کسی بھی فقیر یا مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ اللہ نے فقیر کو دعا کی حد تک بااختیار بنایا ہوتا ہے۔ اللہ نے فقیر کو سب سے بڑا جو ہتھیار دیا ہوتا ہے' وہ دعا ہے۔ اگر میری دعا سے امریکہ کا صدر مر جائے تو میرا خیال ہے میں اس سے زیادہ طاقتور ہوں۔ یہ درجاتی دعا ہے' جس سے ایک فقیر دوسرے فقیر سے ممتاز ہوتا ہے۔ کسی فقیر کے منہ سے نکلتے ہی سنی جاتی ہے۔ کسی کی ہفتے عشرے کے بعد' کسی کی سال کے بعد اور کسی فقیر کی سرے سے سنی ہی نہیں جاتی۔

پیر بھائی کے ساتھ دنیا و آخرت میں اُنسیت کا رشتہ ہوتا ہے۔ آپ دو انسانوں کے درمیان ایک ہی استاد سے اُنس ہوتا ہے۔ اگر میں گورنمنٹ کالج میں پڑھا ہوں' تو اسی کالج کا کوئی سابق سٹوڈنٹ دور سے دیکھے گا تو پکارے گا' ہائے کیا تم راوین ہو؟ میں کہوں گا کہ ہاں میں ہوں۔

ورنہ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایف سی کالج میں اکٹھے پڑھے ہوں تو ان میں اُنسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی خدا کے لیے کسی استاد سے پڑھے ہیں' تو قدرتی طور پر ذرا زیادہ اٹیچ ہو جاتے ہیں۔ یہ امن کی فضا ہے' جو دو شاگردوں میں قائم ہو جاتی ہے۔

مردِ مومن اور تبدیلی تقدیر

اگر آپ غور کیجیے' تو نگاہِ مردِ مومن سے کم سے کم برصغیر کے 48 کروڑ مسلمانوں کی تقدیریں بدل گئیں۔ ان اولیاء اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس کفرستان ہند میں اسلام پھیلا۔ اگر آپ باہر سے مسلمان حکمرانوں کی تعداد کو شمار کریں' تو بارہ ہزار ظہیر الدین محمد بابر کے ساتھ اور آٹھ دس ہزار محمد بن قاسم کے ساتھ آئے۔ اگر آپ یہ تعداد بھی شمار کر لیں تو بھی بے شمار لوگ جیسے بنگال' بہار اور انڈیا میں اور پاکستان کے مسلمان ہیں' تو آپ سوچ نہیں سکتے کہ نگاہِ مردِ مومن یعنی ان اولیائے اللہ تعالیٰ العزیز نے کس طرح برصغیر میں کتنے لوگوں کی تقدیر بدل دی ہے۔ فاسق و فاجر کو مسلم و مومن کر دیا ہے۔ شقی اور بد بخت کو سعید کر دیا ہے۔ اس سے بڑی تقدیر کی تبدیلی اور کیا ہو سکتی ہے۔

مجذوب اور عالم غیب

جو شخص اللہ کی توجیہات میں اپنے حواس خمسہ سے گزر جائے' اس کو ہم مجذوب کہتے ہیں۔ مجذوب ایک Abnomal Divine Experience میں ہوتا ہے۔ ایک مکمل مربوط سلسلہ اس کا قائم نہیں رہتا۔ ایک بہت بڑا الہیاتی صبر و تحمل جو اس کے لیے چاہیے' وہ اس میں نہیں رہتا۔ وہ الہیاتی تصوّر سے مغلوب ہو جاتا ہے اور حواس خمسہ سے گزر جاتا ہے۔ اسے ہم مجذوب کہتے ہیں جبکہ Sobriety یہ ہے کہ وہ لوگ علم و عقل' تدبر اور صبر سے ان کیفیات کی تعبیر کرتے ہوئے اگلی منزل کو بڑھ جاتے ہیں۔ اسی لیے جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ سکر کا ایک سمندر سہو کے ایک قطرے کے برابر نہیں ہوتا' جو اکیڈمک کی تخصیص کے ساتھ چلتا ہے۔ وہ ظاہر ہے' بڑا استاد ہوتا ہے۔

عارف تصوف میں سب سے بڑا مقام ہے۔ باطنی پیشین گوئیوں کے مقام کی تحصیل اور بدقسمتی سے اس میں جو چیک اور ججمنٹ کے عناصر لگانے چاہئیں' وہ ہم ان علامتوں پر نہیں

لگاتے۔ لوگ کسی کو آسانی سے مجذوب سمجھ لیتے ہیں اور اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں سے خود ہی کوئی نتیجہ اخذ کر کے اس کو جذب کی علامت کہہ دیتے ہیں۔

ادھر علماء ہیں کہ ان کو اس کیفیت سے شناسائی نہیں۔ اصل میں علماء کا ان کیفیات سے انکار کرنا ان کی بیچارگی کی علامت ہے۔ خواہش تو وہ بھی کر رہے ہوتے ہیں کہ اللہ انہیں بھی کوئی ایسی علامت دے دے اور اسی طرح کے وہ بھی دعوے کر سکیں مگر چونکہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی' ان کا علم ان کی مجبوری کی علامت بن جاتا ہے' اسی لیے وہ فتاوی لگانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مجھے ایک کام نہیں آتا اور دوسرے بندے کو آتا ہے' تو میں صبح و شام یہی کہتا ہوں کہ اس کو کام آتا ہی نہیں۔ یہ تو بالکل غلط ہے۔ علماء کو اس طرح کا کوئی ادراک حاصل نہیں ہوتا۔ اِس کیفیت کو جاننے کی وہ اہلیت نہیں رکھتے۔ سو وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔

دوسرا کسی مجذوب کو پرکھنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں' مگر ہاں جسے اللہ قائم کر دے۔ ایسے مجذوبین گزرے ہیں جنہیں اللہ نے قائم کیا' جو چوتھی جہت کی ایک واضح مثال تھے۔ اللہ نے انہیں بڑی ترقی و عظمت سے نوازا۔ ان میں بابا تاج الدین ناگپوریؒ ہیں۔ ابھی حال ہی میں باوا لال شاہؒ بری والے کنفرم مجذوب تھے۔

مجذوب کی پہچان کے لیے دس میں سے تین کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں ایک نفسیاتی ذہانت چاہیے۔ فرض کیجیے آپ ایک مجذوب کے پاس جاتے ہیں' اس سے ایک بات سچی نکل آتی ہے لیکن آپ کو شک سلامت رکھنا چاہیے۔ آپ دوسری مرتبہ جاتے ہیں اور پھر بات صحیح نکل آتی ہے۔ تو عمومی طور پر اس تمام گیس ورک میں دس میں سے تین صحیح نکل آتے ہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ آپ مجذوب کی پہچان میں ایک قانون معطل کرتے ہیں۔ اس قانون کو Suspension Of Disbelief کہتے ہیں۔ آپ اپنا احساس تنقید معطل کرتے ہیں۔

تنقید دو طرح کی ہے۔ ایک اللہ واسطے کی تنقید ہے' جو پاکستان میں ہر آدمی دوسرے پر کرتا ہے۔ میں اس کی بات نہیں کر رہا۔ میں علمی اور ذہنی تنقید کی بات کر رہا ہوں۔ جب آپ اسے پرکھنے کی کوشش کریں تو اس کو اسی طرح پرکھیں' جیسے آپ کسی کوالٹی کو جج کرتے ہیں۔ یہ نفسیاتی ٹیسٹ ہے۔ ہر آدمی اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔

مجذوب اور علمائے حقانی

فتنہ آخر زماں کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ حدیث کی رو سے علم اٹھ جائے گا اور علماء ظاہر مال و دولت کے لیے دین کو اختیار کریں گے۔ وہ عالم' جو دنیا کے لیے دین کو استعمال کرتے ہیں' اس کی مثال کُتے کی طرح ہے جس طرح علم اور علم دین استعمال ہو رہا ہے اور اس سے سیاسی' سماجی اور مالی فوائد حاصل کیے جا رہے ہیں' اس سے ظاہر ہے کہ اس میں خدا کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ علم کی بحیثیت دین حصول کی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ ایک علم برائے خدا ہوتا ہے ایک علم برائے علم ہے۔ ایک علم برائے دنیا ہے۔

اس وقت علم برائے دنیا بہت اچھا جا رہا ہے۔ لوگ اسے روزگار کے لیے پڑھتے ہیں' لیکن دوسری سطح پر علم برائے دین موجود نہیں۔ لوگوں میں کوئی تصور نہیں کہ میرا بچہ بڑا عالم بنے۔ دانشور یا بڑا سائنس دان بنے۔ ہر آدمی صرف پیسہ کمانے کی فکر میں علم حاصل کر رہا ہے۔ مشورہ ملتا ہے' اس شعبہ میں جائیں۔ اس سے پیسے زیادہ ملتے ہیں' رزق زیادہ ملتا ہے۔

علم برائے علم کا سلسلہ بھی ہمارے ہاں اچھا نہیں ہے۔ تیسری چیز تک ظاہر ہے' رسائی مشکل ہی ہوگی۔ وہ لوگ جن کی آپ بات کرتے ہیں' ان کا قرآن میں ذکر ہوا ہے۔ الرسخون فی العلم یقولون من عند ربنا' وہ علم میں راسخ ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے علم حاصل کرتے ہیں۔ اللہ ہی کے لیے حاصل کرتے ہیں اور اللہ ہی کے لیے اس کی ترویج کرتے ہیں۔ اس کو معاشرے کی بدقسمتی کہا جا سکتا ہے مگر مایوسی نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ ایسے بندے ضرور پیدا کرے گا جن سے جہان میں تبدیلی ہوگی۔ فی الحال خارجی حالات میں یہ چیز ذرا مشکل نظر آتی ہے۔ فارسی محاورے کے مطابق کسی اچھے چہرے کو مشاطہ درکار نہیں ہوتی۔ صفاتِ علیہ اور صفات حُسن میں ایک چیز بڑی مشترک ہے کہ جہاں ہو' وہاں سے ٹپک پڑتی ہے۔

حال پڑنے کی حقیقت

حال قدیم یونانی زبان میں' جس سے انگریزی نے یہ لفظ لیا ہے۔ Cathartic Processes کو کہتے ہیں۔ ایک لفظ میں اِسے Catharsis کہتے ہیں' جس کا مطلب ہے' اندر

رکے ہوئے مدتوں کے جذبات کا ایک جھٹکے سے اخراج۔ جب آپ کے سینے میں کوئی کیفیت بند ہوتی ہے' تو اس کو عام حالات میں انقباض کہتے ہیں۔ انقباض کا مطلب ہے' طبیعت کا قبض ہونا۔ جیسے کسی کو گیس کی تکلیف ہو' تو وہ اپنے اندر شدید گھٹن اور بے چینی محسوس کرتا ہے۔

جب یہی کیفیت ذہنی ہو' یعنی گھٹن اور ڈیپریشن میں اندرونِ ذات کا کھچا ہوا ہونا' تو ہم اسے انقباض کہتے ہیں۔ بالعموم انقباض کا کھلنا کسی جھٹکے' ردھم یا کسی اور صورت سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ قوال قوالی کر رہے تھے۔ جب انہوں نے یہ شعر پڑھا ؎

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو ان پر ایسی شدید کیفیت کا غلبہ ہوا کہ حضرت تین دن اسی حال میں رہنے کے بعد دنیا سے گزر گئے۔ عمومی حالات میں یہ فراڈ ہے۔ پیروں کے حلقے میں یہ گھڑی گھڑائی کہانی اور پہلے سے بنا ہوا ایک تماشا ہے۔ دو چار مقامات پر میں نے دیکھا کہ اشارۂ چشم سے حال پڑتا ہے۔ اگر مرشد گرامی موقع کو مناسب سمجھیں اور کیفیات کو پُر اثر بنانا چاہیں تو ایک ہلکے سے اشارے سے یہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی کیفیت کو ہم کنڈیشننگ کہتے ہیں۔ اگلا بندہ کنڈیشن ہو گیا ہوتا ہے کہ جوں ہی حضرت گرامی کا اشارہ ہو اور مجھے حال پڑ جائے گا۔

مگر اصلی حال خطرناک بھی ہوتا ہے' کیونکہ بعض اوقات انقباض اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس میں اچانک اخراج سے آدمی مر بھی سکتا ہے۔ دو چار ایسی یقینی شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں جہاں کچھ شیوخ اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایسے موقع پر قوال حضرات کو یہ کہا جاتا ہے کہ قوالی بند نہ کریں' جس ردھم پر یہ کیفیت پیدا ہوئی' اسی ردھم سے وہ کیفیت جائے گی اور ہلکی سی کم ہو گی۔ اگر خدانخواستہ اسی کیفیت میں اس نے ردھم بدل دی یا اسے روک دیا' تو انقباض اپنی شدید ترین صورت میں اس کے جسم میں دوبارہ وارد ہو سکتا ہے اور متعلقہ فرد کی ذہنی ناکارگی کا باعث بن سکتا ہے۔

آج کل کے زمانے میں حال کا کوئی اصلی رنگ نظر نہیں آتا بلکہ حال ہسٹریا سے بڑی مشابہت رکھتا ہے۔ خاص طور پر خواتین میں کسی بھی شدت جذبہ میں ہسٹریا واقع ہو سکتا ہے۔ وہ

ایک وقتی کیفیت ہوسکتی ہے، جو کبھی ریلیکس کی جاسکتی ہے مگر الٹے سیدھے نعرے لگانے اور عجیب و غریب حرکتوں کا اس میں کوئی جواز نہیں۔ کیتھارسس میں ہمیشہ Hypnoses (نظر کی عینک) کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ Hypnoses کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ آدمی Hypnotist ہوتا ہے بلکہ خود ایمائی سے اس پر اثر انداز ہوا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر ایک شخص کو کہا جائے کہ تم ہمارے سامنے بیٹھو۔ قرآن حکیم کی تلاوت کی جائے گی۔ اس سے یہ کیفیت تیار ہوگی تو قانون یہ ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے اپنا عقیدہ معطل کر دیتا ہے۔ جب وہ اپنا عقیدہ معطل کرتا ہے تو خود ایمائی اسے مکمل طور پر اپنے بس میں کر لیتی ہے اور اسے حال پڑ جاتا ہے۔ یہ ایک دوست کیس بھی ہوسکتا ہے۔

نماز اور اللہ کا ذکر

بڑے ادب کی پہچان یہ ہے کہ وہ نارمل کے قریب ہوتا ہے اور خدا کے سب سے قریب تر وہ ہے جو بڑا معقول ہو۔ اس لیے بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر کی صفت ادب اور صفت شاعری یہ ہوگی کہ وہ بڑا ہی قدرتی اور بڑا ہی نارمل ہوگا۔ اسی قسم کا ایک شعر جرأت کا ہے۔

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

ایک طرف وہ شاعر ہے جو بے چارہ چاہنے نہ چاہنے کے باوجود عذر تراش کے اپنے محبوب کے کوچے میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے۔ ٹھکانہ اور بہانے ڈھونڈتا ہے۔ ادھر آپ کے محبوب کا یہ عالم ہے کہ وہ زور ازاری کھینچ تان کر پانچ وقت آپ کو دن میں اپنے پاس بلاتا ہے۔ اپنی گلی کی آواز دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ کسی طریقے سے اس کی گلی میں آ جائیں۔ آپ اسے نہ دیکھیں وہ آپ کو دیکھ لے تاکہ آپ کی بخشش اور رحمت کا کوئی سبب پیدا ہو سکے۔

ہمارے بازار ہمارے گھر اور ہماری محبتیں غیبتوں شکایاتِ زمانہ اور گلہ دوستاں سے پر ہوتی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جو شیطان کی ہمسائیگی میں صرف نہ ہوتی ہو۔ لے دے کے ایک نماز بچتی ہے جہاں انسان اپنے وجود معاشرے اور اپنے خیال سے کٹتا ہے۔ چاہنے نہ چاہنے کے باوجود وہ ایک خدا کے حضور میں آ کے کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس سے زیادہ برالمحہ شیطان کے اوپر کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ دفتر بازار چھت یا گلی میں وہ آپ کو کہیں تنگ نہیں

کرے گا مگر جب آپ حضور خداوند کھڑے ہوں گے' تو وہ ضرور آپ کو تنگ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ آپ سے پہلے والوں کے ساتھ بھی ایسے ہی کرتا رہا ہے۔ اگر وسوسہ نہ آئے' تو پھر چونکنا پڑے گا کہ شیطان کو میری کون سی ایسی ادا پسند ہے کہ وہ مجھے فریب دینے کے لیے یہاں تک ابھی نہیں پہنچا۔ ضرور ہے کہ وہ آپ کو بھلا بیٹھا ہے۔

مستقلاً نماز کے دو بڑے خطرات ہوتے ہیں۔ ایک بڑا خطرہ اس ذہین شخص کا ہے' جو نماز پڑھتے ہوئے اکثر یہ بات کہتا ہے کہ اس نماز کا کیا فائدہ' جس میں خلوص ہے نہ قیام ہے۔ مجھے کبھی ایسی کوئی حقیقت نصیب نہیں ہوئی ہے' نہ کبھی اشارۂ خداوند یا کنایہ حقیقت ہوا۔ ایسی نماز پڑھنے کا کیا فائدہ؟ میں تو نماز اس وقت پڑھوں گا' جب میرا دل اور میرا دماغ چاہے گا جب میں پورے خلوص کے ساتھ پڑھنے کی پوزیشن میں ہوں گا۔

یہ سوچ غلط ہے۔ نماز میں کوئی تخصیص اللہ نے نہیں رکھی۔ اس نے بار بار ایک ہی لفظ استعمال کیا کہ نماز میں اقامت رکھو۔ اس کا قیام نہ چھوڑو۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام میں جو کریڈٹ رکھے ہیں' اس میں سب سے بڑا آپ کو کریڈٹ یہ دیا ہے کہ آپ چاہو یا نہ چاہو' اگر پانچ وقت کے لیے خدا کے حضور کھڑے ہوں گے تو اس کو بہانہ بخشش مل جاتا ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

قرآن حکیم میں نماز کی منطق یہ بتائی گئی اتل ما اوحی الیک من الکتاب (پ ۲۱' س العنکبوت' آیت ۴۵) کہ کتاب کی تلاوت کرو' قرآن پڑھو۔ قرآن پڑھنے سے آپ کو اوامر ونواہی کا علم ہو جائے گا۔ آپ کو صاف پتہ چل جائے گا کہ خدا کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ جب آپ کو پتہ لگ گیا کہ خدا کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا' تو ذہن انسانی یہ اختراع تو نہیں پیدا کر سکتا کہ خدا ہم سے گناہ یا غلطی کراتا ہے۔ قانوناً اور اصولاً خدا پر اس قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ جو وہ چاہتا ہے' اس نے قرآن میں لکھ دیا ہے۔ اس کے بعد کم از کم نہیں چاہے گا جو آپ کرتے پھرتے ہیں یا جو آپ کا دل اور خواہش چاہتی ہے۔ اس نے قرآن میں لکھ دیا واقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (پ ۲۱' س العنکبوت' آیت ۴۵) کہ یہ نماز تمہیں منکر اور انکار خداوند سے روک دے گی۔

ایک شخص جو پانچ وقت نماز پڑھتا ہے' ظاہر ہے کہ وہ دہریہ نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ نہیں کہہ

سکتا کہ خدا نہیں ہے۔ وہ منافق ہو سکتا ہے کہ نماز پڑھ کر صرف آپ کو دھوکہ دینا چاہتا ہو۔ ورنہ نماز پڑھتا ہوا انسان خدا کا منکر نہیں ہو سکتا۔ چاہے خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھے' چاہے ویسے پڑھے۔ باوجود نہ چاہنے کے ایک شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے' تو یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک بڑے افسر کے سامنے چھوٹا افسر مجبوراً اس کا حکم مان رہا ہوتا ہے۔ ممکن ہے' دل میں اسے دو چار صلواتیں بھی سنا رہا ہو کہ اس کم بخت نے کوئی لمحہ میرے لیے خیر کا نہیں چھوڑا۔ مجھے آرام کرنے دیتا ہے نہ چین لینے دیتا ہے مگر مجبوری ہے کہ اس کا کام ضرور کرنا ہے۔

رب کریم نے اقامت کی شرط اس لیے لگا دی کہ انسان کا ٹمپر بڑا تغیر پذیر ہے۔ وہ کبھی چاہتا ہے کبھی نہیں چاہتا۔ تمہیں سستی پڑ جاتی ہے' کبھی حماقت لے بیٹھتی ہے۔ کبھی کوئی اور مصروفیت اس پر غالب آ جاتی ہے' چنانچہ زندگی میں ہر دوسری ترجیحات میں وہ نماز سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز کا قائم کرنا ترجیح اول کو قائم کرنے کے برابر ہے۔ یہ اس چیز کی شہادت ہے کہ خدا آپ کے نزدیک سب سے زیادہ اہم وجود اور اہم شخصیت ہے اور آپ اس کو یہی ماننے والے ہیں۔

اس کے بعد اللہ نے کہا' ولذکر اللہ اکبر (پ ۲۱' س العنکبوت' آیت ۴۵) بہت سارے اکیڈیمک کے لوگ جب ہمارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو اچھے کاموں کو بھی یاد خدا سمجھتے ہیں۔ کچھ صاحب کہتے ہیں' ہم خلق خدا کی خدمت کو بھی نیک کام اور ذکر خدا سمجھتے ہیں۔ کچھ فرماتے ہیں کہ قرآن بھی ذکر ہے' نماز بھی ذکر ہے۔ تسبیح کی خاص طور پر اتنی زیادہ اہمیت کیوں بتائی گئی ہے؟

یہ سچ ہے کہ قرآن ذکر ہے نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون (پ ۱۴' س الحجر' آیت ۹) ہم نے اس ذکر کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں' پھر خدا نے نماز کے بارے میں کہا' واقم الصلوٰۃ لذکری' نماز میری یاد کے لیے قائم کرو۔ قرآن بھی یادِ خدا ہے' نماز بھی یادِ خدا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت میں تینوں چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا اتل ما اوحی الیک من الکتاب یہ ذکر بھی پڑھو۔ ایک ذکر کرنے والا ہے' ایک ذکر پڑھنے والا ہے۔ یہ ذکر بھی پڑھو۔ اس سے اوامر و نواہی کو خوب اچھی طرح جانو و اقم الصلوٰۃ اور نماز قائم کرو کہ یہ ذکر تمہیں فحش و منکر سے روک دے گا و لذکر اللہ اکبر مگر اس کے علاوہ کوئی ایسی یاد ہے' جو ان یادوں سے بڑی فضیلت رکھتی ہے۔ یہ وہ یاد ہے' جو قرآن نہیں ہے' نماز نہیں ہے ولذکر

اللہ اکبر مگر میری یاد! یہ تو بہت بڑی بات ہے:

پروردگارِ عالم نے پورے قرآن حکیم میں کچھ چیزیں درجہ بدرجہ رکھی ہیں۔ مثلاً اگر بدلہ برابر لے لیں، تو بہت اچھی بات ہے۔ ہم آپ کو بالکل نہیں منع کرتے۔ آپ کا حق ہے بدلہ لینا اور فرمایا کہ بدلہ لینا اتنا مناسب ہے کہ قیامت کے دن جب ہماری عدالتِ عدل سجے گی، تو حدیث مبارک کے مطابق ہم بے سینگ کی بکری کو سینگ والی سے حساب دلائیں گے۔ تو احتساب اور عدل اتنا جذباتی نگرانی کا ادارہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تینوں چیزوں میں اتنی وضاحت سے فرق کیا اور والذکر اللہ اکبر کے بعد ایک چھوٹا سا جملہ ارشاد فرمایا ہے واللہ یعلم ماتصنعون (پ ۲۱، س العنکبوت، آیت ۴۵) میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم اپنے اندر کیا رکھتے ہو۔ آپ کا مزاج، آپ کا خیال کیا چیز اندر بنتا رہتا ہے۔ تصور کیا بنتے اور گھڑتے رہتے ہو۔

قرآن یا نماز پڑھنا کچھ ضابطوں اور قاعدوں میں قید ہے۔ مثلاً آپ قرآن بے وضو ہو کے نہیں پڑھ سکتے۔ چلتے پھرتے دو چار آیات تو آپ پڑھ سکتے ہیں، مگر پورے قرآن حکیم کی تلاوت آپ بے وضو نہیں کر سکتے۔ اسی طرح نماز بے وضو نہیں پڑھ سکتے۔ پھر نماز کے کچھ قاعدے اور کچھ قانون ہیں۔ کس طرح کھڑا ہونا ہے۔ کس طرح ہاتھ باندھنے ہیں۔ اٹھنا اور بیٹھنا ہے۔ حضور خداوند میں اس کا طریق متعین ہے اور آپ اس متعینہ طریق پر چلتے ہیں۔

جب خدا برابر کے بدلے کی بات کرتا ہے، تو وہ آپ کو گنجائش دیتا ہے کہ برابر کا بدلا لو اور اگر معاف کر دیں، تو بڑی بات ہے۔ کچھ باتیں اللہ نے سابقون السابقون کے لیے رکھی ہیں۔ کچھ لوگ رستہ ماپنے والے ہیں کہ وہ اپنی مقدار اوسط سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے، جن کے دل میں خدا کا خلوص اور محبت زیادہ ہوگی۔ کچھ لوگ وہ ہوں گے، جو زندگی کے حقائق پر نگاہ مارنے کے بعد اس چیز کے قائل ہو ہوں ہیں کہ متاع الدنیا قلیل (پ ۵، س النساء، آیت ۷۷) دنیا قلیل ہے۔ لہو و لعب ہے۔ بے مقصد ہے۔ دنیا محض ایک سفر کا وقفہ ہے۔ ان ساری چیزوں کو یکجا کرنے کے بعد جو اس سراب سے آگے بڑھتے ہیں، انہیں حقیقت صرف اللہ میں نظر آتی ہے۔ وہ خدا سے زیادہ محبت کرنے والے، انس رکھنے والے اور زیادہ قائل ہو جانے والے ہو جاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بندہ ایسا ہوتا ہے، جو اپنے محبوب کے قرب کے لیے کسی بہتر صورتحال کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب ایسے لوگ اللہ کی نظر میں آئیں، تو آپ نے فرمایا ولذکر اللہ اکبر۔

اطمینانِ قلب کی تلاش

ہم تمام اطمینانِ قلب کو تلاش کرتے ہیں۔ کئی جتن کرتے ہیں۔ سکون چاہتے ہیں، مگر سکونِ قلب نہیں ملتا۔ سکونِ قلب لڑکیوں میں ہے؟ لڑکوں میں ہے؟ ایک مکان میں یا جائیداد میں ہے؟ سکونِ قلب سکیورٹی میں ہے؟ دس سال کے پیسے نہ پڑے ہوں، تو سکون قلب نہیں ہوتا؟ سارے بچے کام کاج پر لگے ہوں، تو سکونِ قلب ہو جاتا ہے؟ یعنی سکونِ قلب کی وضاحتیں ہمارے پاس جدا جدا ہیں۔ مگر آپ اللہ کی تو سنتے ہی نہیں ہیں۔ آپ کو اگر خدا پر اعتبار ہوتا، تو وہ تو سکونِ قلب کا بڑا ہی آسان نسخہ دے رہا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب کہ اطمینان قلب میری یاد کے بغیر ممکن نہیں۔ پیسے مل جائیں گے۔ مکان اور اولاد مل جائے گی۔ سب کچھ مل جائے گا۔ خبردار! سن لو کہ ایک چیز نہیں دوں گا الا بذکر اللہ تطمئن القلوب کہ تمہیں اطمینانِ قلب صرف میری یاد سے ملے گا۔

یہ دَور خوف اور فرسٹریشن کا دَور ہے۔ اداسیاں بکھری ہوئی ہیں۔ مسائل کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ غم والم کربلائے زندگی ہے۔ یہ زندگی نہیں ہے۔ اس میں آپ کو اطمینان بھی چاہیے۔ آزادی اور خوف وحزن سے فراغت بھی چاہیے۔ پھر بھی آپ اللہ پر نہیں اعتبار کرتے ہو۔ پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟ یہ دنیا بھول بھلیاں کی دنیا ہے۔ اس میں جو گھستا ہے، اسے واپسی کا رستہ نہیں ملتا۔ ایک خواہش کے بعد دوسری کا سراب شروع ہو جاتا ہے۔ ایک اداسی کے بعد دوسری اداسی۔ کب انسان کا پیٹ بھرا؟ کب اسے اطمینان نصیب ہوا؟ کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ تو صرف اللہ کے پاس ہے اور فارمولا اس نے آپ کو دے دیا الا بذکر اللہ تطمئن القلوب جب آپ خدا پر اعتبار کرتے ہیں۔ دل کا اطمینان اور ذہن کا سکون چاہتے ہیں، تو آپ کو خدا کی طرف پلٹنا ہوگا۔

بعض لوگ بڑے ضدی ہوتے ہیں۔ میتھوڈسٹ ہیں۔ کہتے ہیں، نماز پڑھ لیں، بہت ہے۔ میں بھی کہتا ہوں، پڑھ لیں۔ بہت ہے۔ مگر نماز کا مقصد کوئی ہونا چاہیے۔ روزے رکھو، ضرور رکھو۔ افعال کو شریعت کہتے ہیں۔ نجات کو طریقت کہتے ہیں۔ طریقت شریعت کی نیت ہے۔ اگر اعمال ظاہرہ عبادات ہوں۔ اگر آپ خدا کے لیے نہیں کر رہے۔ کوئی احساس ہی آپ کے دل میں خدا کا نہیں ہے، تو یہ اعمال شریعت کولہو کے بیل کی طرح ہیں۔ گھومتے رہیں گے، پھرتے رہیں

گے۔کوئی ثواب اور کوئی ٹیسٹ نہیں ملے گا۔خدا نہیں ملے گا۔

طریقت اور شریعت جدا نہیں ہیں۔اعمال کی نیت کو طریقت کہتے ہیں۔اگر آپ نے اپنے اعمال ضائع نہیں کرنے' تو کم از کم ایک نیت شامل کر لیا کریں کہ اے پروردگار! یہ نماز صرف تیرے لیے ہے۔سست اور بے کار بہت ہوں۔قطعاً دل نہیں چاہتا نماز پڑھنے پر۔بس میں ہو' تو سب سے پہلے یہ ترک کروں۔مگر تیرے لیے یہ کوفت سہہ رہا ہوں۔اٹھ رہا ہوں۔اداس ہو رہا ہوں۔مگر تیرے لیے۔دیکھو! آپ کا خدا پر دباؤ بڑھ جاتا ہے۔آپ اس کی کورٹ میں بال پھینک دیتے ہیں۔آپ کو کیوں مجبوری ہے؟ کیوں آپ اللہ کے دباؤ میں ہیں؟ دو چیزیں ہیں' جن سے آپ کا دباؤ اللہ پر بڑھتا ہے۔آپ کا حق اللہ پر فائق ہوتا ہے۔اللہ میاں تخلیق سے پہلے کتاب میں لکھ بیٹھے ہیں' آپ سے وعدہ کر کے کنٹریکٹ لکھ دے چکے ہیں کہ **کتب علی نفسہ رحمة**' ہم تم پر بڑی مہربانی' بڑا رحم کریں گے۔کمال کی بات ہے کہ انسان اپنے حقوق کا استعمال نہیں جانتا۔

دوسری جگہ اللہ میاں کہتا ہے' دیکھو! تم کنٹریکٹ کو استعمال کرو۔میں پابند ہوں۔مگر اگر تمہاری رجعت ہی میرے پاس نہیں ہے' تو میں آزاد ہوں۔کنٹریکٹ یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر گناہ و آلام اور بندشوں کے باوجود اگر تم ہماری طرف رجعت کرو گے' تو میں تمہیں معاف کرنے کا پابند ہوں اور اگر تم رجعت نہیں کرو گے' تو پھر میں آزاد ہوں۔فرمایا **کل یا عبادی الذین اسرفو علی انفسھم** دیکھو! میرے سارے بندوں کو یہ میرا اعلان سنا دو۔شہنشاہ معظم' صاحب افلاک' صاحب کائنات یہ اعلان فرماتے ہیں **قل یا عبادی الذین اسرفو علی انفسھم** میری طرف سے ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو بڑا گنہگار سمجھتے ہیں۔بھرپور احساس گناہ میں مبتلا ہیں۔ان میں گلٹ در گلٹ سلسلہ چلتا آ رہا ہے۔بھئی ہو گئے' سو ہو گئے۔اللہ کہتا ہے' ہو گئے سو ہو گئے۔تم غلطی کر بیٹھے۔اللہ گناہ کو گناہ ہی نہیں کہتا' اسراف کہتا ہے۔

عقل میں نے تمہیں اپنے لیے دی تھی' تم نے سول سروسز پر لگا دی۔روٹیاں کمانے پر لگا دی۔اسراف کیا تم نے۔قرآن کی ہر اصطلاح انٹلکچوئل اصطلاح ہے **قل یا عبادی الذین اسرفوا** مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔اللہ کہتا ہے' تم نے اپنے آپ کو فضول خرچا۔ایک بڑی غلطی میں کر بیٹھا۔اب اللہ میاں خبردار کر رہا ہے۔گناہوں اور خطاؤں کے باوجود پہلے سے اس نے یہ تسلیم

کرلیا کہ تم نے بڑی حماقتیں کیں۔ بڑی غلطیاں کیں اور کہا' بڑی بیزاری سے کہہ رہا ہے۔ کیونکہ یہاں اسے کچھ دینا پڑتا ہے۔تم نے بڑی زیادتیاں کیں۔مگر ایک غلطی نہ کرنا لا تقنطو من رحمة الله جو کنٹریکٹ لکھا ہوا ہے۔ میں نے تمہیں لکھ کے دیا ہوا ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔

جس شخص نے یہ کہا کہ میرے گناہ اتنے ہیں کہ اللہ اسے نہیں بخشتا' اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔اس لیے کہ گناہ لوکل ہے۔ آدمی لوکل ہے۔عقیدہ ٹمپریری ہے۔انفرادیت مختل ہے اور جو ہماری حریف ہے' رحمت بیکراں' وہ کائناتی ہے۔کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا۔ایک چھوٹی سی چیز' چھوٹی سی خطا کا اس بیکراں وسعت رحمت سے کیا مقابلہ ہے؟ میں اگر نالائقی سے اٹھ کے بیان دے دوں کہ اے میرے ربّ! میں بڑا گناہگار ہوں' تو کیا اللہ مجھے معاف نہیں کرتا۔خدا کہتا ہے' تو نے بڑے گناہ کیے ہیں۔ٹھیک ہے۔مگر ایک آخری گناہ نہ کر بیٹھنا لا تقنطو من رحمة الله پھر دُہرایا' اپنے عہد و پیمان کو انسان کے لیے ان الله يغفر الذنوب جميعا ان اللہ میں بڑے راز پوشیدہ ہیں۔حتمی اور فائنل بیان ہے ان الله يغفر الذنوب جميعا ذرا اٹرم دیکھئے جمیعا یعنی ٹوٹل۔اگر انگریزی میں اس کا ترجمہ کریں' تو سوائے لفظ Totality کے اور کوئی استعمال نہیں ہوتا All ٹوٹل۔

البتہ اگر گناہ معاف کرنے والے کو پتہ ہی نہیں۔فرض کریں' آپ اس کو ہی نہیں جانتے۔جیسے ایک ہندو ہے۔ساری زندگی نیکیاں کرتا ہے۔اللہ میاں پوچھیں گے' تم کس سے ثواب مانگنے آئے ہو؟ کس سے کیا مانگنے آئے ہو؟ آپ نے لیڈی گنگارام ہسپتال بنایا۔ بہت خوب' بہت اچھا کیا۔مگر صلہ کس سے مانگنے آئے ہو؟ شیوا سے؟ وشنو سے؟ برہما' سرسوتی' کالی اور درگا سے؟ کس سے مانگنے آئے ہو؟ اگر وہ اللہ کو جانتا نہیں' مانتا نہیں ہے' تو اللہ کو کیوں قید کیا جائے کہ وہ ضرور ان کو صلہ دے۔

ذکر اللہ کی فوقیت

میں نے ذکر کی قرآن پر فضیلت ثابت نہیں کی' بلکہ اعلیٰ ترین قدم ہر وقت اللہ کی یاد میں مصروف رہنا ہے۔اس سے نہ قرآن نہ نماز کی اہمیت کم ہوتی ہے۔قرآن اور نماز بنیادی ادارے ہیں۔ایک شخص جو خدا کو یاد کر رہا ہے' اگر اس سے پوچھا جائے اور اللہ ہی اس سے پوچھ

لے کہ تسبیح تو تو بڑی پڑھ رہا ہے' لیکن چھوٹا سا حکم تو میرا تجھ سے مانا نہیں جاتا۔ یہ وہ حکم ہے' جو میں نے سب کے لیے کامن دیا ہے۔ وہ تو تو مان نہیں رہا' مجھے تسبیح پڑھ پڑھ کے کیا دکھا رہا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اور قرب سے وہی آشنا ہوگا' جو قرآن اور نماز کے بعد بھی خدا کو اضافی وقت میں یاد کرے گا۔

یاد کو اس لیے بڑا کہا گیا ہے کہ قرآن کو بغیر وضو آپ ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ جبکہ نماز کے لیے ایک فارمیٹ اور طریق کار ہے۔ اس کے بغیر آپ نماز نہیں پڑھ سکتے۔ لیکن انسان چوبیس گھنٹے اس پیٹرن میں نہیں رہتا۔ اس لیے خدا نے ایک ایسی چیز عطا کر دی' جس کو ہر حال میں ہر آدمی ہر طریقے سے پڑھ سکتا ہے فذکر اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم کھڑے یاد کرو' بیٹھے یاد کرو' کروٹوں کے بل یاد کرو۔

حضرت یونس متی کے بارے میں اللہ نے کہا کہ اگر یونس تسبیح کرنے والا نہ ہوتا' تو قیامت کے دن بھی مچھلی کے پیٹ سے ہی اٹھتا۔ یہ بھی قرآن نے کہا کہ یہ وہ ذکر ہے' جو پیغمبروں کا فیورٹ ہے۔ حضور رسالت مآبؐ سوئے ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پاس بیٹھے تھے۔ دو عجیب لوگ آئے۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ دیکھو کتنا عجیب مرد ہے! اس کی آنکھ سوتی ہے' مگر اس کا دل اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسا تسلسل ہے' جس میں مراسم' مناسب اور تکلفات حائل نہیں ہوتے۔ آپ کسی حال میں بھی ہوں' اللہ کو یاد کر سکتے ہیں۔ اسی لیے اس کی اہمیت بڑی ہے۔

مصیبت اور اطمینان قلب

لا یکلف اللہ نفس الا وسعھا کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بھی بیان عملی نہیں' نفسیاتی ہے۔ کیونکہ اللہ نے انسان کو بنایا ہے۔ بنانے والے سے زیادہ اپنی مشین کو کوئی نہیں جانتا۔ ہر انسان کو انفرادی طور پر خدا جان رہا ہوتا ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہو' تو ذرا سی مصیبت سے گھبرا کے میں کہہ سکتا ہوں کہ اے میرے پروردگار! مجھ میں صبر نہیں ہے' طاقت نہیں ہے۔ مجھ سے یہ ابتلا اور مصیبت اتار دے۔ اللہ اپنی مشین کی استعداد سے واقف ہے۔

بالعموم خالق ایک مشین پر لکھ دیتا ہے کہ یہ کتنے ہارس پاور ہے۔ اتنی اس کی پاور لینے کی ہے۔ اتنا بوجھ یہ اٹھا سکتی ہے اور اتنا اس سے زیادہ نہیں اٹھا سکتی۔ ہمارا یہ حال ہے کہ اس نازک ننھی

مِنی سوزوکی کو جو جاپان نے مخصوص مقاصد کے لیے بنائی تھی، ہم کسی گدھے سے بھی بدتر استعمال کرتے ہیں۔ ہم اس کو اوورویٹ کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اچانک جواب دے جاتی ہے۔ گاڑی میں اس کا کوئی نقص نہ تھا۔ جب بنانے والے نے اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں رکھی کہ وہ اتنا بوجھ اور وزن اٹھا سکے۔ اس سے زیادہ ڈالیں گے، تو انجن چوں چراں شروع کر دے گا اور بالآخر ختم ہو جائے گا۔ پانچ سال کی زندگی، جو اس کی ریکارڈڈ ہے، وہ آدھے سال میں ختم ہو جائے گی۔

اب انسان کا یہ حال ہے کہ مصیبت اسے ہر حال میں دیکھتی ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ ہم ہر انسان کو خوف، بھوک، نقص اموال، کیفیات ذات اور مال و اولاد کے نقصان سے آزمائیں گے اور اللہ کہتا ہے کہ آپ کو اس مصیبت سے نجات نہیں ہوگی، سوائے ایک طریقے کے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ جونہی کوئی بلا آپ تک پہنچے، فوراً سرِ تسلیم خم کیجیے اور کہہ دیجیے کہ اے پروردگار! میں تیرا عندیہ سمجھ گیا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ تو نے بلا بھیجی ہے۔ اس کو تو اس وقت ہی لوٹائے گا، جب میں انا للہ و انا الیہ راجعون کا مفہوم پورا کروں گا۔ آپ نہ کہیں گے، تو آپ کی مصیبت اور لمبی ہو جائے گی۔ جس دن آپ نے بڑی تسلی سے کہہ دیا اے پروردگار! ٹھیک ہے، یہ تمہاری طرف سے آئی ہے، تمہاری طرف ہی لوٹ جائے گی۔ میں نے اسے قبول کیا اور تجھ سے رحمت اور بخشش کی امید رکھی۔ یہ ایسی انٹلکچوئل اپروچ ہے کہ پروردگار کہتا ہے نہ صرف یہ کہ میں اس کی مصیبت دُور کروں گا، بلکہ میں اس کو ایک صحیح انٹلکچوئل جانتے ہوئے اولئک علیھم صلوٰۃ من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون میں ان پر دائمی درود و سلام اور اپنی رحمت بھیجوں گا۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں، جو بجا طور پر حقیقت کو سمجھتے ہیں۔

انسان کا عجلت کا ایک طریقہ ہے۔ چونکہ اس نے پہلے اس نوعیت کی مصیبت برداشت نہیں کی ہوتی، اس لیے مصیبت آتے ہی وہ چیخ و پکار میں لگ جاتا ہے کہ مجھ میں برداشت نہیں۔ میں مر رہا ہوں۔ میں جا رہا ہوں اور خدا اس پر ہنس رہا ہوتا ہے کہ میں نے تجھے اتنی زیادہ استعدادی ہے۔ ابھی تو اس کا آغاز ہی نہیں ہوا کہ تو نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ پھر جن لوگوں پر مصیبت آئی اور وہ زیادہ چیخے چلائے، ان کا خیال تھا کہ ہم ایک دن بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے ایک سال وہی مصیبت برداشت کی۔ اس لیے کہ انہیں یہ تمام تکلیف برداشت کرنے کی اپنی استعداد کا

اندازہ نہیں تھا۔لیکن خدا جانتا تھا۔اسی لیے وہ مصیبت ان پر ایک وقت ٹھہری اور اس کے بعد ان کو ریلیف دیا گیا۔

یہاں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ عذاب اور آزمائش میں تھوڑا سا فرق ہے۔عذاب کی کیفیتوں میں سکون نہیں۔عذاب بہر حال ایک سزا ہے۔مگر سزا کیوں ہے؟ قرآن حکیم میں اللہ نے فرمایا مایفعل اللہ بعذابکم مجھے کیا پڑی ہے کہ تمہیں عذاب دوں وان شکر تم وامنتم اگر تم میری یاد والے ہو اور ایمان والے ہو تو مجھے کیا ضروری ہے کہ میں تمہیں عذاب دوں گا کان اللہ شاکر آ علیما یہ بڑا اہم اور ایک سائنسی قانون ہے جو اللہ نے قرآن میں دیا ہے کہ اگر آپ کسی تکلیف دُکھ یا عذاب کا درد محسوس کر رہے ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ کیوں ہے اور آپ کو خدا کا یہ قانون پتہ ہو مایفعل اللہ بغدابکم ان شکر تم وامنتم تو آپ یقین جانیئے کہ جب آپ شکر شروع کریں گے اور اللہ کو یاد کرنا شروع کریں گے تو آپ کا وہ عذاب ٹل جائے گا۔یہ تمام مبادلاتی اور سائنسی قانون ہے کہ عذاب خدا کی یاد کی مقدار اور گہرائی کے مبادلے کے ساتھ وابستہ ہے۔

آپ کے ایمان کے ساتھ ایک مبادلے کی صورتحال ہے۔جہاں شکر اور یاد کم ہوگی وہاں عذاب ہوگا۔آج کل آپ کے معاشرے میں ایک بہت بڑا عذاب آیا ہوا ہے۔ہر آدمی کثرت سے یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ میری ناکامی کی وجہ یہ تعویذ ہوگیا۔وہ سایہ ہوگیا۔یہ جادوگری ہوگئی۔یہ ہوگیا وہ ہوگیا۔سوال یہ ہے کہ یہ کیوں ہوگیا؟ یہ تو ہونا ہی ہے۔تعویذ تو ہونے ہی ہیں۔تعویذ اور جادو باہر سے نہیں ہو رہا۔یہ بھی پروردگار عالم نے ایک بڑا سادہ سا قانون بنایا ہے ومن یشع عن ذکر الرحمن کہ جو ذکر رحمن سے غافل ہوا نقیض لہ شیطان ہم اس پر ایک شیطان کو غلبہ دیتے ہیں وھو لہ قریب وہ اس کے قریب رہتا ہے۔اگر آپ اللہ کے ذکر سے غافل ہوں گے تو یقیناً کوئی شیطان آپ پر غالب ہو جائے گا۔

ایک اور بات پر غور کیجیے کہ کتنے آسان نسخوں کو ہم بھلائے رہتے ہیں۔پروردگار عالم نے ایک قانون دیا ہے۔قرآن حکیم میں فرمایا علی بذکر اللہ تطمئن القلوب یہ لاء ہے قانون ہے۔خبردار کر کے کہہ دیا کہ میری یاد کے بغیر تمہیں دل کا اطمینان نہیں ملے گا۔باقی مل سکتے ہیں۔جسمانی سکھ مل سکتا ہے۔پسند کی بیوی مل سکتی ہے۔عہدہ مل سکتا ہے جس کے لیے آپ نے

جدوجہد کی۔ مگر اگر تم پوری زندگی بھی جدوجہد کرو گے' تو میری یاد کے بغیر تمہیں اطمینانِ قلب نہیں مل سکتا۔ اگر ہمارا خدا پر یقین واعتقاد ہے اور جب میرے پروردگار نے مجھے اور آپ کو یہ بتادیا ہے' تو پھر یہ بتائیے کہ کون ایسا شخص ہے' جسے اطمینانِ قلب کی ضرورت نہیں۔

اگر ہم سب کو اس کی شدید ضرورت ہے' تو اطمینانِ قلب کا واحد اصول اللہ نے یہ بتایا ہے کہ یہ میری یاد ہے۔ اس کے سوا میں تمہیں کسی قیمت پر اطمینانِ قلب نہیں ہونے دوں گا۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور رستہ آپ کو نظر آتا ہے؟ کیا خدا کی یاد کے بغیر آپ اطمینانِ قلب حاصل کر سکتے ہیں؟ اس کے باوجود انسانی ضد کا یہ حال ہے کہ وہ ذکر وتسبیح اور یادِالٰہی سے گریز کرتا ہے اور پھر بھی اطمینانِ قلب ڈھونڈتا ہے۔ تمنائے حیات جاوداں کو لیے پھرتا ہوں دنیائے فنا میں۔

یہ اطمینانِ قلب کس نوعیت کا ہے؟ اللہ نے بات بالکل واضح کر دی ہے کہ میں اپنے دوستوں پر سب سے بڑا انعام دو صورتوں میں کرتا ہوں۔ جب کوئی میرا دوست بنتا ہے تو الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون تو میں ان کے دلوں سے خوف اور انتشار ختم کر دیتا ہوں۔ عجیب بات ہے کہ پندرہ سو برس پہلے اللہ نے وہ دو لفظ استعمال کیے' جن کے مساوی آج ہمارا سوشل سیٹ اپ ہے۔ تمام سوسائٹی صرف ان دو لفظوں کی زد میں ہے۔ یہ خوف اور فرسٹریشن کا ڈر ہے۔ ایک بچے سے لے کر کسی بڑے بوڑھے تک ہم انہیں ہر دو چیزوں میں مبتلا پاتے ہیں۔

اللہ آپ کو وعدہ دے رہا ہے کہ میں اپنے دوستوں کو خوف وحزن سے بے نیاز کر دیتا ہوں۔ یہ ہمارے لیے ایک اچھا چانس ہے کہ ہم کم از کم پروردگار عالم کے اس قول کو آزما کے تو دیکھیں۔ ہم اطمینان قلب کے لیے اس کی یاد اور محبت اختیار تو کر کے دیکھیں۔ اس نے کہا' جیسے چاہو' مجھے یاد کرو۔ اس نے ہر قسم کا انداز اور پابندی اٹھا دی۔ ذکر آپ کی استطاعت قلب' اطمینانِ قلب' آپ کے ذہن اور آپ کی تمام استطاعت میں اضافہ کرتا ہے۔ وہی چیز' جو پہلے آپ کو برداشت نہیں ہوتی تھی' وہ خدا کی یاد کے ساتھ ساتھ قطعاً قابل برداشت ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تسبیحات اور ذکر کا جو انداز ہے' خدا نے ان میں توجہ کا ارتکاز تلقین نہیں فرمایا۔ ارتکاز میں ایک غلطی ہے کہ توجہ کے ارتکاز سے پہلے بہر حال آپ کو کوئی خیال قائم کرنا ہوتا ہے۔ اگر آپ توجہ مرتکز کر کے تسبیح کریں گے' تو اس میں کوئی نہ کوئی طاقت

کا حصول آ جاتا ہے۔ اس وجہ سے چلوں اور وظائف میں زیادہ لوگ جو بیٹھنے والے ہیں، وہ ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ شیزوفرینیا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ Psychot, Skies eyed اور Neuroticist بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بڑی سادہ ہے۔

خدا کی یاد کے پیچھے طلب اور آرزو تو عام انسان کی تو ہو سکتی ہے، مگر کوئی اختیار اور طاقت کا حصول نہیں ہوتا۔ کوئی چلہ اور کوئی وظیفہ ایسا نہیں، جو خدا سے کوئی چیز زبردستی چھین سکے۔ ہم نے انتہائی انکسار اور محبت سے خدا کو یاد کرتے ہوئے اس سے اپنا اطمینانِ قلب حاصل کرنا ہے۔ اپنی شناخت اور اپنی خامیوں کی آگہی طلب کرنی ہے۔ یہ ذکر یہی کام کرتا ہے۔ اس سے بڑا کوئی کام نہیں کرتا۔

ذکر، تسبیح، اہمیت

سورہ طٰہٰ میں ذکر اور تسبیح کا علیحدہ علیحدہ ذکر دراصل تاکید کے لیے ہے اور ایک ذہنی حالت کو دوسری ذہنی حالت میں تبدیل کرنے کے لیے ہے۔ مثال کے طور پر اللہ کہتا ہے کہ تسبیح کریں **سبح اسم ربک العظیم** اور **سبح اسم ربک الاعلیٰ** تو جب پہلی مرتبہ **سبح اسم ربک الاعلیٰ** آیت آئی، تو رسول اللہؐ نے اس آیت کو سجدے کے عالم میں پڑھنے کا حکم فرمایا اور جب آیت یہ آئی **سبح اسم ربک العظیم** تو اللہ کے رسول نے اسے رکوع میں پڑھنے کا حکم صادر فرمایا۔ تسبیح کائنات کی ہر چیز کا شغل ہے اور تسبیح کا اصل مطلب گننا ہے۔ دانے کا ایک راؤنڈ ہے۔ جیسے غالب کا بڑا خوبصورت شعر ہے ؎

شمار صہبا مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشہ بیک کف گردن صد دل پسند آیا

کہ میرے محبوب کو تسبیح کرنا اتنا پسند ہے کہ سو دلوں کی تسبیح ہو اور وہ ایک ہاتھ میں سو دانے کی طرح رولتا رہے۔ تو تسبیح انسٹرومنٹ اور ذکر اس کا میٹریل ہے۔ بعض اوقات جب تسبیح کہا، تو انسٹیٹیوشن کا ذکر کیا اور جب ذکر کہا، تو ایک ذاتی تعلق کا ذکر کیا۔ اس لیے اس پر دوہری تاکید کی۔ یعنی تسبیح ہی ذکر ہے اور ذکر تسبیح میں ہے۔ مگر یہ ایک انسٹرومنٹ اور انسٹیٹیوشن ہے اور ایک نیت اور ارادہ ہے۔ دونوں کا ذکر اکٹھا اس پر زور ڈالنے کے لیے کیا گیا ہے۔

ذِکراور ذاتی جائزہ

جیسے کہ میں نے آپ کو حدیث مبارکہ کی رو سے بتایا کہ دو خیمے نصب ہوں گے۔ ایک نفاق کا خیمہ دوسرا اخلاص کا خیمہ۔ جو نفاق کا خیمہ ہے' اس میں موجود لوگوں میں اخلاص کی رتی بھی نہ ہوگی اور جو اخلاص کا خیمہ ہے' اس میں وہ لوگ ہوں گے' جن میں نفاق کی رتی بھی نہ ہوگی۔ حتمی فیصلہ اللہ کے پاس ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر ہے کہ جن کے دل میں رتی برابر بھی اس کے لیے اخلاص ہوگا' وہ ان کو کبھی بھی دوزخ کی طرف نہیں جانے دے گا۔

مگر ایک حدیث رسولؐ خطرے کی علامت ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے رسولؐ اللہ سے پوچھا۔ یارسولؐ اللہ! کیا زمانہ' آخر میں مخلصین بھی پس جائیں گے؟ فرمایا' ہاں وہ بھی پس جائیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ سونے کے پہاڑ ہوں گے' مگر لوگ گذرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ ان کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ لوگ ایک قبر پر سے گذریں گے اور یہ کہیں گے کہ اس کے اندر والا باہر والے سے بہتر ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس وقت ایک دانہ گندم کے لیے فساد ہوگا۔ یعنی اتنا قحط ہوگا۔ پوچھا گیا' یارسولؐ اللہ! اس وقت اہل ایمان کس چیز پر گذارا کریں گے؟ حضورؐ نے فرمایا' وہ تسبیح الٰہی پر گذارا کریں گے۔ جو اللہ کو یاد کریں گے' خدا ان کو بہر صورت کچھ نہ کچھ پہنچائے گا۔

قیامت سے پہلے' قیامت کے دن اور یوم حساب کے بعد سب سے بڑا تحفظ اعمال صالحہ کے ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر ہے۔ یہ ذکر آپ کے دل کی غذا ہے اور خوراک بھی ہے۔ ذکر سے مراد جو تسبیح آپ اب کررہے ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں لگتا کہ میں اتنی مدتوں سے اللہ کی یاد کررہا ہوں۔ اس کے آثار و شواہد آپ کو اس وقت ملتے ہیں' جب آپ کو ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ تسبیح الٰہی کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے۔ یہ ایسا کام نہیں ہے' جو آپ کو عجیب و غریب کردے۔ آپ دوسروں سے ممتاز یا متمیز ہوجائیں۔ بندے کا اللہ کو یاد کرنا ایک انتہائی قدرتی کام ہے۔

تسبیح کا نشان یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے' وہ ذاتی جائزے کے عمل میں چلا جاتا ہے۔ وہ کسی طاقت کے حصول میں نہیں جاتا۔ کسی قوت کی ہوس یا کسی طاقت کی نمائش کے لیے تسبیح نہیں کررہا ہوتا' بلکہ خدا کو خدا کے لیے یاد کرتا ہے۔ جیسے پروردگار عالم نے فرمایا فاذکروا اللہ

کـذکـرکـم آبـاء کـم اشـد ذکـرا مجھے ایسے ہی یاد کروٗ جیسے آباؤ اجداد کو یاد کرتے ہو۔ بلکہ ذرا زیادہ سبح اسم ربک الاعلیٰ ٥ سبح اسم ربک العظیم اپنے اللہ کو دل سے لگائے رکھو۔ وہ تمہیں دل سے لگائے رکھے گا۔ فاذکرونی اذکرکم واشکرولی ولاتکفرون تم مجھے یاد کروٗ میں تمہیں یاد کروں گا۔

کتنی عجیب سی بات لگتی ہے کہ شاید ہمیں قرآن پر یقین نہیں ہے۔ جب اللہ کہہ رہا ہے' تم مجھے خالص میرے لیے یاد کروٗ میں تمہیں یاد کروں گا' تو کیا آپ اللہ کی یاد کو انجوائے نہیں کرنا چاہیے؟ اعمالِ ظاہرہ کے بعد ان کی سب سے بڑی باطنی صلاحیت اللہ کو یاد کرنے میں ہے۔ اللہ سے محبت میں ہے۔ اللہ کو اپنی زندگی میں ہی ترجیح سمجھئے۔

تسبیح' اسلوب' اثر

دماغ میں اگر پہلے سے تصور کردہ خیالات قائم نہ ہوں' تو ذکر کسی قسم کی تکلیف کا باعث نہیں بنتا۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیئے کہ خدا کی یاد کسی قیمت پر کسی انسان کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں بنتی۔ البتہ جب ایک آدمی پہلے سے سنی ہوئی روایت کے ساتھ کسی چیز پر عمل کر رہا ہوتا ہے' تو اسے وہ خیالات تکلیف دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرے ایک دوست کو بڑی مجبوری تھی۔ میں نے اسے ایک ہزار مرتبہ صرف آیت کریمہ پڑھنے کو دی۔ حضرت چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد فون کیا اور بتایا کہ میرا تو کام ہو گیا۔ میں نے کہا' تسبیح نہ چھوڑنا۔ ضرورت میں تسبیح باعث ضرورت ہے اور ضرورت کے بغیر یہ باعث شکر ہے۔ اب تم شکر کرنا اور چھوڑنا نہیں۔

دو چار دن اور گذرے' تو حضرت واپس آئے اور کہا کہ میرا تو برا حال ہو گیا ہے۔ میں نے کہا' کیوں کیا ہوا؟ اے جی' میرا پیٹ پھٹنے کو آ گیا۔ بھئی وہ آیت کریمہ کا تمہارے پیٹ سے کیا تعلق؟ فرمایا کہ پھوپھی جان کہتی ہیں کہ آیت کریمہ بڑی جلالی ہوتی ہے۔ پانی میں بیٹھ کر پڑھنی چاہئیے۔ چلو تم پانی میں نہیں بیٹھ سکتے ہو' تو ہر تسبیح کے ساتھ ایک گلاس پانی کا پی لیا کرو۔ جب یہ روّیہ ہو گا' تو مسئلہ تو ہو گا۔

تسبیح اور احساسِ گناہ

کنفیوژن اس وقت پیدا ہوتا ہے' جیسے میں سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک آدمی نے کہا کہ آپ تسبیح بھی کر رہے ہیں اور سگریٹ بھی پی رہے ہیں؟ میں نے اس سے کہا کہ صحیح ہے کہ سگریٹ ایک بری عادت ہے۔ صحت کے لیے مضر ہے۔ چھوڑنی بھی چاہیے۔ مگر اگر میں اسے مذہبی طور پر دیکھوں' تو اس پر کوئی خاص اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اس لیے میں اسے گناہ سمجھ کے نہیں پی رہا ہوں۔ میں نے اس سے کہا' تسبیح کیسی عادت ہے؟ کہتا ہے' اچھی عادت ہے۔ تو میں نے پوچھا' تمہارا کیا خیال ہے کہ بری کے لیے اچھی چھوڑ دوں؟

انسان کی ایک بڑی عجیب بات یہ ہے کہ وہ جب بُری عادت کا شکار ہوتا ہے' تو وہ اچھی عادت کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ مایوسی کا ابلیسی نشان ہے۔ ابلیس کا مطلب ہے' مایوس۔ اگر میں نے ایک غلط کام کیا اور میں پروردگار سے مایوس نہیں ہوا' تو میں پھر بھی غلط کام کر سکتا ہوں اور پھر بھی اللہ کی رحمت سے امید کر سکتا ہوں۔ سو مجھے اللہ کی رحمت تسبیح الٰہیہ میں نظر آتی ہے۔

اللہ جہاں چاہتا ہے کہ میں غلط کام چھوڑ دوں' وہاں اس نے مجھ پر بہت بڑا اکرم کیا ہوا ہے کہ اس نے مجھے اپنی یاد کی توفیق بخشی ہوئی ہے۔ اگر میں اتنے بڑے کارِ ثواب کو چھوڑ دوں' تو میں کس قسم کا انسان ہوں؟ ایک تو گناہ کر کے میں بیوقوف ہوں' اوپر سے تسبیح چھوڑ کر میں جاہل مطلق عمر بن ہشام اور ابوجہل تو نہیں بن سکتا۔ اللہ قرآن حکیم میں یہ کہتا ہے کہ جب کوئی غلط کام کرو' تو اس کے بعد کوئی اچھا کام ضرور کرو' تا کہ میں تمہاری نیکیوں سے تمہارے گناہ صاف کر دوں۔

تعویذ گنڈے اور احادیث

احادیث اور اصحاب رسولؐ سے ہمیں تعویذ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مگر اس قسم کے تعویذات کی نہیں، جو آج کل رائج ہیں۔ بلکہ یہ کچھ آیات لکھی ہوتی تھیں۔ حضرت ابنِ عباس بچوں کو تعویذ ڈالا کرتے تھے۔ میرے نزدیک تعویذ صرف بچوں کے لیے جائز ہے اور وہ بھی قرآنی آیات یا اسمائے الہیہ، جو ہم لوگوں کو پڑھنے کے لیے دیتے ہیں۔ چونکہ بچے اتنے معصوم ہوتے ہیں اور ان کی زبان ڈویلپ نہیں ہوئی ہوتی، وہ تعویذ کی صورت میں ان کے گلوں میں ڈالے جاتے ہیں۔ جیسے رسول گرامیؐ کے زمانے میں اعوذ باللہ من تامت من شر ما خلق کا تعویذ ہر قسم کے آسیب کے دفع کے لیے ڈالا جاتا تھا۔

اسی طرح بچوں میں نظر بد کا دَم کیا جاتا تھا بسم اللہ اللھم الذھب حرھا بردھا و وصفھا پرانے زمانے میں جو عرب لوگ کچھ دَم پڑھا کرتے تھے، وہ پہلے سے رائج تھے۔ ایک دفعہ اصحابِ رسولؐ نے عرض کی، یارسولؐ اللہ ہمارے لوگ بچھو کے لیے پہلے سے ایک دَم پڑھتے ہیں بسم اللہ شحة قرنية ملحة بحر تو کیا ہم پڑھ لیا کریں؟ پہلے بسم اللہ نہیں لگا کرتا تھا۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ یہ جنات کے معاہدوں میں سے ہے، پڑھ لیا کرو۔

اس سے ایک بات یہ واضح ہوتی ہے کہ مربعے اور ابجدی حروف، جو اس وقت رائج ہیں، وہ اس وقت نہیں تھے۔ ایک دفعہ اصحاب ایک جگہ سے گذرے۔ ایک قوم کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ ان میں سے کسی نے پوچھا کہ نئے دین والوں میں سے کوئی صاحب دَم کرنا یا جھاڑ

کرنا جانتا ہے؟ ایک صحابی نے کہا کہ میں جھاڑ کر دیتا ہوں۔ انہوں نے جھاڑ کیا اور پڑھ پڑھ کے پھونکا۔ وہ آدمی درست ہو گیا۔ اس کے صلے میں انہوں نے صحابی کو بہت ساری بکریاں اور مال دیا۔ جب وہ مدینے پہنچے تو ساری بات رسولؐ اللہ کو سنائی۔ ان کو ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو ہم نے حرام کمایا ہو۔ فرمایا کہ تم نے اس میں کیا پڑھا تھا؟ فرمایا یا رسولؐ اللہ! مجھے سورہ فاتحہ یاد تھی' وہی میں پڑھ پڑھ کر دَم کرتا رہا اور وہ اچھا ہو گیا۔ فرمایا' تمہیں کیسے پتہ لگا کہ سورہ فاتحہ تمام امراض کی شفا ہے؟ پھر فرمایا' اس میں میرا بھی حصہ لگاؤ۔

اس کے علاوہ حضور گرامی مرتبتؐ اپنے ہاتھوں سے اپنی ذات پر دَم کیا کرتے تھے۔ وفات کے قریب بھی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول ہے کہ حضور مرتبتؐ معوذ تین دَم کر کے اپنے جسم پر پھیرتے تھے۔ اس کے علاوہ حدیث میں ایک دافع آسیب آیات کا دم ہے۔ وہ بھی حضورؐ پڑھا کرتے تھے۔ ایک حدیث کے مطابق جسے جنون' سرسام یا مراق ہو جائے' اس کے لیے صبح و شام سات سات مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر دَم کرو۔ جب پڑھ چکو' تو اپنی زبان سے لعاب لے کر اس کے سر پر لگا دو۔

احادیث میں مختلف کلمات مختلف امراض کے لیے موجود ہیں۔ رسول گرامی مرتبتؐ نے کسی چیز کا علاج کلمات عالیہ میں بتایا ہے' تو وہ یقیناً مؤثر ہے۔ جیسے سر درد ہے' تو اس کا دَم یہ ہے کہ تین مرتبہ بسم اللہ پڑھ کر اور سات مرتبہ اعوذ باللہ و قدرتہ من شر ما آزدو و حاضرو کا دم ہے۔ اسی طرح کسی بھی پھوڑے پھنسی پر طریق دم یہ ہے کہ زمین پر انگشت شہادت لگا کر مٹی کے ساتھ یہ دم پڑھے بسم اللہ تربت اھنتا بریقة بعضنا یشفع سکیمنا باذن ربنا تو ان شاء اللہ کیسا بھی پھوڑا اور خرابی ہو گی' وہ درست ہو گی۔ ایک خاتون کے بیٹے کو السر تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج کر کے گھر بھیج دیا تھا۔ میں نے عام مٹی میں خاک پاک حرم ملا کر اسی طرح انگلی رکھ کے اس پر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کو بتایا کہ وہ بھی اس کو پڑھا کرے۔ پندرہ بیس دنوں کے بعد اتنا بڑا زخم روپے (سکّے) کے برابر رہ گیا۔ وہ کینسر تھا۔ بڑی حیرت ہوئی۔ ایک ہفتے بعد مجھے اس کے مرنے کی خبر آئی۔ میں نے پہلی بات یہ پوچھی کہ وہ مرا کیسے؟ پتہ چلا کہ وہ نمونیا سے مرا۔ میں ہنسا بھی اور رویا بھی کہ وہ اصل مرض اور تکلیف سے تندرست ہو رہا تھا۔ مگر خدا کو چونکہ موت منظور تھی' اسے وہ ایک اور مرض سے لے گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس ایک شخص دوڑتے ہوئے گذرا۔ آپؑ نے اسے آواز دی کہ اے فلاں بن فلاں تجھے کیا ہوا ہے؟ فرمایا' یا علیؑ! میں بے چین اور بے قرار ہوں۔ میرا بھائی سخت بیمار ہے۔ وہ بالکل مرنے کے قریب ہے۔ میں اس کی طرف بھاگ رہا ہوں۔ حضرت علیؑ نے کہا' کیا تو چاہتا نہیں ہے کہ وہ تندرست ہو جائے؟ اس نے کہا اے علیؑ! آپ مذاق کرتے ہیں۔ کیا میں یہ نہیں چاہوں گا؟ تو کہا' اس طرح کہو' یا حلیم یا کریم وآشف فلاں ابن فلاں۔ تو خدا موت کے سوا ہر مرض کی اس میں شفا دے گا۔ یقین جانئے' جس شخص کے لیے بھی میں نے اسے پڑھایا' یا اسے یہ پڑھنے کو دیا' تقریباً سو فیصد شفا کے آثار اس میں پائے۔ اسی طرح حضور گرامی مرتبتؐ نے کہا کہ جس نے بیماری میں آیت کریمہ 40 مرتبہ پڑھی **لاالہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین** وہ شفا پائے گا اور اگر وہ شفا نہیں پائے گا اور اس کی وفات ہوگئی' تو سیدھا جنت میں جائے گا۔ سو' بہت سے ایسے کلمات عالیہ موجود ہیں' خدا کے رسول کی جن کے پیچھے سند موجود ہے اور وہ اپنا اثر رکھتے ہیں۔

اب ذرا دوسری طرف آئیے **وما انزل علی الملائکة ببابل ھاروت و ماروت** ہاروت و ماروت کا چاہ بابل پر نزول بحیثیت ایک آزمائش کے تھا۔ بابل ونینوا کی تہذیب اس وقت نہایت ترقی پذیر تھی۔ وہ علم و حکمت پر بے شمار اثر رکھتے تھے۔ مگر ان کو غیر مرئی طاقتوں کی ہوس پیدا ہوگئی' جو ان کے بس میں نہیں تھی۔ ستاروں کا علم تہذیب بابل ونینوا کی ایک مثال ہے۔ حضرت جبرائیل امینؑ نے ایک بہت بڑے ماہر سے پوچھا کہ کیا تو مجھے بتا سکتا ہے' جبرائیل کہاں ہے؟ اس نے فوراً حساب کتاب لگا کے کہا کہ وہ اس وقت آسمان میں نہ زمین میں ہے۔ اس وقت یا تو ہے یا میں ہوں اور میں نہیں ہوں' تو ہے۔

یہ مثال اس لیے مشہور ہے کہ سب سے پہلے سورج گرہن کا تعین بابل ونینوا کی تہذیب میں ہوا۔ اتنی ترقی یافتہ تہذیب میں لوگ ایک ناقص علم کی طرف بڑھے۔ خداوند کریم کہتے ہیں کہ ہاروت و ماروت ان سے پہلے عہد لیا کرتے تھے **وما یعلمان من احد حتی یقول انما نحن فتنه فلا تکفر** کہ تم سیکھنے تو آتے ہو' مگر ہم اس وقت تک نہیں سکھائیں گے' جب تک تمہیں یہ بتا نہ دیں کہ جو چیز تم سیکھ رہے ہو' یہ کفر ہے۔ ان میں تم دوسری اشیاء کو ربّ الارباب اور مالک القدوس کا درجہ دیتے ہو' یہ نہ سیکھو۔ اس میں تمہارا نقصان ہے۔ مگر وہ اصرار کرتے تھے کہ انہیں گنڈہ'

تعویذ اور تعویذ حب و بغض سیکھنا ہیں۔ وہ کرتے کیا تھے فیتعلمون منھما مایفرقون بین المرو الزوجہ ایسے تعویذ لکھنا اور گنڈے بنانا، جس میں میاں بیوی میں فرق ہو جائے۔ جیسے آج کل جگہ جگہ تعویذ، حب، تعویذ، بغض، عمل شیطانی اور رحمانی کے عمل جاری ہیں، وہ بھی کئی قسم کے بیشمار کام کیا کرتے تھے۔ اس پر خدا نے ایک مکمل ججمنٹ دی اور فرمایا و یتعلمون مایضرھم و لا ینفع تم ایسی بات کیوں سیکھتے ہو، جس کا ضرر ہے نہ نفع۔

چنانچہ وہ کلمات عالیہ، جو پروردگار نے اپنے رسول کو سکھائے۔ جو انہوں نے اپنی اُمت کو تعلیم دیئے اور جن کی سند مستقل خدا اور رسول سے ہے، ان کا تو فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام چیزیں، جو ارتکاز توجہ اور طاقت کے حصول یا جنات کے عملیات سے پیدا ہوتی ہیں، ان سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا۔ یہ تمام چیزیں ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

سحر کا یہ اصول ہے کہ یہ نظر اور دماغ پر اثر کرتا ہے۔ جب یہ دماغ پر اثر کرے گا، تو وہی خیال آپ کے ذہن میں بار بار پلٹے گا۔ Psychosis - Neurosis میں تقریباً یکساں قوانین ہیں۔ ان دونوں میں ایک جارحانہ خیال بار بار ورد کرتا ہے۔ علاجِ سائنس، ماہرین خود ایمائی اور ماہرین جنات کا بالکل ایک سا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر حضرات کے مطابق اس طرح مریض کو مارنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن حقیقت میں علاج کے پیچھے قوانین یکساں ہیں۔ جب کوئی عامل یا ساحر کسی بندے میں تعویذ یا جن کا اثر پائے اور وہ قدرتی نہیں ہوتا، تو وہ اس کو اتنا مارتے ہیں کہ اس میں حس بقا بیدار ہو جاتی ہے۔ زندگی کی خواہش مریض پر غالب آ جاتی ہے اور وہ بول اٹھتا ہے کہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میرا جن نکل گیا ہے۔

ہسٹیریا کے کیسوں میں میڈیکل طریق علاج میں اَنستھیٹک گیس اتنی مکروہ ہوتی ہے کہ اس کا ایک جھٹکا ہی حس بقا کو پیدا کر دیتا ہے۔ وہ گیس مریض کو اتنی مکروہ لگتی ہے کہ وہ فوراً مان لیتا ہے، میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ طریقۂ علاج دونوں کا ایک جیسا ہے۔ وہاں مار پیٹ سے حس بقا کو ابھارا جاتا ہے۔ جبکہ الیکٹرک شاک میں خیال کے اعادے کو فور برین سے ہٹایا جاتا ہے۔ اس مسئلے میں جدید سائنسز نے پیشرفت کی ہے۔ وہ میڈیسن کے ذریعے نیند دے رہے ہیں، تو بھی اسی لیے کہ خیال کا اعادہ رُک جائے۔

مگر جنون کا یہ علاج نہیں ہے۔ یہ ریلیف اسے نہیں ملتا۔ اگر معمولی سی کیفیت ہو، تو

شاید آدمی نارمل ہو جائے۔ مگر شیزوفرینیا اور اسی طرح کے دوسرے امراض کہیں بھی درست ہوتے دیکھے نہیں گئے۔ کسی بھی وقت دوبارہ عود کر سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ شخص اپنے خیالات کی بنیاد کو تبدیل کرے۔ فطرت کے نقائص کو بہتر بنائے اور یہ صرف اور صرف اللہ کی یاد میں ممکن ہے۔ تسبیحات الہیہ سے ہی وہ مرض دُور ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تسبیح میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اس کو ابنارمل اور سب نارمل رجحانات سے دوبارہ نارمل حالت کو لاتی ہے۔

Occult پر ردِ عمل

علم نجوم، علم الاعداد، یوگا کے آرٹس، شامان ازم اور چلے وغیرہ جتنے علوم ہیں، ان سب کو ملا کے انہیں occult کہتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں اور غیر معمولی علوم کے محاذ Occult میں شریک ہیں۔ Occult کا ٹوٹل اصول، اور اس کے حصول کے لوازم دین کے اصول کے خلاف ہیں۔ ان کا اصول دو چیزوں پر مبنی ہے۔ ایک تو یہ تمام علوم اپنے نفس کی مطابقت میں اللہ کے خلاف حاصل کیے جاتے ہیں۔ یعنی اللہ کے پاس غیب ہے، تو آپ غیب کی صلاحیت پر قابو پانا چاہتے ہیں۔ آپ Gifted بھی نہیں ہیں نہ نبی یا رسول ہیں۔ اس لیے آپ چاہتے ہیں کہ آپ غیب کے پردوں میں جھانک سکیں اور خبر لا سکیں۔ وہ لوگ جو اس کو سیکھتے اور سنتے ہیں، ان پر ایک بہت بڑا نفسیاتی قانون لاگو ہوتا ہے اور اس قانون کو ہم Willing-suspension of disbelief کہتے ہیں۔ ازخود باہمی مفاہمت سے اپنی قوت و اختیار کو معطل کر دینا۔ اپنی قوت اختیار اور اپنی تنقید کو جب آپ معطل کرتے ہیں، تو آپ کو Occult پر اعتبار آنا شروع ہو جاتا ہے۔

آپ ایک بس سٹاپ پر کھڑے ہیں اور بس لیٹ آئے، تو آپ کہتے ہیں، آج بس لیٹ ہے۔ اگر دوسرے دن بھی کھڑے ہوئے اور دوسرے دن بھی لیٹ آئے، تو آپ کہتے ہیں کہ آج بس پھر لیٹ آئی۔ اگر تیسرے دن کھڑے ہوئے۔ پھر لیٹ آئی، تو آپ کہتے ہیں، بس ہمیشہ لیٹ آتی ہے۔ حالانکہ باقی ستائیس دن بس وقت پر آئی۔ مگر آپ تھے نہیں۔ تو سارے Occult یہی لاز ہے۔ قرآن حکیم میں انہیں خراس یعنی اٹکل پچو کہا گیا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ ہاتھ یا آسمان دیکھنے والا کوئی آپ کو ایک بات بتاتا ہے۔ وہ آپ

نوٹ نہیں کرتے۔ آپ کے کام کی نہیں ہے۔ دوسری بتائے گا' وہ بھی آپ کے کام کی نہیں ہے۔ تیسری بات آپ کے کام کی ہے۔ آپ کو اچھی لگی۔ آپ اسے نوٹ کرلیں گے۔ دو اور باتیں غلط نکلتی ہیں' پھر ایک بات کام کی آ جاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں' یہ بھی ٹھیک ہے۔ تیسری بات ترقی کی آپ نے ہر صورت قبول کرنی ہے۔ آپ نے کہا' ماہرِ فلکیات کا حساب بالکل ٹھیک ہے۔

تو اس کا بنیادی قانون ہے' دس میں سے تین۔ کیونکہ ناگوار باتیں آپ یاد نہیں رکھتے' خوشگوار باتیں بڑی خوشی سے یاد رکھتے ہیں۔ اس لیے تمام Occult کا قانون Willing suspension of disbelief ہے۔ اگر آپ میں نقادی بہت اعلیٰ سینس' اور چیزوں کو جانچنے کی اچھی صلاحیت ہے' تو آپ کبھی بھی Occult پر مکمل اعتبار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ قرآن حکیم اسے خراس کہتا ہے۔ حدیث رسولؐ کے مطابق اگر کسی نے یہ کہا کہ اس کاہن کی کہانت یا اس نجومی کے نجوم کی وجہ سے بادل برسے اور بارش ہوئی' تو اس نے کفر کیا اور جس نے یہ کہا کہ اللہ کی وجہ سے سب کچھ ہوا' تو اس کا ایمان ٹھیک ہے۔ یہ لوگ صرف اٹکل پچو باتیں کرتے اور تکے لگاتے ہیں۔ ان کا حال ماڈل ٹیسٹ پیپر گیس ورک کا سا ہے۔ دو سوال آ گئے' تو انتہائی کامیاب' نہ آئے تو ٹھس۔

ذِکر میں ارتکاز

ایسی کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ انڈونیشیا میں باپاک نام کا ایک سکول ہے' جو ارتکاز توجہ کا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے بقول اسے لاٹ خان کہتے ہیں۔ ان کا ارتکاز سب سے سادہ اور مؤثر ہے۔ وہ ارتکاز یہ ہے کہ بند کمرے میں بیٹھ کر وہ ہر قسم کے خیالات کو گزرنے دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ دو تین دنوں تک تمام شیطنیت اور تمام نیکیاں ان کے دماغوں سے گزرتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اصول کے طور پر منفیت کم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور جو باقی بچتا ہے' وہ ایک بہتر خیال ہوتا ہے۔ مگر اُس ارتکاز کے پیچھے خدا کی شناخت اور محبت نہیں ہوتی' نہ اسے خدا کی قبولیت حاصل ہے۔

تسبیح میں اُونگھ کیوں

ایسا ضرور ہوتا ہے۔ اصل میں خداوند کریم کی طرف سے اس انسان پُر امن اترتا ہے۔ جنگ اُحد میں جب مسلمان بڑے پریشان تھے اور ان کے دلوں پر شکست کا صدمہ تھا۔ رسولؐ اللہ بڑے گھبرائے ہوئے مسلمانوں کے بیچ میں پھنسے ہوئے تھے۔ دشمن خود حضور گرامی مرتبتؐ پر حملہ کر رہا تھا' تو اس وقت اللہ نے مسلمانوں کو مدد کرنے کے لیے ایک اونگھ بھیجی۔ اس کا بڑی وضاحت سے ذکر ہوا۔ اس اونگھ کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ قول مبارک ہے کہ مجھے اتنی سخت نیند آئی کہ میرے ہاتھ سے تلوار گر گر جاتی تھی۔ مجھے اپنا آپ ہوش میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اللہ کی طرف سے اس میں سلام کی اونگھ ہے۔ یہ انسان کو اس کے نروس کی کمی میں رسد فراہم کرتی ہے۔ اگر آپ کو اس دوران اونگھ یا نیند آ جائے' تو کبھی بھی اس کے خلاف لڑنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ امناً نغاصاً ہے۔ یعنی امن کی اونگھ ہے' جو یقیناً آپ کے مفاد میں ہے۔ آپ کے خلاف نہیں ہے۔

وظائفِ حصولِ دُنیا

خدا کہتا ہے' اگر تم مجھے یاد رکھو' میری عبادت کرو' تو میں تم پر معیشت تنگ نہیں کرتا۔ اگر خدا کا یاد کرنا معیشت کی کشادگی کا باعث ہو سکتا ہے' تو ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے۔ پھر خدا کی دوسری حکمت عالیہ یہ ہے کہ کسی کو حیلے سے بلا رہا ہے' تو کسی کو زور سے بلا رہا ہے۔ کسی کو ڈرا کے تو کسی کو لالچ دے کر بلا رہا ہے۔ انسان کو ہر صورت مقصود پروردگار یہ ہے کہ وہ اس کی رحمت سے ہمکنار ہو۔ اللہ انسان پر اتنا مہربان ہے کہ وہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتا ہے۔ ہم جو سنت الہیہ کی پابندی کرتے ہیں' تو وہ اگر کسی معیشت کا لالچ دے کر خدا کی یاد کی طرف لگا دے' تو کیا عجب ہے؟

حروفِ مقطعات کے اشکال

پروردگار نے ایک جگہ فرمایا ہے' متشابہات کے پیچھے مت پڑو کہ اس سے دل میں ٹیڑھ پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ فرمایا کہ تمہیں اس قسم کا اشکال وارد ہوجائے' تو ان لوگوں کے پاس جاؤ والرسخون فی العلم یقولون کل من عند ربنا جو علم میں راسخ ہیں اور ہر چیز اور علم کو حصول خداوند کی طلب اور ذریعے سے حاصل کرتے ہیں اور خدا ہی کے لیے اس کو تقسیم کرتے ہیں راسخون فی العلم کے لیے ایسی کوئی تحقیق منع نہیں فرمائی۔ کسی علم یا چیز میں مہارت نہ ہو اور میں اس کی بنیاد سے بھی واقف نہ ہوں۔ اس کے باوجود میری انا مجھے یہ بتائے کہ میرا اس علم کا نہ جاننا اور انکار کرنا میرے لیے سبکی کا باعث ہوگا اور میں اس کے جاننے پر اصرار کروں' تو یہ جہالت کسی بھی انسان سے سرزد ہوسکتی ہے۔ اس لیے تجسّس کو حدود میں رکھنا اور اپنے خیال اور تجسّس کا مطالعہ کرنا سب سے بڑا ذہنی کارنامہ ہوتا ہے۔ جب تک آپ اپنے ذہنی افکار کا مطالعہ نہیں کرتے' آپ یہ جان نہیں سکتے کہ ہمارے بس میں کیا ہے؟

وہ ذہن بہت اچھا ذہن ہے' جو اپنی مدد خود مقرر کرتا ہے۔ حروف مقطعات کے لیے مجھے اپنی ریسرچ بتانی پڑے' تو اس میں ''میں'' کا صیغہ کثرت سے استعمال ہوگا۔ بہت عرصہ پہلے میں ایک دفعہ خدا سے گلہ گزار ہوا کہ اگر تمام قرآن ہمارے سمجھنے کے لیے نہیں تھا' تو پھر کاہے کو آپ نے تمام قرآن پڑھنے کی توفیق دی۔ کوئی آیات آپ بتا دیتے' تو ہم روز پڑھ لیا کرتے۔ مگر سارا قرآن اگر ہم نے ہی پڑھنا ہے' تو پھر سارے کو قابلِ فہم بھی ہونا چاہیے۔

دوسرا سوال میں نے اپنے اللہ سے یہ کیا کہ اگر نا قابلِ فہم رہ کر ہمارے تک اس کے معانی نہیں پہنچے اور آگے بھی نہیں پہنچے‘ تو مجھے نہیں سمجھ آتا کہ آپ نے حروفِ زائد کیوں قرآن حکیم میں استعمال کیے؟ اس ادھیڑبن میں ایک برس رہا کہ کوئی سراغ مجھے حروفِ مقطعات کا ملے۔ اتفاق سے ایک دفعہ لیوئی مالینیسوں کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا‘ جس کا حروفِ مقطعات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس میں اس نے ابن عربی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ایک فقرہ استعمال کیا کہ وہ بنیادی کیٹگر یز کے علم کا ماہر تھا۔

یہ فقرہ سنتے ہی جیسے نیوٹن کو ایک جھٹکا ہوا تھا‘ میرے ذہن میں بھی حروف کے بارے میں ایک بڑا باب کھل گیا۔ جب ان حروف کی بنیاد پر میں نے پورے حروف کو پرکھنا شروع کیا‘ تو رفتہ رفتہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ پوری کائنات بنیادی طور پر انہی چند حروف میں قید ہے اور صفات اور تعلقات کے لحاظ سے کوئی چیز بھی ان حروف سے غیریت کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ بہت سارے اصحاب اس کو کشف کہیں گے۔ مگر میں انسانی مطالعے میں اکتشاف سے زیادہ کشف کو بھی انسانی ذہن کی باریک بینی وسعت اور اس کا ترفع سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ کے رسولؐ کے لفظ سے بہتر کوئی لفظ نہیں کہ فراست اس کے لیے موزوں ترین لفظ ہے۔ جب ذہن اپنے اعلیٰ ارتقاء پر پہنچتا ہے‘ تو الام و فراست ہم معانی ہو جاتے ہیں۔

تب سے میں نے اس علم کو کثرت سے استعمال کیا ہے‘ مگر خدا کے لیے جیسے الف لام میم ہے‘ اس کی وضاحت کروں گا۔ یہ ایک گروپ آف ریلیشن شپ ہے۔ خواہ وہ اشیاء میں یا انسانوں میں ہو۔ اس کے بعد ان کی اپنی اپنی کیٹیگر یز متعین ہوتی ہیں۔ تفصیل میں جانے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں لاکھوں امکانات مراسم کے پیدا ہوتے ہیں۔ نارمل فنکشن کے لیے ہر انسان کی فطرت پر یہ اسماء حکومت کرتے ہیں۔ الف لام میم کی شناسائی اور ربط ہمیشہ سے مسلم رہا ہے۔ جن کے نام الف سے ہیں‘ وہ اپنے تعلقات کو پرکھیں گے‘ تو ان میں لام میم نمایاں نظر آئیں گے۔ اسی طرح لام والے جب اپنی دوستی اور محبت کے پرتولیں‘ تو ان میں بھی الف اور میم مظاہرہ کریں گے۔ مگر جب کوئی اسم آگے بڑھ کر دوسرے اسماء سے منسلک ہوتا ہے‘ تو رفتہ رفتہ بنیادی کیٹیگر یز میں فرق پڑ جاتا ہے۔

اس طرح ایک شخص‘ جس کا کوئی بھی نام ہو‘ جب ہم اس کے اسماء کی بنیادی صفات پر

جاتے ہیں، تو وہ انسان اسی طرح واضح ہوتا ہے، جیسے ابن عربی نے کہا تھا کہ میں ایک شخص پر تین مرتبہ نگاہ ڈالتا ہوں اور میثاق سے لے کر برزخ تک اس کے مقامات دیکھ لیتا ہوں۔ مگر اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سنا سکتا ہوں کہ ابن عربی نے ایک پیشگوئی کی تھی۔ ابن عربیؒ نے کہا کہ دخل سین فی الشین ظھرک محی الدین جب س ش میں داخل ہوگی، تو محی الدین کی قبر ظاہر ہوگی۔ بہت سارے لوگ اس کے بیان پر، جب وہ مر بھی گیا اور دفن بھی ہوگیا، بڑے پریشان ہوئے۔ مگر لوگوں کو یہ بات یاد تھی۔ اس کی قبر گم ہوگئی۔ کسی کو نہ ملتی تھی۔ لوگوں نے کوشش کی، حتیٰ کہ جب سلطان سلیم اوّل شام میں داخل ہوا، تو اس نے خاص طور پر حکم دیا کہ محی الدین کی قبر نمایاں کی جائے۔ انہوں نے ڈھونڈی۔ تب لوگوں کو سمجھ آیا کہ وہ کیا کہہ گیا تھا کہ دخل سین فی الشین ظھرک قبر محی الدین۔

حروفِ مقطعات کا علم

حروفِ مقطعات کے بارے میں پہلے سے کوئی ایسا اشارہ یا کنایہ موجود نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت کے بعد تاریخ اسلام میں صرف ایک ماہر اس کے گزرے ہیں۔ وہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ تھے۔ انہوں نے ''فتوحاتِ مکیہ'' میں اس کی وضاحت کی ہے۔ ان سے پہلے اور اس کے بعد حروفِ مقطعات کا علم کسی اسکالر کے پاس کسی صورت میں موجود نہیں رہا۔ اگرچہ شیخ مجدد نے اس کے بارے میں دعویٰ کیا کہ مجھے حروف مقطعات عطا ہوئے ہیں، مگر اس علم کا مکتوبات شیخ مجدد یا کسی اور کتاب میں کوئی اظہار نہیں ہوا۔ وہ دعویٰ ناقابلِ تسلیم رہا۔ کچھ لوگوں نے اس کے بارے میں دعوے ضرور کیے ہیں، مگر جس دعوے کی پرکھ موجود نہ ہو یا جس دعوے کا مظاہرہ نہ ہوا، اس کو تسلیم کرنے سے ہر سنجیدہ انسان کو تامل ہوتا ہے۔

ایک بات اکیڈیمیکلی صرف میرے حوالے ہی سے جانی جائے کہ اسی ادھیڑ بن میں ایک دن میں نے اللہ سے عرض کی کہ لگتا ہے، سارا قرآن بندوں کے لیے نہیں ہے اور اگر سارا قرآن بندوں کے لیے نہ تھا، تو پھر آپ نے بندوں کو سارا قرآن پڑھنے کی زحمت کیوں دی؟ کوئی بارڈر لگا دیا ہوتا کہ بندے یہ پڑھیں، وہ نہ پڑھیں۔ اس لیے میں نے اللہ سے یہ خصوصی استدعا کی کہ حضور کی بارگاہ عنایت سے اس علم کا تھوڑا سا حصہ نصیب ہو۔

میری اس دُعا کے باوجود میں سننے، سمجھنے، پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن مجھے کوئی ایسا سراغ نہ ملا، جس سے میں مطمئن ہوتا کہ میں نے راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ لوئی ماسینیوں کی کتاب پڑھتے ہوئے اس کا ایک جُملہ میری نظر میں آیا۔ وہ جُملہ پوری طرح میرے ذہن میں اٹک گیا۔ شاید وہ بھی حکمت ربانی تھی۔ لوئی ماسینیوں نے کہا کہ It seams that the knows some kind of knowledge of basic categories اب یہ لفظ اور جُملہ Knowledge of basic categories نے مجھے سخت ضرب لگائی۔ مجھے خیال آیا کہ جب کائنات بنی ہوگی۔ خدا نے کلام کیا ہوگا اور انسان نے علم سیکھا ہوگا، تو اس کے پاس اتنا وسیع تر علم نہ تھا۔ جتنی بھی کائنات میں اسے چیزیں نظر آئی ہوں گی اور خیال اس کے ذہن میں آئے ہوں گے، ان کی اس نے ایک یا دو ہیڈز کے تحت گروپ بندی کی ہوگی۔ چونکہ تختی اسے پروردگار سے حروفِ مقطعات کی تصیب ہوئی، تو یہ چودہ حروف وہ کیٹیگریز ہیں، جن میں کائنات کی ہر چیز اور ان کی فطرت کا علم ضرور ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ ابتدائی طور پر اسے کیسے سیکھا جا سکتا ہے؟ جب میں نے ان پر زیادہ غور کرنا شروع کیا، تو ابتدا الف لام میم سے کی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ بنیادی کیٹیگریز ہیں، تو یہ بنیادی کیٹیگریز کے علاوہ گروپ بھی ہیں۔ یعنی الف لام میم ایک گروپ ہے۔ الف بنیادی کیٹیگری ہے۔ لام بنیادی کیٹیگری ہے، میم بنیادی کیٹیگری ہے۔ مگر یہ اکٹھے ہو کے ایک گروپ بناتے ہیں۔ جب میں نے گروپنگ کو دیکھا، تو باقی کے اسمائے مقطعات بھی گروپنگ میں نظر آئے۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ ان گروپوں کی قرابت داری کو چیک کروں۔ کیا یہ واقعی ہے کہ الف لام کی قرابت داری ہے، اور یہ قائم ہے اور کیا یہ واقعی صحیح ہے کہ یہ اسماء جب آپس میں ملتے ہیں، تو کچھ اسماء آپس میں متصادم اور کچھ آپس میں موافق ہو جاتے ہیں۔

میں ابھی اس ادھیڑ بن میں پڑا ہی ہوا تھا کہ مجھے مسند اہلِ بیت کی ایک حدیث نظر آئی، جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے حضرت عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مکالمہ درج تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا کہ ہم جو اچھے بھلے اللہ کے احکامات پر چلنے والے نیک لوگ ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارا دل کسی نیک کی بجائے کسی بُرے آدمی کی آشنائی کو جاتا ہے؟ ایک بُرے آدمی کو دل بھی کھینچتا ہے اور اس کی محبت بھی اچھی لگتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا کہ اے عمر امیر المومنین! میں نے یہ سوال ایک دفعہ رسولؐ اللہ سے پوچھا تھا۔ کیونکہ میری بھی یہی کیفیت تھی کہ اچھے بُرے لگتے تھے اور بُرے اچھے لگتے تھے۔ میں نے حضور گرامیؐ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ ہم نیکی کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ اس کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ مگر جب دوستی یاری کی بات ہے' تو کبھی بُرے آدمیوں سے آشنائی اچھی لگتی ہے۔ رسول گرامیؐ نے فرمایا کہ اللہ نے جب ارواح کے جنود پیدا کیے' تو اسی وقت کچھ کی کچھ سے محبتیں ٹھہرا دیں اور کچھ کی کچھ سے نفرتیں ٹھہرا دیں۔ اب چاہو یا نہ چاہو' جب آپ زمین پر آئیں گے' تو وہی محبتیں ہوں گی' چاہے وہ اچھے ہوں' چاہے برے۔

چونکہ میں خود قرابت داری کے موضوع پر غور کر رہا تھا' مجھے ایک بڑی مضبوط سند مل گئی۔ میں نے وہ پورے پراسیس کرنے شروع کر دیئے۔ جیسے سولہ + سولہ = بتیس مہروں کی چالیں ایک ارب سے زیادہ ہیں' جب آپ ایک بنیادی حرف کی کیٹیگری ختم کر لیتے ہیں' تو اس کے جو کمبی نیشن شروع ہوتے ہیں' وہ بے پناہ مصیبت کا باعث بنتے ہیں۔ فرض کیجیے' اسم احمد ہی کو لیجیے۔ اب اسم احمد میں چار لفظ ہیں' جو علیحدہ علیحدہ حیثیت میں کمبائن ہو رہے ہیں۔ حامیم بیچ میں آ گئے۔ الف ادھر اور دال ادھر آ گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چاروں بڑے اور موثر لفظ ہیں۔ الف میں طاقت کا نشہ ہے۔ یہ لفظ ہر حال میں مغلوبیت کے خلاف ہے۔ وہ اختیارات کو اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا ہے' اس لیے بخیل ہے۔ الف کی بنیادی نشانی یہی ہے کہ یہ دو چیزوں کے لیے منضبط ہے۔ اختیارات اور بخل کے لیے۔ یہ آسانی سے دیتا نہیں اور آسانی سے چھوڑتا نہیں۔

آگے آ گئی ح۔ ح کو دیکھا' تو پتہ لگا کہ یہ تو پوری حیات ہے۔ ابتدائی حامیم یہ ہے وجعلنا من الماء کل شی حی اس میں حامیم کا تذکرہ ہوا ہے۔ ما کی میم اور ح حیات کی' یہ پہلی ح م تھی' جو اللہ نے پیدا کی۔ یعنی پانی سے حیات شروع کی۔

اب ان کی صفات کہ ما ساکن ہے۔ جبکہ ح حرکت والی ہے۔ جب دوسری حامیم پیدا کی' تو آپ دیکھیں گے کہ ہر وہ چیز' جو ما میں حرکت کرتی ہے' یہ دوسری لائف ہے۔ پہلی طرز زندگی میں ایک چیز پائی جاتی ہے' وہ حرکت اور اشتعال ہے۔ جس چیز میں ح یا خ ہو گی' اس میں یہ بنیادی صفت پائی جائے گی۔ کیونکہ وہ حیات ہے۔ اسے چین نہیں آ سکتا۔ اپنے اندر بہترین ڈسپلن کے ساتھ وہ اسے متحرک رکھے گی۔

آگے میم آ گیا۔ میم متفکر ہے۔ میم بھی دو ہیں۔ بعض اوقات یہ رنگ میں چلا جاتا ہے۔ ایک میم ماءالبحر ہے۔ ایک مام ماء دریا ہے۔ صاف ستھرا پانی اچھلتا ہوا' جمپ کرتا زندگی کو سیراب کرتا اور آنکھوں کو بھلا لگتا ہے۔ یہ صاف رنگ والی میم ہے۔ دوسری ما جسے ماءالبحر کہتے ہیں' سمندر کی میم ہے۔ یہ تاریک' متفکر' وسیع' انتہائی گہری آسائشوں کا مرکز' بہت گہرے پردوں کے اندر اور اس میں بے پناہ وسعتیں چھپی ہوئی ہیں۔ جب آپ میم کا رنگ سانولا اور اس میں رنگ پائیں گے' تو وہ حرکت ہوگی۔ ایک میم باہر کی طرف اور دوسری اندر کی طرف رجوع رکھتی ہے۔

اب دو انتہائی مشتعل لفظوں الف اور ح میں موجود تیسری میم ہے' وہ رنگ پر جائے گی۔ اگر میم کا رنگ گندمی ہے' یا سیاہ ہے' تو یہ دبی ہوئی ہوگی۔ دبا ہوا اثر پہلے دو مشتعل اثرات کو کنٹرول کرتا ہے۔ آگے آ گئی دال' جوستی' وجود کے بھارے پن' حضرت داؤد کی اور بے پناہ تقوے اور شدت غضب کی ہے۔ اب ان تینوں چیزوں میں الف کنٹرول کر رہا ہے۔ ح کنٹرول کر رہی ہے۔ میم دبی ہوئی ہے۔ دال دوبارہ غصہ دلاتی ہے۔ تو یہ نام احمد انتہا درجے کی کارکردگی کو جائے گا۔ مگر کارکردگی کے ساتھ ایک انتہا درجے کی غصے کی حساسیت کی وجہ سے تلخی و بے چینی کا شکار ہوگا۔ محقق ہوگا' مگر بیمار ہوگا۔

اگر آپ کے نام ان میں سے ہیں' تو آپ اپنی فطرت کو بڑی آسانی سے جان سکتے ہیں۔ یہ جو تمام خصائص میں نے بیان کیے ہیں' ان میں کوئی گیس ورک نہیں۔ غلطی کا کوئی چانس نہیں۔ غلطی صرف استاد کرتا ہے۔ علم نہیں کرتا۔

کلوننگ کی سائنسی تشریح

(ڈاکٹر عبدالجلیل خواجہ) کلوننگ کے بارے میں ایک پہلو یہ ہے کہ بچے کی تیاری مادر رحم سے باہر بھی کی جاسکتی ہے۔ جنیٹک کے اعتبار سے انڈہ (egg) مادہ تولید (sperm) مل کر تقسیم ہوتے ہیں اور انسان کی باڈی ڈیولپ ہوتی ہے۔ ابتدائی مراحل کو ایمبریو کا مرحلہ کہتے ہیں۔ کلوننگ ایک ایسا مظہر قدرت ہے' جس میں مادۂ تولید شامل نہیں کیا گیا۔ جو تجربہ ابھی کیا گیا ہے اور ریکارڈ ہوا ہے' وہ سویڈن کے سائنسدان ہیں۔ انہوں نے بکری کے جسم کا ایک سیل لیا۔ یہ انڈہ

نہیں تھا۔ انہوں نے اسے کمزور کر کے اور ڈیولپ کیے بغیر نیند میں ڈال دیا۔ یعنی ایک قسم کی وقتی موت میں ڈال دیا گیا۔ یہ سیل نیند میں جا کے غیر متحرک ہو جاتا ہے۔ اس کا ڈی این اے جو سارے جسم کا پیغام اور کوڈ لیتا ہے' متحرک نہیں رہا۔ بیضہ دانی میں سے انہوں نے انڈہ نکالا اور اس میں سے ڈی این اے نکال لیا۔ ڈی این اے جنیٹک آرڈر ہے' جس کے ذریعے بات طے پاتی ہے کہ بکری کے پیدا ہونے پر اس کے بال کیسے ہوں گے۔ آنکھیں کیسی ہوں گی وغیرہ۔ ڈی این اے نکال کر باقی مواد اپنی جگہ رہا۔

تیسری صورت میں انہوں نے پہلا سیل' جو انہوں نے سلایا ہوا تھا اور انڈہ' جس میں سے ڈی این اے نکالا گیا تھا' دونوں کو اکٹھا رکھ کے انہیں الیکٹرک چارج دیا۔ اس سے یہ دونوں سیل آپس میں مل گئے۔ پہلے والا انڈہ' جس میں سے ڈی این اے نکال لیا گیا تھا' اور دوسرے والے سیل کے آنے سے اس کا نیوکلیئس' جو ڈویژن میں تھا' اس نے شیئر کرنا شروع کر دیا۔ ایک دو اور الیکٹرک شاکس لگے کے بعد ان سیلوں نے اپنے آپ کو ری پروڈیوس کرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک بڑی بات ہے' جو سائنسدانوں نے کی تھی۔ قدرتی طور پر اللہ نے ان میں ایسی تقسیم رکھی ہے کہ جب یہ آپس میں ملیں گے' تو یہ تقسیم ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اگر یہی فنامنا سوائے انڈے اور مادۂ تولید کے ہمارے جسم کے کسی اور حصے میں ہو' تو وہ کینسر کی طرح ڈیولپ ہونا شروع ہو جائے گا۔

اب کلوننگ ایک ایسا معاملہ ہے' جس میں بغیر مادہ تولید کو لیے آپ نے کسی بھی انسان کے جسم کا کوئی بھی سیل لیں۔ اس کو ایک انڈے کے ساتھ ملایا۔ انڈے کا ڈی این اے اس میں موجود نہیں تھا اور آپ نے اس سے ایک ایمبریو پیدا کر لیا۔ یہ ایمبریو آہستہ آہستہ ڈیولپ ہو کے انسان یا جانور کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ انڈہ اور مادۂ تولید دونوں آپس میں ملتے اور دونوں کے جنیٹک آرڈر یا ڈی این اے آپس میں ملتے' تو ایک تیسری شکل پیدا ہوتی۔ جیسے بچے ماں باپ کی طرح کے ہوتے ہیں۔ بہت سی خصوصیات' بہت سی شکلیں' آنکھیں' ناک اور بال ویسے ملتے ہیں۔ اب ڈی این اے اس خاص صورت میں صرف ایک سیل کا ہے۔ جو چیز تیار ہو گی' وہ بالکل اس کی کاپی ہو گی۔ وہ ویسی ہی ہو گی' جیسا کہ اس کا دینے والا ہے۔

دوسری اہم بات جو سائنسدانوں نے حاصل کی ہے' وہ ایمبریو کو تیار کرنے کا ہے۔ ایمبریو انتہائی شروع کی بچے کی شکل ہے۔ یہ بہت بڑی سائنسی ایجاد ہے۔ پہلی ایجاد کہ ایک ہی

ڈی این اے کو ایمبریو میں ڈالا گیا اور دوسری ایجاد کہ مادۂ تولید کی غیر حاضری میں کسی بھی انسانی جسم کے حصے کے سیل کو لے کر اس انسان کی نقل بنائی جاسکتی ہے۔ مثلاً اگر کسی انسان کا ایک بال کاٹ لیا جائے' یا اس کی جلد کھرچ لی جائے۔ پھر اس کا ایک سیل لے لیا جائے اور اس کو انڈے سے ملا دیا جائے' تو ایمبریو کا ایک پورا پراسیس شروع کیا جاسکتا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے تک یہ ممکن نہیں تھا۔ یہی کلوننگ ہے۔

میکڈوگل کو جواب

پروفیسر میگڈوگل کی باتوں کے جواب میں اقبالؒ نے لکھا کہ اگر محمد رسولؐ اللہ Psychopath تھے' تو پروفیسر صاحب ایسے Psychopath تو بار بار پیدا ہونے چاہئیں۔ دوسری بات انہوں نے یہ لکھی کہ تم اس بات پر حیران ہوتے ہو کہ وحی کیسے اُترتی ہے؟ میں ایک معمولی سا بندہ ہوں۔ وحی کا تو پتہ نہیں' مگر ایک ایک نشست میں بغیر سوچے سمجھے مجھ پر تین تین چار چار سو شعر اترتے ہیں۔ یوں مجھے پتہ ہے کہ وحی کیسے اُترتی ہے۔ اس طرح کے بہت سارے اعتراضات رسولؐ اللہ کی حالت پر ہوئے۔

مگر تکنیکی جواب اس کا یہ ہے کہ کوئی Psychopath دنیا میں کسی کو اصول نہیں دیتا۔ Psychopath کی نظر صدیوں پر محیط نہیں ہوتی۔ ہمارے پاس کسی بھی Psychopath کے اتنے بڑے نتائج موجود نہیں ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے کوئی بھی Psychopath اپنی اصل یا اپنے ایریا سے باہر کی کوئی خبر نہیں دے سکتا نہ اس کے پاس قیامت تک کی خبریں یا کوئی اصول موجود ہے۔

اہلِ مغرب کا اپنا تمام تر عقیدہ غیر منطقی ہے۔ اس لیے کہ ان کا عقیدہ اوّل و آخر معجزہ پر مبنی ہے۔ اس میں کسی قسم کی پریکٹیکل چیز شامل نہیں ہوسکتی۔ حضرت عیسیٰ پر اعتبار یا ان کے معجزات پر یقین کرنے کے لیے آپ کو کوئی دوسری قسم کی عقل چاہیے۔ ہم تو اس لیے اعتبار کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے حضرت عیسیٰ کی خبر ہے۔ مگر آپ ایک جدید مغربی آدمی سے پوچھیں کہ کیا تم اس کی پیدائش پر یقین رکھتے ہو؟ کیا ان سب واقعات' جیسے مردے کو زندہ کرنے اور برص کو اچھا کرنے پر یقین رکھتے ہو؟ وہ بڑی مشکل میں پڑ جائے گا۔ انہیں عقل و دانش

کی سطح پر ان چیزوں میں یقین دلانے کے لیے ایک بالکل مختلف ڈائمنشن کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اس لیے وہ آج کے ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کے دَور میں اپنے مذہب کی بنیادی اساس سے بہت دُور ہے۔

ایک انسان کی طرح تو عیسیٰؑ ابھی بھی زندہ ہیں' لیکن وہ ایک پریکٹیکل فلاسفر کے طور پر زندہ نہیں۔ یہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا' اس کا منطقی جواز نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں کے سوا حضرت عیسیٰ کے کاموں یا ان کی علامات کی کوئی وضاحت عیسائیت یا بائبل کے پاس نہیں ہے۔ ہم ہی ان کے گواہ ہیں۔ اسی لیے اللہ نے کہا اُمتہ وسط لتکونو شھدا علی الناس کہ ہم ہی وہ اُمت وسط ہیں' جو پہلوں پر بھی گواہی دیں گے اور بعد والوں پر بھی گواہی دیں گے۔

عرب کلچر کا انتخاب

ہم عرب کلچر کا انتخاب کیوں کریں؟ ہم اس ملک کے شہری ہیں۔ میں ان افراد میں سے ایک ہوں گا' جو کسی عرب کلچر کو پسند کرے۔ تاہم کسی بین الاقوامی شخصیت کی عادات کے ساتھ یکسانیت اس کے کلچر کے ساتھ یکسانیت نہیں۔ اگر ہم محمد رسولؐ اللہ کے ساتھ اپنی شناخت ظاہر کررہے ہیں' تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ عرب تھے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محمد رسولؐ اللہ تھے۔ آج کے دَور میں میرے دل میں سعودی عرب کے بارے میں انقباض ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے قبائلی کلچر کو اسلام کے ساتھ ضم کر کے اس کو مسخ شدہ اسلامی صورت دی ہے۔ عرب کلچر کے ساتھ ہماری کوئی شناخت نہیں۔ مگر محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ نے اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا کہ یہ عرب نہ عجم کے ہیں۔ ایک گروہ کے لیے مخصوص ہیں نہ دوسرے کے لیے وماارسلنک الا رحمة اللعالمین۔

تخلیق کار پر اعتراض

جب آپ تخلیق کار سے اس کا مقصد دریافت کرتے ہیں' تو آپ کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی تخلیق کبھی اپنے تخلیق کار سے اپنی تخلیق کے بارے میں سوال کرنے کی اہل نہیں رہی۔ ضرور

بتائیے کہ آپ کسی بھی اپنی تخلیق کو حق دیتے ہیں کہ وہ آپ کو سوال کرے؟ اگر خالق کو آج تک کسی بھی تصویر نے یہ نہیں کہا کہ تو نے مجھے مونالیزا بنایا ہے' تو اچھا بنایا ہے۔ مجھے وان گو کی ایک دشت کی تصویر بنایا ہے' تو کیوں بنایا ہے؟ آج تک کسی شاعر کو اس کی بگڑی غزل نے کوسا نہیں ہے کہ تو نے اتنے بُرے شعر میرے بارے میں کیوں لکھے ہیں؟ یہ ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔

سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ناقص معلومات رکھتے ہیں اور کم علم والے کو جب کسی بڑے سوال سے واسطہ پڑتا ہے' تو ہمارے اندر ایک شیز وفرینک گلٹ پیدا ہوتا ہے۔ ہم ضدی ہیں۔ ہم سوال کو ہر قیمت پر حل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے پاس اس کی انفارمیشن اور اس کا ڈیٹا نہیں ہوتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ذہن جب بڑی بات اور بڑے خیالات کو ہاتھ ڈالتا ہے' تو ہمارا مسئلہ قدرتی حد سے باہر نکل جاتا ہے۔

کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہمارے شوق و تجسّس کا مدعا خدا ہو' تو ہم تھوڑا سا انتظار کر کے مزید غور و فکر اور مطالعے کے ساتھ وقت گذاریں۔ کسی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ خدا تو نظر نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ ہوا بھی نظر نہیں آتی۔ کیا وہ محسوس نہیں ہوتی؟ اس کے تیز چلنے کا اور نام نہیں؟ کیا اس کی سست روی کا کوئی اور نام نہیں؟ کیا آندھی اور طوفان کا ہمارے پاس نام نہیں؟ اس کی ہر کیفیت کا ہمارے پاس نام ہے۔ تصوف خدا کو شاید بصارت سے نہیں دیکھتا' مگر اس کی بصیرت میں عام آثار موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے حدیثِ رسولؐ ہے کہ فراست مومن سے ڈرو۔ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

تخلیق کو خالق پر اعتراض کا کوئی حق تو نہیں ہے' مگر پھر بھی ہم اللہ میاں سے پوچھتے ہی رہتے ہیں۔ ہماری زبانوں پر ہزار گلے ہیں۔ اللہ میاں توں سانوں پیدا ہی کیوں کیتا سی۔ کسی شاعر نے کہا

مرارا کاش کہ مادر نہ زادے

اے کاش! مجھے ماں نے نہ جنا ہوتا اور میں حساب و کتاب کے دوران سے نہ گذرتا۔

جب ہم اللہ سے یہ کہیں کہ اے اللہ میاں! تو نے ہم سے بڑی زیادتی کی۔ اچھے بھلے عدم میں تھے۔ ہم تجھے جانتے تھے نہ تُو ہمیں جانتا تھا۔ تُو نے عدم سے وجود میں لا کر کیوں ہمیں خوار کیا؟ سچی بات ہے کہ ہمارا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ عدم سے وجود میں لانے کا صلہ اللہ نے انسان کو تمام

گناہوں کی معافی کی صورت میں دیا ہے وکتب علی نفسه الرحمة ہر حال میں رحم کرنے کا وعدہ فرمایا۔ صرف ایک ہی دلیل اس کی مخلوق کے پاس تھی کہ یا اللہ! باقی کاموں کی تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں، مگر تو عدم سے ہمیں وجود میں کیوں لایا؟ آخر کیوں پیدا کیا' اللہ میاں نے کہا' ٹھیک ہے یار! ایک کام میں کر ہی بیٹھا ہوں' لیکن اس کے عوض میں نے تمہیں اتنی آسائشات' اس قدر آزادی' اتنا کرم اور اتنی نوازش بخش دی ہے کہ اگر تم ایک دفعہ لاالہ الا اللہ کہہ دو تو تم پر دوزخ کی آگ حرام کر دی جائے گی۔ دیکھیں یہ کتنا بڑا فائدہ ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے گناہوں کا بڑا خوف ہے۔ میں ڈرتا ہوں۔ میں بڑا پریشان ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے کہا قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسهم ان سے کہہ دو' میرے بندو! تم نے بڑے گناہ کیے لاتقنطو من رحمة اللہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ کیوں نہ ہو؟ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا بیشک تمہارا اللہ تمام گناہ معاف کرتا ہے۔ اس کے باوجود آپ اللہ خالق کو زیادتی کرنے والا کہیں' تو بڑی مایوس کن حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

مگر پھر بھی ہم پوچھتے ہیں کہ اے اللہ تو نے کیوں ایسا کیا؟ کہتا ہے' بات سنو! تم دس پندرہ روبوٹس بنا لو اور پھر ان سب میں ایک ٹیپ چڑھا دو۔ وہ صبح و شام کہیں' میرا مالک بہت اچھا ہے' میرا مالک بہت اچھا ہے۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! ذرا میری جگہ بیٹھ کے دیکھو کہ پندرہ سولہ ٹیپیں چل رہی ہوں اور ان سب میں سے ایک آواز نکل رہی ہو' پروفیسر صاحب بہت اچھے! پروفیسر صاحب بہت اچھے! تو مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔ میں تو چاہتا تھا کہ میری تعریف سوچنے سمجھنے والے کریں۔ میں ان کو چوائس دوں۔ وہ اپنی عقل استعمال کریں۔ وہ میرے حق میں سوچیں۔ وہ میرے خلاف سوچیں۔ ان کو مکمل آزادی دوں ان ھدینه السبیل اما شاکرا و اما کفورا میں نے تمہیں عقل و شعور اس لیے بخشا کہ چاہے تو انکار کرو' چاہے تو مانو۔ جب وہ لبرٹی دے گا' اس کی آرزو ہے کہ تم اس کی تعریف کرو۔ گویا اللہ نے مخلوق کو اپنے تعارف کے لیے پیدا کیا۔

سورۂ بقرہ کی آیات

میں وہ آیتیں آپ کو سنا دوں ان الذین آمنه والذین ھاروو النصری

والصائبین من آمن باللہ والیوم الاخر؛ عمل صالحا اصل میں یہ جملہ بتاتا ہے کہ اس سے پہلے جو قومیں اللہ پر ایمان لے آئیں۔ یعنی مسلمانوں کا ذکر پہلے ہے' کیونکہ یہ موجود اور حاضر ہیں اور اس کے بعد باقی اقوام کا ذکر ہے' جو ان سے پہلے گزر گئیں۔ صابئین' یہود و نصاریٰ۔ خدا وہاں یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہے کہ ان مومنین میں اب جو ایمان لائے ہیں اور ان قوموں کے ایمان لانے والوں میں' جو اس سے پہلے ایمان لے آئے ہیں' اگر انہوں نے اچھا ایمان رکھا ہے' تو خدا ان کو معاف کر دے گا۔ جملہ خود بتاتا ہے کہ اگلا حصہ ماضی پر قابلِ نفاذ ہے اور یہ حصہ موجود پر قابلِ نفاذ ہے۔

دانش گاہ مذہب و سائنس

میں اکثر سوچتا تھا کہ مسجد کے حوالے سے تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ نماز کی جگہ ہے۔ میں مسجد کو ہمیشہ علم کی جگہ سمجھتا چلا آیا ہوں۔ اسی طرح انکوائری یا تجسس کو کسی بھی انسان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ میرے ذہن میں ہمیشہ ایک ایسی درسگاہ کا تصور رہا' جس میں لوگ اپنے شکوک وشبہات اور خیالات کو بڑی بہادری اور دلیری سے بغیر کسی غم و غصے اور کسی اندیشے کے بیان کریں۔ وہ لوگ' جو مذہب اور علم و دانش کے ماہر ہوں۔ وہ ایک آدمی نہ ہو' بلکہ بہت سے ایسے ماہرین ہوں' وہ سوالات کا جواب دیں۔ اُمت مسلمہ کے علم کی کمی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی فلکسڈ اینٹوں کی مسجدوں میں مقید ہیں۔ اگر ہم وسیع البنیاد ماحول پیدا کر سکیں' جس میں شاید انگلینڈ کے ہائیڈ پارک کی طرز موجود ہو اور ہمارے اپنے اہرام مساجد بھی موجود ہوں' تو پھر ہم ایک نئی اور تازہ انکوائری کی بنیاد رکھ سکتے ہیں اور علم میں اصول کو منقطع کیے بغیر ہماری ذہنی ایڈجسٹمنٹ ہو سکتی ہے۔

اس کے لیے میرے تصور میں یہ تھا کہ ہم اعلیٰ ترین علوم کی ایک یونیورسٹی قائم کریں' جس کا نام اسکول آف ریلیجن اینڈ سائنسز ہو اور ان علوم کی وجہ سے جو سوالات ذہن انسان یا مسلمان کو شک وشبہ کی طرف لے کر آتے ہوں' ان کا تجزیہ اعلیٰ ترین فلسفیانہ سطح پر کریں اور دلائل کے ساتھ ہم ان شکوک وشبہات کو رفع کریں' تاکہ اُمت مسلمہ اپنے دینی میٹافزکس کو حقیر سمجھنا چھوڑ دے۔

اکثر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ مسلمان کسی سوال یا جواب میں شدت پسند ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے پاس جواب ہونا نہیں ہے۔ وہ انکوائری کا سامنا نہیں کر سکتا۔ چونکہ یہ انکوائری ابلاغ اور انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ ایک ایسا تیزی سے پھیلتا ہوا آسیب ہے' جو گھر گھر کمپیوٹر اور اطلاعات کے میڈیا کے ذریعے پھیل رہا ہے' تو آپ کسی بچے یا بڑے کو غیر آگاہ نہیں رکھ سکتے۔ خاص طور پر آزادانہ آراء' انتخاب اور سوالات مغرب سے آرہے ہیں اور آپ بھی دل سے چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے جدید رہیں۔

مجھے سمجھ نہیں آتی' آج کل جس قسم کے پیٹرن آف ریلیجن بن رہے ہیں' ہم ان کو مسلمان کہیں یا کیا کہیں؟ اگر ان کے پاس جنگ و جدل کی وجہ نہ ہو' تو ان میں سے اکثر بچے میٹرک میں فیل ہو جائیں یا ایف اے کو الیفائی نہ کر سکیں۔ یہ اپنے تعلیمی میدانوں کے بھگوڑے اگر جہاد کو جائیں گے' تو اس جہاد کی کیا قدر ہوگی؟ یہ تو میری بھی خواہش ہے۔ مگر میں مقدر پرست ہوں اور میں آج آپ کے سامنے یہ تصور ضرور دے دیتا ہوں کہ ہم ایک یونیورسٹی یا ادارہ قائم کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ دُعا کریں کہ اگلی مرتبہ ہم ایسے ہی مقام پر علم کا ابلاغ کریں' جہاں کشادگی بھی ہو۔ جگہ بھی ہو اور جہاں ایک مستقل حیثیت بھی نصیب ہو۔ باقی نقشہ ہمارے ذہن میں بن چکا ہے۔ صرف مال ہمارے پاس نہیں ہے۔

رجوع کس سے؟

میں کہاں جاؤں؟ آپ کہاں جائیں؟ متصادم' متبادل' متخالف سکولوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے' ان کانٹے دار جھاڑیوں سے کون دامن بچائے' جہاں چھوٹے چھوٹے اکٹھ بنے ہوئے ہیں۔ جو سوال آپ نے مجھ سے کیا ہے' آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ اگر آپ تھوڑی سی جدوجہد' تھوڑا سا مطالعہ اور خیال اور تھوڑی سی کوشش خدا اور رسولؐ کے بارے میں ذاتی میراث علم کی حیثیت سے کریں' تو ان شاء اللہ العزیز جن لوگوں سے آپ کی زندگی عذاب اور کوفت میں ہے' ان سے بہت بہتر جان لیں گے اور بہت اچھے استاد بن کر نکلیں گے۔ اگر آپ کے دل میں اللہ کے لیے اخلاص اور طلب ہے۔ شیطان کے اس جواب میں ہے کہ میں تیرے بندوں کو بہکاؤں گا۔ آگے سے' پیچھے سے' دائیں اور بائیں سے اور میں انہیں اغوا کروں گا' تو خدا نے کہا کہ ہاں الا عبادہ اللہ المخلصین مگر جن لوگوں کو میرے ساتھ اخلاص ہے' ان کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

بنیادی اپروچ آپ کے پاس ہے۔ تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ خدا نے کہہ رکھا ہے کہ کسی مسئلے میں شبہ پڑ جائے' زیغ فی قلوبھم ہر مولوی مُلّا یا ہر استاد کے پاس نہ جائیے گا۔ بلکہ والرسخون العلم یقولون کل من عند ربنا صرف ان لوگوں کے پاس جائیے' جو علم میں راسخ ہیں۔ جو ہر چیز کو اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ جو علم کو خدا کی تخصیص سمجھتے ہیں اور روزانہ اللہ کے سامنے اس لیے سربسجود ہوتے ہیں کہ ربّ زدنی علما یہ بات پروردگار نے اپنے پیغمبر کو

بھی ارشاد فرمائی۔

رسالت گرامی مآب ﷺ کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو چھپا ہوا ہو۔ ایک لاکھ 36 ہزار احادیث میں سے تکرار کو نکال دیں تو بخاری میں چار ہزار آٹھ سو کے قریب ہیں۔ مسلم میں بارہ سے چودہ ہزار اور سنن ابی داؤد میں آٹھ ہزار کے قریب احادیث ملتی ہیں۔ یہ تمام احادیث افعال رسولؐ اعمالِ رسولؐ اور کلماتِ رسولؐ ہیں۔ کسی بھی معاملے میں جب بھی ہمیں کوئی پیچیدگی آ جائے اور ہمیں ذاتی محنت کی عادت ہو تو ہم اپنے خلوص و محنت سے خدا کے رسولؐ کی تائید اور محبت حاصل کر سکتے ہیں۔ رسول کائناتؐ ہمارے لیے بہترین نمونہ اعتدال زندگی ہیں۔ حضورؐ نے خود فرمایا کہ اعتدال اختیار کرو اور اگر مکمل اعتدال نہ ہو سکے تو کم از کم اس کے قریب ترین رہو۔ جو چیز ہم دوسروں کو دینا چاہتے ہیں آپ کی اس سے اپنی جان بھی بچ سکتی ہے۔ یہ آپ کو خود کرنا ہوگا۔

زندگی میں تشنگی

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسانی زندگی میں اتنی تشنگی کیوں ہے مگر یہ ہے کہ انسانی زندگی میں اتنی تسکین کیوں ہو۔ ایک ایسے مقام اور ایک ایسی زندگی میں جس کو لمحاتی، وقتی، قلیل، لہو ولعب اور معمولی قرار دیا گیا ہو اس میں اطمینان کی طلب کیوں ہو؟ قرآن کہتا ہے وما الحیوۃ الدنیا الا قلیلاً وما الحیوۃ الدنیا الا لھو ولعب اور قرآن ہی کا کہنا ہے کہ وما الحیوۃ الدنیا الا غرور کہ حیات دنیا سوائے فریب تصور کے اور کچھ بھی نہیں۔ ایک مختصر سا انتہائی قلیل وقفہ حیات ہے۔

پروردگار نے جب انسان کو زمین پر بھیجا تو لگتا ہے بادل نخواستہ بھیجا۔ جنت سے نکال کر ایک بات اسے کہی ولکم فی الارض مستقراً ومتاع الی حین کہ اس زمین پر آپ کا تھوڑا سا فائدہ ہے جہاں ہم آپ کو بھیج رہے ہیں۔ تھوڑے سے فائدے، ٹیسٹ اور تھوڑی سی آزمائشوں کے لیے تم وہاں جا کے دل لگا نہ بیٹھنا۔ اسی لیے رسول اللہؐ نے فرمایا الدنیا سجن المومن کہ دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔ سو اس میں تشنگی کا احساس تو ہوتا ہے۔ جب انسان تکمیل آرزو کے مراحل تک پہنچتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس قابل ہوا ہے کہ اپنی تمام زندگی کی محنت شاقہ کے بعد اس سے فوائد حاصل کر سکے تو اسی وقت ملک الموت کا بلاوا

آ جاتا ہے اور تمام کوشش، جدوجہد، مال واسباب اور تمام متاع دنیا چھوڑ کر اسے رخصت ہونا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی تشنگی کی وجہ اس عرصہ قلیل میں مختصر قیام ہے اور اس کے بعد رخصتی ہے۔

دُعا سے متعلق تصوّرات

بہت سارے لوگ دُعا کے بارے میں بڑے عجیب سے نظریات رکھتے ہیں۔ مثلاً کسی شریف آدمی کو کہا جائے کہ آپ ہمارے لیے دُعا کریں، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں اس قابل کہاں۔ بلکہ آپ میرے لیے دُعا کریں۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں اس قابل کہاں۔ بلکہ آپ میرے لیے دُعا کریں۔ جتنی دُعائیں اور جتنی تسبیحات میں نے آپ کو دی ہیں، وہ سب کی سب رسولؐ کی ہیں۔ جیسے **اللھم اعنا علی ذکرک و شکرک و حسن عبادتک یا اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا و اجر نا من خزی الدنیا و عذاب الآخرہ۔**

جب حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ جنت میں ایک مقام وسیلہ ہے۔ میں اپنے خدا سے اُمید کرتا ہوں کہ مجھے یہ مقام عطا کیا جائے گا۔ تم بھی میرے لیے اس مقام کی دعا کرو۔ دعا کوئی ایسی چیز نہیں، جو ایک مقدس کرتا ہے اور ایک غیر مقدس نہیں کرتا۔ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ ایک فاسق کی دعا قبول کی جاتی ہے اور ایک مقدس کی دعا کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ آپس میں سلام کے بعد سب سے بڑا رشتہ دعا کا رکھیں۔ اس لیے میں آپ سب سے اپنے لیے بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں۔

قبولیت دُعا کا فلسفہ

جسے آپ دُعا کا نہ سنا جانا کہتے ہیں، اس میں صرف علم کا فرق ہے۔ آپ ایک چھوٹی سی جگہ میں قید ہیں۔ آپ کا ایک چھوٹا سا وقت ہے۔ خدا زمانوں و آسمانوں سے بالاتر آپ کے آگے بھی دیکھ رہا ہے۔ آپ کے اردگرد بھی دیکھ رہا ہے۔ اس کو مکمل یہ اختیار حاصل ہے **ولا یحیطون بشئی من علمه الا بماشاء** جو چیزیں آپ کو نظر نہیں آتیں، وہ اس کے علم میں ہیں۔ جو چیزیں گزر گئیں، وہ بھی اس کے علم میں ہیں۔ آپ لاعلمی، حماقت اور محدود حیثیت میں ایسی

دعائیں مانگ جاتے ہیں جو آپ کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے وعسی ان تکرھوشی وھو خیرلکم کسی چیز سے تم کراہت کھاتے ہو اس میں خیر ہوتی ہے وعسی ان تحبوسی وھو شرلکم اور کسی چیز سے تم محبت رکھتے ہو اس میں شر ہوتا ہے واللہ یعلم وانتم لاتعلمون اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

دُعا نہ قبول ہونے کی صرف یہ وجہ ہے کہ اللہ جانتا ہے جو دعا آپ مانگ رہے ہیں آخر کار یہ غلط نکلے گی۔ یہ دعا آپ کو تکلیف دے گی۔ آپ کا مستقبل اور آپ کا دین خراب کرے گی اور یہ آپ کی زندگی پر بوجھ بن جائے گی۔ اس لیے وہ آپ کی سسکیاں بھری دعائیں بھی نہیں سنتا۔ آپ کی دعائیں ہیں بھی کتنی؟ میں نے اپنے تجربے کے مطابق لوگوں کو تین چار دعائیں ہی مانگتے دیکھا ہے۔ آپ کی دعا کبھی تبدیل ہی نہیں ہوتی۔ آپ کی دعا اور نفس کی ترغیبات ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ خدا تھوڑی سی کوفت بھی دینا چاہتا ہے کہ درجات علم اور مراتب خیر بڑھائے۔ وہ آپ کو آخرت میں بھی بسانا چاہتا ہے۔ آپ صرف دنیا میں ہی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تھوڑا سا فرق ہے۔

عاجزی کے لیے دُعا

عاجزی ایک لفظی اور ایک ذہنی کیفیت ہے اور ذہنی کیفیت آدمی کی صرف علم سے مرتب ہوتی ہے۔ جیسے قرآن حکیم نے فرمایا انما یخشی اللہ من عبادہ العلما کہ علم والے ہی اللہ سے ڈرتے ہیں اور ڈرنے والے ہی عاجز ہوتے ہیں۔ مگر ایک منکسر مزاجی وہ ہے جو جان بوجھ کر ملمع کاری اور منافقت کی خاطر کی جاتی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو مجبور کرتا ہے کسی صورتحال کے لیے کہ میں عجز کا اظہار کروں۔ وہ اپنے آپ کو فریب تقدس دے رہا ہوتا ہے۔ عاجزی بھی ایک نارمل ٹمپر اور عمومی روّیہ انسان کا ہے جو کسی بھی حال میں چیلنج نہیں ہوتا۔ ہر انسان کے ساتھ مراتب اصول کے مطابق روّیہ رکھنا خدا سے ڈرتے رہنا اس بات سے کہ اس کے کسی طرز عمل سے کسی دوسرے کو انانیت کا گمان نہ ہو اسی کو عاجزی کہتے ہیں۔

کافر رشتہ دار اور دُعا

یہ غلط بات ہے کہ رکاوٹ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ نے کہا' اے ابراہیم! اس کے لیے دُعا مت مانگ۔ اللہ نے انہیں منع کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کو قیامت کے دن جب شفاعت کے لیے کہا جائے گا' تو وہ عرض کریں گے کہ اے پروردگار عالم! میں نے اپنے کافر باپ کے لیے دعا کی تھی' جو مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ جب انہوں نے دعا کی' تو اللہ نے کہا' اے ابراہیم! اپنے باپ کو دیکھ۔ جس کو تو باپ سمجھتا ہے' اس کو علامات میں ایک لتھڑا ہوا بجو دکھایا گیا۔ اسی طرح حضور اکرمؐ نے کہا کہ مجھے پتہ ہوتا کہ ستر مرتبہ استغفار سے خدا میری دعا قبول کرتا' تو میں ضرور کرتا۔ مگر جب روکا گیا' تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمدؐ دونوں کو روکا گیا۔ مگر شفاعت سے وہ محروم ہیں' جنہیں قرآن نے روک رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصول وضع کر دیا تھا اور پیغمبر کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ خدا کی رضا کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔

کثرتِ عبادت' کثرتِ مسائل

جب کثرتِ عبادت کی جائے اور اس کی عادت نہ ہو' تو اس کا ذہن پر اثر پڑتا ہے۔ ایک بھوت سا ذہن پر سوار ہو جائے' تو اللہ اس سے روکنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کثرتِ عبادت پسند ہی نہیں کرتا۔ کثرتِ عبادت اتنی اہم نہیں ہے' جتنی کہ کثرتِ عبادت کے پیچھے آپ کی نیت' خیال اور موقفات زیادہ اہم ہیں۔

ایک شخص نے ہجرت کی اور اپنی بیوی کے لیے کی۔ اس کی بیوی کا نام ام قیس تھا۔ ہجرت رسولؐ اللہ کے زمانے میں باقی مسلمانوں کے ساتھ کی۔ اتنا فرق پڑا کہ اس کا نام ہی مہاجر ام قیس پڑ گیا۔ اصحاب رسولؐ اسے مہاجروں میں نہیں گنتے تھے' مہاجر ام قیس کہتے تھے۔ ہمارے ایک بزرگ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ مبالغے کی حد تک روزے رکھتے تھے۔ جب دیکھو روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ بیمار پڑ گئے' تو حضورؐ پاس سے گذرے اور فرمایا' میاں! اتنی نفس کو کیوں کوفت دیتے ہو' جو تمہارے لیے وبال بن جائے؟

سوال یہ ہے کہ کثرت عبادت ہو کیوں؟ کثرت کا لفظ استطاعت سے تھوڑا سا بڑھ کر ہے۔ اگر کثرت استطاعت کی حد میں ہے' تو اسے ہم کثرت نہیں کہیں گے اور اگر آپ استطاعت سے بڑھ کر کثرت کر رہے ہیں' تو آپ ضرور بیمار پڑ جائیں گے' پاگل ہو جائیں گے۔ آپ پر کوئی نفسیاتی ڈیپریشن وارد ہو جائے گا' یا آپ خدا سے مطلق ناراض ہو جائیں گے۔

ایک شخص کو ایک بندہ وظیفہ دیتا ہے کہ چالیس دن اس کو پڑھ لو۔ پھر اس کے نتیجے میں

فلاں چیز آپ کو مل جائے گی۔ چالیس دن پڑھنے کے بعد اس کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ یہ بندہ جھوٹا ہے، جس نے وظیفہ دیا تھا۔ وہ تو کہتا ہے کہ آیت کریمہ بھی پڑھ کے دیکھ لی، کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ غلط طریقے کی وجہ سے اپنے تمام فیض ضائع کر دیتے ہیں۔ ایک بات ضرور یاد رکھیں کہ تھوڑا یاد کریں۔ زیادہ یاد کریں، مگر اللہ کو اللہ کے واسطے یاد کریں **فاذکرونی اذکرکم واشکرولی ولاتکفرون** تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا اور شکر ادا کرتے رہو اور اگر شکر ادا کرتے رہو گے، تو پھر میرا انکار نہیں ہوگا۔ پھر میرا تمہارا جھگڑا ہی کوئی نہیں۔ دین میں بھی آسانی، دنیا میں بھی آسانی۔

سختی تو اس پر ہے۔ معیشت اس کی تنگ ہے، جو چار دنوں کی زور آوری میں اس نے آرام کمایا اور سب کچھ کیا۔ جب اللہ نے پکڑ لیا، تو وظیفے شروع ہو گئے اور کثرت وظائف جاری ہیں۔ بہت سے لوگ آ کر کہتے ہیں کہ جی آخر سات سال سے اتنے وظائف پڑھ چکا ہوں اور اتنے بندوں کے پاس جا چکا ہوں، کوئی حل ہی نہیں نکلتا۔ مگر حل نکلے کیسے؟ خدا آپ کا خدا نہیں ہے۔ اب بھی نوکری آپ کی خدا ہے۔ مسئلہ آپ کا خدا ہے۔

ایک نوجوان شخص کا باپ میرے پاس آیا اور کہا، میرا بیٹا تہجد گذار ہے۔ میں نے کہا، عمر کتنی ہے؟ کہا، سترہ سال۔ میں نے کہا، وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے۔ ورنہ نوجوان کو کیا لگے کہ وہ سترہ سال میں تہجد پڑھ رہا ہے۔ اس کا تو دماغ خراب ہو رہا ہے۔ ڈیپریشن میں جا رہا ہے۔ اس کو کوشش کریں کہ وہ تھوڑا سا سوئے۔ لگتا ہے، اسے کسی ناکام محبت سے واسطہ پڑ گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایک عمر اور ایک مدت میں مذہب کی طرف رُجحان جائز ہوتا ہے۔ اللہ آپ سے کوئی انتہا پسندی کا تقاضا نہیں کرتا۔ اللہ کے لیے قتل کرنا بہت بڑی بات ہے۔ جہاد بہت بڑی بات ہے۔ شہید ہونے سے بہتر اللہ کو کیا چیز پسند ہوگی۔ مگر سختی سے یہ کہا ہے کہ قتل بھی تم میرے لیے کرتے ہو، ان اللہ یحب المعتدین خدا زیادتی کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہے۔ اللہ کیسے آپ سے بے اعتدالی کی توقع رکھ سکتا ہے۔ ایک عورت ہے۔ بے چاری رات بھر جاگتی ہے۔ بچے پالتی ہے۔ اس کو نماز مل جائے، تو اس کی شہادت آ ئی ہے۔ چہ جائیکہ وہ اپنے اوپر پریشر ڈال رہی ہو۔ رات کو بھی کھڑی ہو رہی ہے۔ بالآخر وہ خدا کے پاس تو نہیں پہنچے گی، سائیکی سینی ٹوریم پہنچے گی یا کسی پاگل خانے میں جا اترتی ہے۔

خدا کے رسولؐ کی آٹھ احادیث ہیں۔ اوپر تلے مسلم کی احادیث ہیں کہ اعتدال اختیار کرو اور اگر مکمل اعتدال نہ اختیار کر سکو تو اس کے قریب ترین رہو۔ جب آپ کو رسولؐ کثرت کا مشورہ نہیں دے رہے تو آپ خواہ مخواہ کثرت کیے جا رہے ہیں۔ کثرت ہمیشہ انتہا پسندی کی مظہر ہے اور اسلام شدّت پسندی کو پسند نہیں کرتا۔ کسی بھی صورت میں نہیں کرتا۔

حسنِ اخلاق اور منافقت

حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ کو بندے میں دو عادتیں بڑی پسند ہیں۔ ایک حسنِ اخلاق اور ایک کھانا کھلانا۔ مجھ سے انگلینڈ میں کسی نے پوچھا کہ سالگرہ منانا اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟ میں نے پوچھا' سالگرہ میں ہوتا کیا ہے؟ اس نے کہا' کچھ مہمان بلائے جائیں گے۔ اس میں کھانا پینا ہوگا۔ میں نے پوچھا' اس میں رقص و سرود یا شراب یا شہوانیت تو نہیں چلے گی؟ نہیں جی نہیں' ہم تو مسلمان ہیں۔ ہمارے لوگ کھائیں پئیں گے۔ میں نے کہا' پھر تو تم بہت بڑا خدا کی مرضی کا کام کرو گے۔ اسی چیز کی تو بار بار اللہ تاکید کرتا ہے کہ بہانے ڈھونڈتے رہو۔ لوگ بلاتے رہو۔ کھانے کھلاتے رہو۔ سو سالگرہ اللہ کو اتنی پسند ہونی چاہیے' جتنی کوئی اور سرگرمی پسند ہی نہ ہو۔

حسنِ اخلاق اور منافقت میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے۔ بسا اوقات ہم حسنِ اخلاق میں منافقت کو شامل کر دیتے ہیں۔ حضور گرامیؐ بیٹھے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ تشریف لائیں۔ ایک شخص حضورؐ کی طرف سامنے سے آتا ہوا نظر آتا۔ حضورؐ نے کہا کہ یہ اپنی قوم کا برا شخص ہے۔ جب وہ قریب آیا' تو حضورؐ اُٹھے' کھڑے ہوئے۔ اس کا استقبال کیا۔ جب وہ چلا گیا' تو حضرت اُمِ المومنین عائشہ صدیقہؓ نے بڑے تجسّس سے پوچھا' یا رسول اللہؐ! یہ کیا؟ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ وہ اپنی قوم کا بُرا شخص تھا۔ اِدھر آپ نے یہ کمال کر دیا۔ اٹھے' کھڑے ہوئے' اُسے بڑے ادب اور اخلاق سے پیش آئے۔ فرمایا' عائشہؓ! اس کی خاطر میں اپنا اخلاق تو نہیں چھوڑ سکتا۔

تو حسن اخلاق کی معراج یہ ہے کہ جہاں آپ اخلاق نہ برتنا چاہتے ہوں' وہاں برتیں۔ آپ کہتے ہیں' اس عورت یا اس مرد کو تو میں گھر میں گھسنے ہی نہیں دوں گا۔ مگر جب کوئی شخص گھر پر آ جائے۔ چاہے آپ کی مرضی کا نہ ہو' چاہے آپ کی مرضی کے خلاف ہو' تو اس کے ساتھ کشادگی قلب و نظر سے سلوک کرنا حسنِ اخلاق کا سب سے بڑا وصف ہے۔

خواب، تعبیر، اہمیت

خواب کی پانچ صورتیں ہیں۔ان میں سے چار مغربی نفسیات میں زیرِ بحث آئی ہیں۔ مختلف فلسفی اور نفسیات دانوں نے خواب کے پیٹرن کی وضاحت کی ہے۔خواب بذاتہٖ قابل بحث نہیں ہے، بلکہ خواب کے پیٹرن قابل غور ہوتے ہیں۔ حالت نوم میں ہمارا مذہبی فلسفہ یہ ہے کہ ہماری روح ملاء اعلیٰ کو سفر کرتی ہے۔ وہ مختلف عالمین سے ہوتی ہوئی مختلف مقامات پر رُکتی اور ٹھہرتی ہے۔ جب وہ مقام شیاطین عالم، جہاں شیاطین کی مجالس ہیں، سے اُوپر نکلتی ہے، تو وہاں امثال میں تین اثرات اس روحِ پر وارد ہوتے ہیں۔

ایک لفظ کی صورت میں، ایک تمثیل اور ایک حکم کی صورت میں۔ یہ اچھے خواب کی بات ہے۔ جب کوئی اچھی روح بلند ہوتی اور اس مقام سے نکلتی ہے، جہاں بالعموم شیاطین اور جنات کے اکٹھ ہیں، تو وہ ملاء اعلیٰ کو پہنچتی ہے، جہاں ملائکہ متوقع ہیں۔ وہاں تین طرح کے اسے اشارات دیئے جاتے ہیں۔ یا تو تمثیل کی شکل میں، جو آپ کبھی کبھی دیکھتے ہیں اور وہ سچ نکل آتے ہیں یا اشارہ آپ کو سمجھنا پڑتا ہے اور اس پر غور وفکر کرتے ہیں یا اس کی تعبیر کے لیے کسی بڑے کے پاس جاتے ہیں اور یا کلام کی صورت میں آپ کو بتایا جاتا ہے کہ یہ ایسے ہے اور یہ تینوں کے تینوں خواب سچے ہوتے ہیں۔

سیدنا عبدالقادر جیلانی کہتے ہیں کہ جب ہم لوٹ رہے ہوتے ہیں، تو رستے میں شیاطین اس روح کو کنفیوژ کرنے کے لیے اچھے خواب میں بری تمثیل ملا دیتے ہیں۔ وہ قبولیت اور رد اور خوف اور خوشی کا ایک عجیب سا ملغوبہ بن جاتا ہے۔ آدمی صبح اٹھ کر یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ میں نے اچھا خواب دیکھا ہے یا برا۔ اس قسم کے خواب کی کوئی وضاحت مغربی نفسیات میں نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے سمبل ایک جیسے ہیں۔ فرائیڈ درست ہوسکتا ہے، لیکن وہ خاص حوالوں سے درست نہیں ہوسکتا۔

اِسی طرح امام ابن سیرینؒ، امام جعفر صادقؒ جو ہمارے متاعِ گراں مایہ ہیں، خوابوں کے مشرقی پس منظر میں اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی ہمارے لیے اس لیے قابلِ یقین نہیں ہیں کہ صحرائی سمبل ہماری سویلائزیشن سے جدا ہیں۔ دین کا توجیہ کرنے والا اپنے ماحول اور اپنے

مقام سے ایک مکمل گرفت لے کر کسی بھی چیز پر ایک مقامی توجیہ دیتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایک مقامی توجیہ بھی وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ تمام خوابوں پر زماں اور مکاں کا اثر ہوتا ہے۔

ابن سیرین کے پاس صبح کے وقت ایک شخص آیا اور اس نے کہا اے امام! میں نے دیکھا ہے کہ میں اذان دے رہا ہوں۔ کہا' تو حج کو جائے گا۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے آ کر کہا' اے امام! میں نے دیکھا ہے' میں اذان دے رہا ہوں۔ کہا' اس کو پکڑ لو۔ یہ کفن چور ہے۔ کسی نے ساتھ بیٹھے ہوئے کہا' امام! یہ کیا بات ہوئی۔ دونوں نے ایک ہی خواب سنایا۔ ایک کو کہتا ہے' حج پر جائے گا۔ دوسرے کو کہتا ہے' یہ کفن چور ہے۔ انہوں نے کہا' وقت نہیں دیکھتے' دوپہر کو بھی کوئی اذان دیتا ہے۔

سو' تعبیر کرنے والا خواب سے ہمیشہ اہم ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول گرامی مرتبتؐ نے مشورہ دیا کہ خواب کی تعبیر اچھی دیا کرو۔ اس لیے کہ بہر حال بہت سارے خواب جو بُرے ہوتے ہیں' وہ حقیقت میں علامتی لحاظ سے بُرے نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر آپ خواب دیکھتے ہیں کہ آپ کو پھانسی ہو گئی۔ تعبیر یہ ہے کہ آپ برائی سے روک دیئے گئے۔ خواب میں آپ نے دیکھا کہ آپ کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ تعبیر یہ ہے کہ کسی شر سے آپ کو روک دیا گیا ہے۔

سو' کوئی بھی خواب کم علم کے پاس آ کر وہم اور وسوسہ بن جائے گا' جبکہ کسی اچھے اور سمجھدار آدمی کو سنایا گیا خواب آپ کو ہمیشہ تسکین دے گا۔ برے خواب برے شگون کی طرح ہوتے ہیں۔ حدیث رسولؐ ہے کہ جب تم کو کوئی برا خواب آئے' تو بائیں طرف تین دفعہ تھتھکار کے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھ دو' وہ علامت کبھی حقیقت میں نہیں ڈھلتی۔ وہ خواب کبھی حقیقت میں نہیں آئے گا۔

جہاں تک یہ سوال کہ بعض اہل تصوّف کی نظر میں سوتے میں روح پرواز کرتی ہے اور ایتھر سے ہمارے لیے اطلاعات لاتی ہے' جو ہمیں خواب کی صورت میں نظر آتی ہیں' کم علمی کے باعث اور مبہم اشیاء پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر ایتھر کا کوئی تصور موجود نہیں ہے اور جو ہے' وہ پرانے قصے کہانیوں اور سلسلہ عظیمیہ کی کتابوں میں یا پیرا سائیکک انسٹیٹیوشنز کی صورت میں موجود تھا' اب نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہل تصوف کی سوتے میں روح پرواز کرتی ہے' وہ کسی بھی دوسرے آدمی کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ سادہ سی بات یہ بھی ہے کہ ایک فاسق کا خواب صحیح ہوتا ہے' جبکہ ایک مقدس کا غلط ہوتا ہے۔ کسی نے ابن عربی سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بدکرداروں کے خواب صحیح نکلتے ہیں' نیکوکاروں کے کیوں غلط نکلتے ہیں؟ ابن عربی نے کہا کہ بالکل سفید کپڑے پر ایک سیاہ داغ بڑا نمایاں ہوتا ہے اور بالکل سیاہی پر سفید داغ ہو' تو وہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اس لیے جو بداعمال شخص ہے' کبھی کبھار اسے ایک اچھا خواب آئے گا' تو وہ یقیناً سچا ہوگا۔ امام مسلم بن حجاج نے کہا کہ اہل خیر جھوٹ بڑا بولتے ہیں۔ ان کے خوابوں میں اکثر مکر اور ریا کے آزمائشی پیٹرن کا دخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے الہام پر مبنی ان کے بیشتر خواب غلط ہوتے ہیں۔

دلوں پر مہر کیسے

میرے شیخ علی بن عثمانؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے دل پر دو طرح کے حجاب وارد ہوتے ہیں۔ ایک کو وہ خطرات کہتے ہیں۔ ایک کو وطنات کہتے ہیں۔ جب پہلی مرتبہ دل پر کوئی خطرہ وارد ہو' تو وہ کچھ دیر کے لیے ٹھہرتا ہے اور انسان ندامت سے رجعت کرے' تو وہ خطرہ دُور ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کا دل' صاف اور شفاف ہو جاتا ہے۔ مگر اگر خطرے کی نگہداشت نہ کی جائے' تو وہ خطرہ وہاں موجود رہتا ہے۔ اس کی سینس بڑھتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ خطرہ وطن بن جاتا ہے۔ جب کوئی خطرہ وطن بن جاتا ہے' تو وہ خطرہ حجاب اور رہن بن جاتا ہے۔ حجاب اور رہن دل کو مستقل گرفت میں لے کر حقیقت شناسی خداوند سے دُور کر دیتا ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ دلوں پر مہر لگانے کے ذکر کی مثال دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مہر کیسے لگتی ہے؟ کیا بعض پیدا ہی مہر کے ساتھ ہوتے ہیں یا کہ یہ ایک degenerating process ہے۔ ایک ایسا پراسیس' جس میں دین فطرت پر پیدا ہوا بچہ یا ایک انسان اپنی سلامتی صحت کے ساتھ ہوتے ہوئے اس میں گنجائش پیدا کرتا ہے۔ اس بات میں مجھے سب سے زیادہ خوبصورت بات سیدنا علی بن عثمان ہجویریؒ جو میرے مرشد ہیں اور تصوف میں میرے استاد ہیں' کی اچھی لگی۔ فرمایا کہ حجابات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ حجابات ہیں' جو وقتی اور

عارضی ہیں اور دل پر توقف نہیں کرتے۔ یہی بات اللہ کریم نے قرآن حکیم میں بھی فرمائی کہ ہوسکتا ہے' تم چھوٹے بڑے گناہوں میں ملوث ہو جاؤ اور بہت ساری ایسی خطائیں کرو' جو بظاہر تمہارے دل کو تاریک کر دیں۔ مگر میں بھی تمہیں یہ گنجائش دے رہا ہوں کہ **واجتنبو الکبائر والاثم والفواحش** اگر تم بڑے گناہوں سے پرہیز کرو' تو کچھ میں تو تم ٹھہرو گے۔ لم کہتے ہیں چھوٹے سے ٹھہراؤ کو۔ خدا کہتا ہے کہ کچھ پر تو تم ٹھہرو گے ہلکا ہلکا۔ لیکن ٹھہرنے کے اس عمل کو ہم مہر نہیں کہتے۔ دل کو جب ایک قطرہ زنگ لگتا ہے۔ جب ایک حجاب دل پر وارد ہوتا ہے' تو پھر اللہ نے اس کے پراسیس رکھے ہیں۔ عبادات اور توبہ رکھی ہے۔ یہ پراسیس بیس سال میں پورا ہوسکتا ہے' تیس سال میں بھی پورا ہوسکتا ہے ایک نومولود بچے پر مہر آخری عمر میں بھی لگائی جاسکتی ہے۔

تو مہر کا لفظ ضرور ہے' لیکن یہ اپنے پروسیجر میں بنتی ہے۔ اس لیے کسی کا یہ کہنا کہ ایک دَم سے مہر لگتی ہے' غلط ہے۔ بلکہ یہ رفتہ رفتہ وارد ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں بیشتر آیات کفار مکہ پر اتریں اور ہر بار انہیں وعید عذاب دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج نہیں تو کل تم جہنم میں ضرور جاؤ گے۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ ساری مہریں ان پر لگ چکی ہے۔ اپنے پیغمبر کو جلاوطن کر دیتے ہیں۔ ان سے جنگیں لڑتے ہیں۔ کشت وخون ہوتا ہے۔ مگر کیا آپ انجام جانتے ہیں؟ **لا تثریب علیکم الیوم** جب حضورؐ کعبہ میں وارد ہوئے۔ سند رسالت بلند ہوئی اور جزا وسزا کا فیصلہ کیا گیا' تو مکہ میں چار پانچ کے سوا کوئی کافر نہ تھا۔ کیا آپ اسے مہر کہیں گے؟ خدا تعذیب اور تعظیم کے لیے الفاظ ضرور سخت استعال کرتا ہے۔ مگر اس کے پیچھے عنایات' رحمت ومحبت کا ایسا دریا موجزن ہوتا ہے' جو ان اصطلاحات سے متاثر نہیں ہوتا۔

مومن ہونے کا ٹائٹل

میں نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان مومن نہیں ہوسکتا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ کوئی مسلمان ازخود مومن کے ٹائٹل کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ میں کلمہ پڑھتا ہوں۔ پانچ ارکان خمسہ کی پابندی کرتا ہوں۔ مسلمان کہلواتا ہوں۔ یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ مگر مومن ہونا ایک کیفیت ذات اور داخلی ہے۔ اس کا تعلق ہماری اس ججمنٹ سے نہیں ہے' جو ایک خارجی ججمنٹ ہے۔ بلکہ اللہ عالم الغیوب ہے۔ دلوں کا جاننے والا ہے۔ ایمان خفی ہے' ظاہرہ نہیں ہے۔ ہاں اگر

ایمان ہوگا' تو اس کی کوئی نہ کوئی قسم جلی میں ضرور ظاہر ہوگی۔ ایک شخص جلی میں کتنی بھی عبادات کیوں نہ کرے' وہ پھر بھی ایمان سے خالی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث کے مطابق ایک شخص جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ لڑا۔ بظاہر وہ مسلمان تھا۔ بہت کشت وخون کیا۔ بڑی شجاعت سے لڑا۔ مگر حضور گرامی مرتبتؐ نے فرمایا کہ وہ شخص دوزخی ہے۔ اسی طرح عبادت ظاہرہ اندرونی ایمان پر دلیل نہیں بنتی۔ صرف اور صرف خدا ہی اس کی ججمنٹ کرسکتا ہے کہ کون مومن ہے اور کون نہیں ہے۔ اسی لیے میں اور آپ یہ دعویٰ نہیں کرسکتے۔

صبر کیا ہے؟

صبر کی تعریف اللہ کریم نے حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے واقعہ میں دی ہے۔ جب بار بار حضرت موسیٰ سے پیغمبر ہونے کے باوجود حضرت خضر نے ایک بات کی کہ کیف تصبر و مالم تحب بہ خبرا تجھے صبر کیسے آئے، تجھے علم جو نہیں ہے۔ علم سے صبر آتا ہے، جب تک آپ کی نگاہ آگے نہیں بڑھتی اور غور و فکر نہیں بڑھتا۔ کم علمی کے ساتھ طبع انسانی ہمیشہ اعتراض پر جاکے رُکتی ہے۔ جیسے جب کم انفارمیشن اور کم علم کے ساتھ بڑا سوال اٹھایا جائے گا، تو ہمیشہ اس میں ایک بے صبری اور عجلت سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت آ جاتی ہے۔ اسی لیے ہم بہت جلد اپنی انرجی خرچ کرتے ہوئے مختلف مسالک پر مضبوطی سے قائم ہو جاتے ہیں۔ ایک عبوری دور میں سے گذر رہے ہیں، جبکہ تمام زندگی سیکھنے کے لیے ہے۔

ایک صاحب نے ہمیں کہا کہ میں خدا میں یقین نہیں رکھتا۔ میں کمیونزم کو مانتا ہوں۔ ہم لاہور میں تھے۔ میں نے اس سے پوچھا، آپ کتنے عرصے سے اس یقین پر قائم ہیں؟ میں گذشتہ پچیس برس سے اس پر ڈٹا ہوا ہوں، اس نے کہا۔ میں نے کہا، پچیس سال سے آپ نے کسی قسم کی کوئی ترقی نہیں کی؟ کیا آپ نے ذہن کو بلاک کر رکھا ہے؟ آپ نے ڈیٹا فیڈ کر دیا ہے اور کوئی چیز اس میں داخل کرنے کی کوشش نہیں کی؟ اس طرح آپ نے زندگی کے پچیس برس ضیاع میں گذارے، اگر آپ سیکھ نہیں رہے۔

تمام عرصہ تربیت، زندگی سے سیکھنے اور علم حاصل کرنے کا نام ہے۔ جہاں ہم رُک

جاتے ہیں' وہاں ایک بت خانہ اور ایک Occult پیدا ہوجاتا ہے اور آپ اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ آگے کی طرف پیشرفت نہیں کر رہے۔ جس کا علم حرکت کرتا ہے' وہ محدودیت سے لامحدودیت کو جاتا ہے اور لامحدودیت میں وہ کبھی مرگ پذیر نہیں ہوتا۔

فطرت کے بارے میں

دو ارب سال سے' جب سے زمین بنی اور حیات انسانی کا پہلا سیل وجود میں آیا۔ پھر پوری زندگی اس سیل سے پروموٹ ہوتی کئی منازل اور مراحل سے گذرتی ہوئی موجودہ انسان کے تشخص تک پہنچی' تو اس ساری زندگی میں بیشتر حصہ انسان نے جانورانہ جبلتوں پر گذارا ہے۔ یہ جانورانہ جبلتیں ہماری ایک بنیادی فطرت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کو نفسیات نے بنیادی جبلت کا نام دیا ہے۔ اس میں محبت اور نفرت ہے اور سب سے بڑھ کر جیسے قرآن نے کہا' اس میں انسان کی بقا ہے۔ بقا کے تحت ہی انسان زندہ رہتا ہے۔ بقا کے تحت ہی وہ دفاع کرتا ہے۔ اس کی زندگی کی خواہش بڑھتی گھٹتی ہے اور جب بقا کے ذرائع منقطع ہو جائیں' تو بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان خودکشی کر لیتا ہے۔ اس لیے فطرت بنیادی طور پر ان بنیادی جبلتوں کو کہتے ہیں' جن کا ایک پیکٹ ہر انسان اور ہر ذی حیات میں موجود ہے۔ اس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ تاآنکہ انسان مجنون یا مجذوب ہوجائے یا حواس سے خارج ہوجائے۔

فطرت کے خلاف کام

(ڈاکٹر عبدالجلیل خواجہ) لفظ Wants کو ڈیفائن کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر یہ سوال گناہ کے حوالے سے ہے' تو ایک مسلمان یا مومن کا گناہ ایک ایسا اضطراری فعل ہوتا ہے' جو حالت اضطرار میں انجام پاتا ہے۔ ایک مومن سے جو خطا ہے' وہ اس کی چوائس نہیں ہوتی۔ مومن انتخاب سے گناہ نہیں کرتا۔ علی ہجویریؒ سے پوچھا گیا کہ کیا اللہ کا ولی بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوسکتا ہے؟ فرمایا' ہاں ستر مرتبہ۔ اس کی تصدیق اس حدیث سے بھی ہوتی ہے' جس میں آقا و رسولؐ نے ایک صحابی کے سوال کرنے پر فرمایا کہ ایک مسلمان اگر ستر مرتبہ بھی گناہ کبیرہ کرے۔ لیکن اخلاص سے اللہ کی طرف رجوع کرے' تو اللہ اس کو معاف کر دے گا۔ میں حدیث کا مفہوم بیان کر رہا ہوں۔

بعد میں حضرت عمرؓ کے متعجب ہونے پر حضورؐ نے دوبارہ کہا کہ ہاں عمرؓ میں نے ایسا کہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مومن گناہ ہوش وحواس سے اور پوری جذباتی وابستگی کے ساتھ ایک فیصلے کے طور پر کرتا ہے۔ بلکہ اس سے حالت اضطرار میں خطا سرزد ہوتی ہے۔ پھر وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ غلطی اس کے لیے سبق بن جاتی ہے۔ اگلی دفعہ وہ اس غلطی کے جال میں نہیں پھنستا' جس میں پھنس کر اس نے یہ غلطی پہلی یا دوسری دفعہ کی ہوتی ہے۔

یہاں اگر تو اس فرد کا انتخاب دو گناہ ہے اور وہ اس نے کسی حالت اضطرار میں نہیں کیا' تو پھر اسے اس سے تعلق ہی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کیا کرے۔ کیونکہ اس نے گناہ کا انتخاب کر کے وہ گناہ کیا۔ اگر یہ گناہ اس سے حالت اضطرار میں سرزد ہوا' تو پھر اسے اللہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ اگر اس دوران وہ اس کیفیت کا سوال کرتے ہیں' جس کیفیت میں وہ اضطرار میں ہوتا ہے اور اس کو بدی اور نیکی میں سے کسی کا انتخاب کرنا ہوتا ہے' تو اس میں پورا تصوف آ جائے گا۔ خیر وشر کے خیال کا آنا' پھر خیر کا انتخاب کرنا' اس میں بہترین طریقہ وہی ہے' جو شیخ عبدالقادر جیلانی کے مرید سے کسی نے پوچھا کہ شیخ نے وہ مقام کیسے پایا؟ آپ نے فرمایا و لاحول ولاقوۃ الا باللہ اللہ سے توفیق طلب کرنی چاہیے کہ وہ خیر اور شر کے انتخاب میں ہمیں توفیق دے کہ ہم خیر کا انتخاب کر سکیں اور شر کا انتخاب نہ کریں۔

انسان کے حیوانی مدارج

اللہ تعالیٰ نے جس حقیقت کی نشاندہی کی ہے' وہ ایسے ہی ہے۔ کیونکہ نفس واحدہ سے ساری انسانی زندگی شروع ہوئی۔ غالباً انسان ان تمام حیاتیاتی پراسیس' جن کی سائنسدان نشاندہی کرتے ہیں' میں سے گذرا اور مختلف مدارج' ماہیت کی تبدیلی اور روایتی تبدیلیوں کے بعد ہی اس منزل تک پہنچا ہے۔ مجھے ایک جرمن جینٹک ماہر کی بات یاد ہے کہ جب وہ جینیاتی تبدیلیوں کی بات کر رہا تھا' تو اس نے کہا کہ خطرہ یہ ہے کہ بڑی مدتوں اور طویل زمانوں سے جو اللہ نے ہمارے لیے جینیاتی تبدیلیاں کر کر کے ہمیں اعتدال بخشا ہے' ہم کہیں اپنی کوششوں سے اسے پھر خراب نہ کر دیں۔

تقسیم انسانیت اور مذہب

انسان کے پہلے معاشرے سے لے کر اب تک کے معاشرے میں اگر کوئی اچھی قدر موجود ہے' تو وہ صرف مذہب ہے۔ چاہے وہ کسی وقت کا بھی تھا' اس نے انسان کو اخلاقی اقدار سے روشناسی بخشی ہے۔ جبکہ انسان کی جبلی اقدار نے ہمیشہ ان روایات سے گریز کی کوشش کی ہے۔ انسانی آبادی کے نام پر آج تک جتنے بھی نظام قائم ہوئے ہیں' ان میں جمہوریت بدترین ہے۔ انہوں نے انسان کے لیے سب سے بدترین اقدار کے بحران کھڑے کیے ہیں۔ ان کی عادات و فضائل ہم دیکھتے ہیں۔ جو قوانین وہاں پاس ہو رہے ہیں۔ مرد سے مرد اور عورت سے عورت کو جائیداد کے حقوق ملکیت دیئے جا رہے ہیں اور بڑے سے بڑے ان کے جس طرز زندگی پر تفاخر محسوس کرتے ہیں' اس کے بعد میرا نہیں خیال کہ کوئی یہ بات کہہ سکے۔ مذہب سے ٹھیک ہے' کچھ ضرور لڑائیاں ہوئی ہیں۔ مگر وہ لڑائیاں بھی ان متعصب مذہبی لوگوں میں ہوئی ہیں' جنہوں نے اپنے مذہب کی روح کو نہیں سمجھا۔ جنہوں نے درگزر کرنے کو نہیں اپنایا۔ انہوں نے اختیار کردہ تعصّبات کو مذہب پر مسلط کیا ہے اور یہ مذہب کا قصور نہیں ہے۔

سود عصرِ حاضر میں

میں نے دلائل نہیں دیئے۔ صرف سود کے بارے میں ایک عام آدمی کی مجبوری کا اظہار کیا تھا کہ وہ ایک بڑے طبقے کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ ملکی یا اس سے بھی آگے کائناتی سطح کے سپر سٹرکچر کے خلاف جدوجہد نہیں کرسکتا۔ جو اس کے فرائض سے باہر ہے' وہ اس کا المیہ نہیں ہے۔ ایک فرد اگر سودی قوانین سے بچنا چاہے' تو وہ غالب امکان کے طور پر یا تو پیسے گھر میں رکھے گا یا سرے سے رکھے گا ہی نہیں۔ اگر آپ سود سے بچنا چاہتے ہوں' تو سب سے بہترین حل میری طرح کا ہے کہ پیسے بچاؤ ہی نہیں۔ اگر آپ نے پیسے بچانے ہیں' تو پھر سپر سٹرکچر آپ کا رستہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سودی نظام سے ایک ملک کے اندر جان چھڑانا بڑا آسان ہے۔ اس کی مثال ابھی بتاتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم حقیقی معنوں میں مسلمان ہیں نہ ہم طریق اسلام میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چونکہ ہم بہت ساری چیزوں کو پہلے سے ہی بغیر کسی تردد کے قبول کرچکے ہیں' اس لیے سب سے بڑی بدقسمتی ہمارے نزدیک یہی ہے کہ ہم اس نظام کو تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔ خدا کا غضب اس سے بڑھ کر اور کس ملک پر ہوگا کہ اس کی شریعت تھرڈ کلاس قانون ہو۔ آپ شریعت اسلامیہ قانون پاس کرتے' تو آپ پر کوئی گلہ نہیں تھا۔ آپ رومن قانون یا برٹش لاء کے اطلاق کو جاری رکھتے' مگر یہ خدا سے مذاق نہ کرتے کہ شریعت کے قوانین بنا کر انہیں اتنا رسوا کردیں کہ عمومی عدالت کا جج بھی اس قانون کو غیر مؤثر قرار دے سکتا ہے۔

جس ملک میں مسلمان رہتے ہوں اور اس میں شریعت ایک تھرڈ کلاس کا وجود رکھتی ہو' اس ملک پر اللہ کی رحمت کیسے ہو سکتی ہے؟ جس جج کو آپ نے سزا دینی ہو' اس کو شریعت کورٹ میں بھیجا جاتا ہے۔ نہ صرف لوگوں بلکہ حکومت اور ججوں کی نظر میں بھی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ انہیں ہائی کورٹ سے نکال کے شریعت کورٹ میں بھیج دیا جائے۔ اس سے زیادہ ذلت خدا کے قانون کی نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ خدا کے قانون کو اس طرح رسوا کر رہے ہیں اور اس کی اہمیت کو اتنا ارزاں کر رہے ہیں' تو پھر آپ خدا سے کس محبت اور مروّت کی توقع رکھتے ہیں؟ لوگوں کو کم از کم معلوم ہے کہ ہمارے عذاب کی وجہ کیا ہے۔ ایک فرد کو خدا سزا نہیں دیگا۔ وہ اپنے دوست کو کبھی نہیں بھولے گا' جو اس کو اپنی ترجیح قرار دیتا ہے۔ مگر بطور ایک قوم' اُمت اور ملک پر المیہ اور مصیبت ہمارے سر پر سوار ہے کہ ہم خدا کے قوانین کو ادنیٰ درجے سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہمارے لیے دنیا اور عاقبت دونوں کی رسوائی ہے۔

سود کے حوالے سے اللہ نے سادہ سا قانون دیا ہے کہ یمحق اللہ الربو' و یربی الصدقات اگر حکومتی سطح پر کوئی اسلامی حکومت ہو اور لوگوں کو اس اسلامی حکومت پر اعتماد ہو' تو حکومت ایک اپیل جاری کرتی ہے کہ صدقات ہمارے ذریعے خیرات کیجیے۔ ہم آپ کے لیے ایک بینک آف صدقات قائم کر رہے ہیں۔ اس بینک میں صرف ایک ارب روپیہ داخل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ارب روپیہ نہ لوٹانے کے لیے خدا کے رستے میں خیرات اور صدقات کے طور پر ہے۔ آپ یہ پالیسی بناتے ہیں کہ جن لوگوں کو ایک لاکھ روپیہ یا دس دس ہزار روپیہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے قرض درکار ہے' آپ انہیں کہتے ہیں کہ اس پر ہماری کوئی شرط یا سود نہیں ہوگا۔ بس اتنی مہربانی ضرور کرنا کہ اگر تم اللہ کے فضل و کرم سے اس پیسے سے اپنا کام اور کاروبار درست کر لو' تو کم از کم ہمیں یہ اصل ضرور لوٹا دینا' تاکہ ہم کسی اور غریب کی مدد کر سکیں۔

میں یہ چانس لینے کے لیے تیار ہوں کہ ایک ارب میں سے 80 کروڑ واپس نہیں آتا۔ لوگ فراڈ کر گئے۔ کھا پی گئے۔ مگر صدقات تو ہیں ہی اسی لیے۔ دینے کے لیے ہیں۔ صرف 20 کروڑ واپس آتا ہے یا 20 کروڑ آپ کے پاس ہے۔ مگر اگلے برس صدقات دینے والے پھر ایک ارب کے صدقات دیتے ہیں۔ اب آپ کے پاس ایک ارب 20 کروڑ ہو گیا۔ میں آپ کو پوری ایمانداری اور یقین سے کہتا ہوں کہ دس سال میں یہ بینک لوگوں میں نہ صرف شعور مروّت

پیدا کردے گا۔ اخلاقیات کا ایک نیا احساس پیدا کردے گا' بلکہ دس سال کے بعد یہی بینک کسی بڑے سرمایہ دار سے ڈیل کرے گا اور اس سے کہے گا کہ دیکھو' ہمارے پاس یہ صدقات کے پیسے ہیں۔ ہم آپ کو نہیں دے سکتے۔ سوائے ایک شرط کے کہ لوگوں کی بھلائی اس میں ہے کہ آپ ہم سے ایک کروڑ روپیہ قرض مانگنا چاہتے ہیں۔ مگر دو وعدے کریں۔ ایک تو اصل واپس موڑیئے گا اور اگر نفع کمایا' تو اس میں سے بھی خرچ کے لیے صدقات ہمیں واپس کریں گے۔ اس طرح اگر دس پندرہ برس کے عرصے میں آپ کو بینک آف صدقات سے قرض مل رہا ہو' جس میں کوئی ذمہ داری نہیں۔ سوائے ایک اخلاقی ذمہ داری کے' تو مجھے بتایئے کہ حبیب بینک اور یونائیٹڈ بینک کو کون جائے گا؟ قدرتی بات ہے کہ بغیر کسی ذمہ داری کے اگر آپ کو ایک بینک سے قرض مل رہا ہے' تو آپ دوسرے بینکوں کو کیوں جائیں گے؟ لامحالہ بینکوں کا تمام نظام صدقات بینک میں ترتیب نو پا جائے گا اور جب یہ آئے گا' تو سودی نظام خودبخود ختم ہو جائے گا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ رسول اللہ امانت دار تھے۔ لوگوں کی امانتیں رکھنے اور انہیں انتہائی دیانتداری سے تقسیم کرنے کی وجہ سے ان کو امین کہا جاتا تھا۔ اب اگر ایک بینک اپنے ساتھ یہ بھی ذمہ داری لے لے کہ آپ کے سرمائے اور امانتوں کو' جس میں مال بھی ہو سکتا ہے' اپنے پاس محفوظ رکھے۔ اس میں اسی قسم کی ڈیل ہو کہ امانت اور حفاظت سے رکھنے پر ہم آپ سے تھوڑا بہت معاوضہ لیں گے اور آپ کی امانت استعمال کی اجازت پر تھوڑا بہت معاوضہ آپ کو دیں گے' تو اس سے پورے نظام کی تطہیر ہو جائے گی۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت بھی سودی نظام میں ایک آدمی جو اپنے پیسے بینک میں رکھواتا ہے' اس پر وہ قانون لاگو نہیں ہوتا' جو شرح کے مطابق سود کی تعریف بنتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر میں کسی کو سود پر دوں' تو شرط میری ہوگی۔ مگر جب آپ بینک میں اپنے پیسے رکھتے ہیں' تو آپ کی شرائط نہیں ہوتیں' بینک کی شرائط ہوتی ہیں۔ نفع کا تعین وہ کرتا ہے۔ بغیر کسی جبر کے وہ نفع مقرر کر رہا ہے۔ اگر آپ لاکھ روپیہ اسے دیتے ہیں' تو وہ آپ کو ساتھ ایک ہزار روپیہ لوٹاتا ہے۔ یہ سود کی تعریف میں نہیں آتا۔

آپ کہتے ہیں' کوئی رقم فکس کیوں ہوتی ہے؟ افراد کی سطح پر فکس کرنا جرم ہے۔ مگر ایک بہت بڑے سسٹم میں تعین مجبوری ہے۔ کیونکہ وہ بے تکے طور پر کسی کو دس پانچ ہزار نہیں دے سکتا۔

اس لیے اس میں انہوں نے سود کی شرح مقرر کی ہوتی ہے۔ انٹرسٹ کی شرح سود کے زمرے میں نہیں آتی۔ مگر اللہ کا قانون موانعت کے بارے میں اتنا سخت ہے **فالن تفعلو فضلو بحرب من الله و رسوله** کہ اگر تم یہ کام کرو گے' تو اللہ اور رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

یوں اس کام میں خدا اور رسولؐ سے جنگ کا خطرہ ہے۔ کوئی مسلمان تصور میں بھی ایسی بات نہیں سوچ سکتا' جس سے خدانخواستہ وہ ایمان سے خارج ہو جائے اور خدا اور رسولؐ سے جنگ چھیڑے۔ آخر اس سود میں وہ کیا بات ہے کہ جس کی بنیاد پر اتنا سخت حکم لگایا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ وہ سود ہے' جو انفرادی طور پر لوگوں کو واقعتاً خراب کرتا تھا۔ تمام عمران کی سود سے رہائی نہیں ہوتی تھی۔ جو ایک جونک کی طرح انسان کے جسم سے خون چوستا تھا۔ اس نے کسی فرد و بشر کو پرانے معاشرے میں رہائی نہیں ملتی تھی۔ اس لیے یہ دوسرے کے لیے اتنا ظالمانہ اور اتنا بے رحمانہ سسٹم تھا کہ اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر آج میری نظر میں سودی نظام میں جتنا بینک مظلوم ہے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ یعنی سود دینے لینے والے کا تو مجھے پتہ نہیں ہے' مگر جو حال یونائیٹڈ بینک' حبیب بینک اور مجموعی طور پر دوسرے بینکوں کا ہوا ہے' اس میں تو لگتا ہے کہ یہ قطعاً سودی نظام نہیں ہے۔ اس میں بے چارہ سود دینے والا ادھ موا اور قریب المرگ پڑا ہے' بلکہ اس کی بنیاد پر ایک پورا سسٹم آف بینکنگ تباہ ہو گیا ہے۔ یہ ہماری کوتاہی اور غلطی ہے۔ ہمارے جزوی اسلامی کانسپٹ کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اسلام میں جزوی طور پر کوئی نہیں داخل ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ نماز پڑھیں اور روزہ نہ رکھیں۔ نماز روزہ رکھیں اور وضو نہ کریں۔ اسلام کو جب بھی کبھی آپ منتخب کریں گے اور اپنائیں گے' تو ایک مکمل سسٹم کی طرح اپنائیں گے **یایھا الذین آمنو ادخلو فی السلم کافة** اسلام ایک جزوی نظام ہے ہی نہیں۔ جمہوری سیکولر نظام کی طرح یہ ایک پورا نظام بھی ہے اور اسے مکمل نظام کی حیثیت سے قبول اور رائج کرنا ہوگا۔

سود اور ذریعہ معاش

قرآن حکیم نے سودی نظام کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی۔ تین یا چار بیانات کے علاوہ سود کے بارے میں کوئی سٹیٹ منٹ نہیں۔ بلکہ اصول کی طرف ایک سٹیٹ منٹ ہے **یمحق الله**

الربا و یربی الصدقت کہ اللہ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اس ملک میں سود کا کوئی کاؤنٹر سسٹم موجود نہیں۔ حکومت وقت' جو آپ کی وارث ہے' اللہ کے نظام کو چلانے کی ذمہ داری رکھتی ہے۔ اگر وہ سود گھٹانا چاہے' تو وہ صدقات کے نظام کو فروغ دے گی۔ خدا کے نزدیک یہ تبدیلی اتنی سادہ ہے کہ صرف ایک مرتبہ ذکر کیا' پھر موضوع کو چھیڑا ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ معیشت کا یہ سٹرکچر تبدیل کرنے کے اہل نہیں اور نظام کو بدلنے پر بالکل قادر نہیں ہیں' تو ایک عام آدمی پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

دوسرا رِسک جو اس کے خلاف ہے' وہی رِسک ہے' جو جان کا ہے۔ اگر وہی پیسہ وہ گھر رکھ لے' تو چور اُچکا' ڈکیت اور لوٹ مار سے اسے خطرہ ہے۔ اگر جان کے ڈر سے پیسے محفوظ رکھے ہوئے ہیں اور اس پر بقا کا انحصار چلا گیا ہے' تو فلا اثم الیہ اللہ کہتا ہے' کوئی گناہ نہیں۔

صدقات کا نظام

میرے خیال میں صدقات ایک فرد کی نہیں' بلکہ اس ملک کی بلا ٹال دیں گے۔ صدقات واحد نظام ہے' جو سود کو ختم کرتا ہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق صدقات کے نظام کے نفاذ کے بغیر دنیا کی کوئی طاقت سود کو ختم نہیں کر سکتی۔ پروردگار عالم نے فرمایا یمحق اللہ الربو' و یربی الصدقات اللہ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ جس ملک' معاشرے اور پورے نظام میں صدقات کی کوئی سرکاری سطح نہ ہو' وہاں سود کیسے ختم ہو سکتا ہے؟

خطبہ حجتہ الوداع کا دن ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ آج کے دن میں تمام سود باطل قرار دیتا ہوں۔ سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود ختم کرتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خطبہ کے دن تک عباسؓ سود لے رہے تھے۔ ان کو پہلے کیوں نہیں منع کیا گیا؟ بائیس برس قرآن اترتا رہا اور عباسؓ سود لیتے رہے۔ کیا اللہ کے رسولؐ شروع سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ سود حرام ہے' جبکہ دو آیات پہلے اُتر چکی تھیں۔ آخری دو آیات میں سے ایک آیت یہ تھی کہ جو یہ کام کرے گا' اللہ کے رسولؐ سے جنگ کرے گا۔ اس سے پہلے بائیس برس قرآن کے اترنے تک لوگ اس کو لیتے دیتے رہے۔ حتیٰ کہ خطبہ حجتہ الوداع والے دن حضور اکرمؐ نے سود کو اپنے تعلق داروں سے باطل کیا اور عمومی سطح پر اس کو نافذ ٹھہرایا۔ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

وجہ صرف ایک تھی کہ ابھی تک اسلام کے اپنے سسٹم نفاذ میں نہیں آئے تھے۔ اس کے زکوٰۃ اور صدقات کے نظام میچور ہو رہے تھے۔ خدا ایسا نہیں ہے کہ وہ محض نعروں سے کام لیتا۔ خدا ایسا بھی نہیں ہے کہ لوگوں کی جبلتوں پر بے جا دباؤ ڈالتا۔ خدا کو پتہ تھا کہ جب تک اس سسٹم میں متقابل نہ دے لوں، اس سسٹم کو باہر نہیں نکال سکتا۔ خدا نے انسانوں سے ایک ایک چیز چھڑانے میں سالہا سال لیے۔ کہاں وہ یسئلونک عن الخمر کا وقت اور شراب کے بارے میں پوچھا گیا قل فیھما اثم کبیرا و منافع للناس اس میں لوگوں کے لیے کچھ نفع ہے، مگر اس کی برائیاں اس کے نفع سے زیادہ ہیں۔ کسی نے چھوڑی، کسی نے نہ چھوڑی۔

کچھ اور وقت گذر گیا۔ پھر خدا نے قرآن میں فرمایا' دیکھو! تمہاری سائیکی لات و منات پر فکس ہے۔ شراب پی کر تمہارا شعوری یقین ختم ہو جاتا ہے۔ تمہارا lebido تمہارے ذہن سے لات و منات کو نکالتا ہے۔ اس حالت میں جب تم نماز پڑھتے ہو، تو تم نہیں جانتے کہ تم کیا کر رہے ہو؟ لا تقربو الصلوٰۃ وانتم سکریٰ نشے کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ۔ کچھ لوگوں نے چھوڑی، کچھ نے جاری رکھی۔ حتیٰ کہ تیسرے مقام تک پہنچ گئے۔

کیا اللہ جیسے بڑے استاد کا یہ طریقہ ہو سکتا ہے کہ بغیر وقت دیئے اور بغیر تبدیلی کے احکامات کی گنجائش فراہم کیے اچانک کوئی فیصلہ مسلط کر دے؟ اسی طرح آپ کوئی بھی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، تو اس کی قبولیت میں اس کے داخلی عقیدے کے لیے آپ کو وقت دینا لینا پڑتا ہے۔ فوری تسلیم کوئی تسلیم نہیں ہے۔ اگر ایک شخص ایک دن شراب پی رہا ہے۔ دوسرے دن داڑھی رکھ کر تبلیغ کے لیے چلا جاتا ہے۔ وہ آپ کے نزدیک مقدس ہو سکتا ہے، ہمارے نزدیک وہ ایک ارتجاعی ہے۔ اس کے باطن میں کوئی تفہیم ڈیولپ نہیں ہوئی۔ اس وقت تک، جب تک وہ غور و فکر کے ساتھ ایک شرعی فیصلہ نہ کرے کہ میں نے اس رستے سے ہٹنا ہے اور اس رستے پر جانا ہے۔

پروردگار عالم نے اپنے دین کو فہم و فراست اور اخلاق کی پختگی کے لیے پیدا کیا۔ صدقات میں سب سے بڑے صدقے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ آپ کے پورے نظام سود کو ختم کرتا ہے۔ میرے کچھ دوست صدقات بینک قائم کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا' یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ انفرادی کام نہیں ہے۔ یہ ریاست کا کام ہے۔ کل آپ کی جگہ کوئی نااہل آ گیا' تو صدقات بینک کہیں ایسا نہ ہو، کسی فراڈ کا حاصل نہ بن جائے۔ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ مذہب کے لیے یہ کوشش بھی

ایک غلط کوشش ہے۔ یہ ریاست کا کام ہے کہ لوگوں کو اس کا مقصد بتائے اور یہ بتائے کہ ہم سود ختم کرنا چاہتے ہیں اور صدقات شروع کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہر اچھا کام صدقہ ہے۔ کسی کو رستہ دکھانا' ایک کھجور دینا صدقہ ہے۔ حسن کلام اور کسی کی طرف مسکرا کے دیکھ لینا صدقہ ہے۔ اچھے چہرے کے ساتھ برے چہرے والے کو ملنا صدقہ ہے۔ صدقے کی نوعیت اندرونی بھی ہے اور بیرونی بھی۔ صدقہ احساس ہے اور عمل بھی۔ صدقہ کسی بھی معاشرے کے سخت روّیوں کو نرم کرتا ہے۔ یہ جو معاشرہ اندر ہی اندر اپنے سخت مؤقفات پر قائم ہو جاتا ہے اور جو ایک ابدی نفسیات کے تحت مقبولیت نہیں دکھاتا' تو صدقہ سے اس میں قبولیت پیدا ہوتی ہے۔ صدقہ قوتِ برداشت پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ صدقات کی وسعتیں کلام سے عمل تک ایک ہی طرح محیط ہیں۔

مہارتوں کا حصول

میں شاید اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے' خدا کی وضاحتیں اور اس کے نظام مزید نکھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ کل کی متشابہات آج کی محکمات ہو رہی ہیں۔ بعض آیات گرامی' جو اس وقت کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں تھیں' وہ آج کمپیوٹر یا جدید علوم کی وجہ سے بالکل واضح طور پر ہمیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔ سو علم جدید ہو یا قدیم' اپنے زمانے میں قوت فیصلہ رکھتا ہے۔ جب ایک شخص نے حضرت امام زین العابدینؒ سے سوال کیا کہ حضرت گرامی! آج تو آپ لوگ زندہ ہیں' جن سے ہم علم سیکھ لیتے ہیں' کل کو کیا ہوگا؟ فرمایا' ہر زمانے کا علم قرآن کی بہتر تفسیر میں مدد دیتا ہے۔ اس کے لیے آج کے علوم' آج کے زمانے میں قرآن کی بہتر تفسیر کر رہے ہیں۔ اسلام جدید علوم کے راستے کی قطعاً رکاوٹ نہیں ہے۔

رزقِ حلال کا جہاد

ہم میں اور ایمان والے میں ایک بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ ہم اس عرصے میں' جس میں ہمیں خدا پر اعتبار کرنا چاہیے' اسی عرصے میں ہم اسباب پر اعتبار کرتے ہیں۔ خدا کو ہم نے کبھی مجبوری اور جبر کے حالات میں آزمایا ہی نہیں۔ دراصل ہم بہت زیادہ کمیٹڈ نہیں ہیں۔

ایک چھوٹی سی مثال ذاتی حوالے سے کہ لاہور کالج چھوڑا، تو میرے پاس محاورتاً پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اور مجھے قرض اتارنے کے لیے اپنی ایک چارپائی اونے پونے بیچنا پڑی۔ میں وہاں سے واپس آ گیا کہ جو روکھی سوکھی مل گئی، کھا لوں گا۔ میرا اس وقت تھوڑا سا پراویڈنٹ فنڈ بنا ہوا تھا۔ جب میں وہ لینے گیا تو بادشاہ لوگوں نے کہا کہ کچھ رقم لگے گی، ایسے نہیں نکلے گا۔ مجھے اس وقت غصہ آیا۔ میں نے پروردگار سے کہا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس پراویڈنٹ میں میری زندگی ہے یا بڑے اسباب میں میری زندگی ہے؟ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور گھر آ گیا۔ خدا نے مجھے زندہ رکھا۔ دس سال بعد وہ پراویڈنٹ فنڈ میرے گھر میں میرے محکمے نے مجھے ڈلیور کیا۔

کیوں نہ ضرورت میں ہم تھوڑا سا خدا کو آزما لیں۔ جب ہم سمجھتے ہیں کہ حالات و معاملات سے کارزہو گئے ہیں۔ تھوڑا سا جھک جائیں اور خدا کو یہ بتائیں کہ ہم تم میں یقین رکھتے ہیں نہ کہ اشیاء میں، تو مجھے یقین ہے کہ آپ نہ صرف خدا کو پا جائیں گے، بلکہ ان شاء اللہ معاملات کو بھی پا جائیں گے۔

ہر سسٹم کا متبادل سسٹم

یہ تمام سوالات حکومتی ڈھانچے، معیشت کے سپر سٹرکچر اور فیصلہ سازی کے سپر سٹرکچر سے متعلق ہیں۔ اس میں ایک فرد پر وہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک عالم فتویٰ دیتا ہے کہ بینکوں کی تمام نوکریاں حرام ہیں، تو یہ فتویٰ اس عالم کی جہالت کا بین ثبوت ہوگا۔ کیونکہ اگر اس قسم کے دو چار دس فتوے اور آ جائیں، تو میرے خیال میں پاکستان میں زندگی بڑی مشکل ہو جائے گی اور ہر آدمی کام کاج چھوڑ کنارے لگ جائے گا۔ چونکہ بہت سارے معاملات میں معیشت اور معاشرت کی ذمہ داری حکومتی نظام پر ہوتی ہے، تو جب تک کوئی حکومت واضح تبدیلی کا ثبوت نہ دے اور کسی مقصدیت یا اسلام کو فروغ نہ دے، اس وقت تک اسلام جزوی طور پر کسی قیمت پر نافذ نہیں ہو سکتا۔

اسلام ایک ملا جلا نظام ہے، جس میں نظام عدل بہت ضروری ہے۔ جب آپ موجودہ زمانے میں دیکھتے ہیں، تو یوں لگتا ہے کہ اسلامی شریعت غالباً سب سے مظلوم گداؤں کی طرح ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ حضرات بیٹھے ہوئے وہاں کرتے کیا ہیں؟ تمام تر قوانین و

معاملات غیر اسلامی قوانین کے پیٹرن میں طے ہوتے ہیں۔ ہمیں خدا کی توہین کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے قانون کو ابتر حالت میں رکھتے رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسا ہی کرتے رہے' تو خدا ہمیں کبھی امن نہیں دے گا۔

فرض کیجیے کہ تمام مسلمان شعوری طور پر کسی نظام کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں' تو خدا نے ہر سسٹم کا متبادل سسٹم دیا ہے۔ جیسے کہ لوگ سود کی بات کرتے ہیں' مگر اللہ نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ تھوڑا سا غور کریں' تو پتہ لگے گا کہ پورے قرآن حکیم میں سود کے بارے میں صرف ایک آیت ہے' جو اصولی آیت ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ خدا نے کہا فان لم تفعلو فضل بحرب من الله و رسولہ کہ جو اس طرح کے کام کرے گا' وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔

مگر بحیثیت اصول سود کے بارے میں اللہ نے بڑی مختصر سی بات کی اور بات ختم کر دی یمحق الله الربوو یربی الصدقات کہ اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اگر سود سرکاری اور قومی سطح پر لیا جا رہا ہے۔ اس کو کم کرنا ہے اور خدا کو آزمانا ہے' تو آپ کو صدقات کے نظام بھی گورنمنٹ کی سطح پر بڑھانے ہوں گے۔ جب آپ کے پاس ایسا کوئی سسٹم وجود نہیں کرتا نہ آپ اس کو چلانے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں' تو جو مرضی ہے کر لیں' آپ سود سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر انفرادی سطح پر اگر کوئی مجبوری ہے۔ آپ کی سلامتی' آپ کی جان اور آپ کی زندگی اضطراب میں ہے۔ پیسہ پاس رکھنے میں خطرہ ہے' تو اوّل تو خرچ کر دیا کریں' ورنہ مجبوری کی بات اور ہے۔

حلال و حرام گڈمڈ

آج کے دَور میں رزق حلال اور حرام کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ حلال والے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے کھا رہا ہے؟ کدھر سے کما رہا ہے؟ وہ محنت بھی کرتا ہے اور تردد میں بھی رہتا ہے۔ وہ اپنی حد تک تو بڑا نیک نیت ہوتا ہے' مگر حلال کھانے کے تمام رستے اس پر بند کر دیے جاتے ہیں۔ ایسے عالم میں اس پر بھی اضطراب کا قانون لگتا ہے۔ اگر جان جا رہی ہے اور کوئی ذریعہ زندگی نہیں ہے' تو پھر اپنی حد تک حلال کھاؤ۔ جیسے یہ رشوت کا قانون ہے۔ ایک

دیانتدار آدمی بھی موجودہ کاروبار زندگی میں کسی قسم کی حرکت کو جاری نہیں رکھ سکتا' جب تک وہ رشوت نہ دے لے۔ میرے نقطہ نظر سے نقصان ہوتا ہے' ہو جائے۔ جو رزق نہیں ملتا' نہ ملے' میں اس رزق کو حاصل کرنے کی جدوجہد نہیں کرتا۔ یہ میری حد تک ہے۔ اگر کسی رزق میں حرام کا شائبہ ہو اور اس کے بغیر گزر بھی نہ ہو' تو اس پر بھی وہی اطلاق لگے گا کہ انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر۔

قرآن کی تلاوت یا مطالعہ

ہر کتاب خواہ معمولی ہو یا بڑی' اس میں کسی نہ کسی گائیڈ یا پڑھانے والے کی ضرورت پڑتی ہے۔قرآن حکیم تو اتنی بڑی کتاب ہے کہ پوری کائنات کے موضوعات اس میں موجود ہیں۔ بہت ساری قرآنِ حکیم کی شرحیں' جو میں نے دیکھی ہیں' ان میں بنیادی نقص شارح میں نہیں' بلکہ شارح کے علم کے معیار میں پایا۔ایک بڑا عالم بھی یک طرفہ عالم ہونے کی حیثیت سے کچھ آیات کی وضاحت اچھی طرح کر لیتا ہے۔مگر وہ باقی آیات کی وضاحت میں کمزور رہ جاتا ہے۔

اگر ہم علم سے تعصب نہ رکھیں اور شارح یا مفسر سے تعصب رکھیں' تو ہمارا علم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی ناقص رہ جاتا ہے۔اس میں مسلک ملوث نہیں ہے۔اسی تردد میں' میں نے لاہور میں ایک قرآن دیکھا۔اس کی اشاعت انہوں نے عدم فروختگی کے باعث بند کر دی تھی۔اشرف بک ڈپو نے اسے شائع کیا۔قرآن کا نام ''فوائد سلفیہ'' اور دوسرا ''اشرف الحواشی'' تھا۔میں اسے اپنے نصیب کی خوبی کہتا ہوں کہ مجھے یہ قرآن ملا۔اس میں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ مدون اور مرتب نے اس میں قرآن کے ساتھ ساتھ زیادہ تر اصحابِ رسولؐ کی تفسیر درج کی تھی۔میرے لیے یہ بات بڑی خوش آئند تھی کہ قرآن کی جس آیت کو اصحابِ رسولؐ جیسے سمجھا' اگر میں اس معیار اور سادگی تک پہنچ جاؤں' تو میرا نصیب بن جائے۔میں آپ کو مذکورہ قرآنِ حکیم میں اصحابؓ کی تفسیر کے جو خوبصورت پہلو نظر آئے' بتاتا ہوں۔

قرآن کی ایک آیت ہے وعبد ربک حتی یا تیک الیقن کہ عبادت کیے جا'

حتیٰ کہ تو یقین تک پہنچے۔ دیگر تفاسیر کی طرح شاہ رفیع الدین احمد نے بھی اپنے ترجمے میں یقین کا لفظ لکھا ہے۔ لیکن زیرِ نظر تفسیر میں اصحاب نے متفق علیہ یقین کا ترجمہ موت کیا ہوا ہے۔ جب میں نے موت کو یقین کی جگہ رکھ کے دیکھا' تو اس آیت کے معانی کمال کی عجیب وغریب تفسیر تھی۔ اصحابِ رسول نے یقین کا ترجمہ موت کر کے صرف ایک معمولی سی وضاحت کی کہ واعبد ربک حتی یاتیک الیقین عبادت کیے جا' حتیٰ کہ تو یقین تک پہنچے۔ Till death you can not confirm your opinion.

عبوری عرصے میں کبھی بھی اپنی رائے کو حتمی نہ جاننا۔ جب آپ زندہ ہوں اور علمی جدوجہد کر رہے ہوں' تو اس وقت تک کبھی بھی نتائج نہ نکالنا۔ اپنے آپ کو ہمیشہ ایک طالب علم کی طرح نرم رکھنا اور سیکھتے رہنا چاہیے۔ حتیٰ کہ تو موت تک پہنچے۔ میں اس شخص کا بہت شکرگذار ہوں' جس نے قرآن کا یہ ترجمہ ترتیب دیا اور وہ اتنا قیمتی قرآن ہے کہ اس کے حاشیے میں تفسیر صحابہ درج ہے۔ آج تک مجھے قرآن فہمی میں اصحابؓ کی رائے کے آگے کسی رائے کی ضرورت نہیں پڑی۔

اب ایک اور مثال سائنسی ایشو کے حوالے سے اسی قرآن میں سے بتاؤں۔ ایک جگہ قرآن نے کہا کہ زمین پہلے بنائی۔ دوسری جگہ کہا' آسمان پہلے بنایا۔ مسئلہ یہ تھا کہ زمین اور کائنات کی تخلیق کے بارے میں کس بیان کو کہاں ایڈجسٹ کیا جائے؟ کہیں ان میں تضاد نہ آ جائے۔ میں نے تقریباً تمام وضاحتیں دیکھیں۔ بڑے بڑے عالموں کی تفاسیر سے رجوع کیا' جو قرونِ وسطیٰ سے چلتی تھیں۔ کسی جگہ مجھے اس کی وضاحت نظر نہیں آئی۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ واحد تضاد تھا۔ جب میں زیرِ نظر قرآن پڑھ رہا تھا تو کسی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ٹھیک یہی سوال پوچھا تھا۔ ان کا جواب اتنا سائنٹفک تھا کہ مجھے شدید حیرت ہوئی کہ ایک صحابی کی فہم وفراست کہاں تک پہنچتی ہے۔ فرمایا کہ زمین پیدا تو پہلے کر دی گئی تھی' مگر اس کا ظہور اور پھیلاؤ بعد میں سامنے آیا۔

غور طلب بات ہے کہ دو ارب سال جمع دو ارب سال تو زمین تو پہلے چھ ارب سال میں جدا ہو گئی تھی۔ مگر اس کے پھیلاؤ اور ٹھہراؤ میں دو ارب سال اور گذر گئے اور یہ وضاحت صرف اور صرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی دے سکتے تھے۔ مذکورہ قرآن میں تاریخی پسِ منظر بھی ہے اور اصحاب کی تفسیر بھی۔

دنیاوی یا قرآنی علم

میں نے یہ بات قطعاً نہیں کی کہ دنیاوی علوم کو تلاش نہ کیا جائے' بلکہ میں نے یہ کہا کہ ہم اتنی سنجیدگی اور لگن کے ساتھ دنیاوی علوم حاصل کرتے ہیں' جو کہ ایک کم تر مقصد ہے۔ کم تر مقصد کا مطلب وہ علم ہے' جو ہمیں اپنی ترجیح اوّل کی طرف رہنمائی نہیں کرتا۔ خدا کے لیے علم کے سوا باقی تمام علوم ووکیشنل ہیں۔ ایک آرٹسٹ' ادیب' سائنسدان' ٹیچر اور فنی علوم کا استاد اپنی علمی اور ذہنی کاوش کے عوض اپنی زندگی گذارنے کے اسباب بھی مہیا کرنا چاہتا ہے' تو تمام علوم سوائے خدا کی شناخت اور پہچان کے وہ علوم ہیں' جن سے ہم زندگی گذارتے ہیں۔ کہیں بھی پروردگار یا اس کے رسولؐ نے ان علوم کی تحصیل سے منع نہیں کیا۔

ایک علم برائے علم ہے۔ بجائے علم کو توڑنے پھوڑنے کے' اسے برائے زندگی اور برائے علم رکھنے کے' اگر ہم علم برائے خدا حاصل کریں' تو پروردگار ہمیں ترجیح اوّل سے واپس لوٹائے گا۔ وہ آپ کو الیگزینڈر فلیمنگ یا آئن سٹائن سے بہت جلد اور بہت بہتر عروج اور خیال عطا فرمائے گا۔

حضورؐ نے بنو عیسیٰ میں دو بڑی خوبصورت صفات گنوائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے ظالم بادشاہوں کے ہاتھ روک دیتے ہیں۔ یتیم اور فقیر کے حق میں بڑے اچھے ہیں اور جب ان کو شکست ہو جائے' تو فوراً پلٹتے ہیں۔ یہ صفات بدقسمتی سے مسلمانوں میں نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ ان میں زیادہ موجود ہونی چاہئیں تھیں۔ بحران یہ ہے کہ اگر ایک شخص دنیا کے لیے محنت اور ترقی کرتا ہوا آئن سٹائن اور فلیمنگ یہی محنت اور جستجو اللہ کے لیے اس کے رازہائے پوشیدہ کے انکشاف اور حقائق کی جستجو کے لیے کی جائے' تو اس سے بہت کم وقت میں خداوند کریم آپ کو ایسی ایجادات اور دریافتوں سے نوازے گا' جو شاید مغرب کے تصور میں بھی نہ ہوں گی۔

قرآن اور زبان عربی

ہم جو تعلیم حاصل کرتے ہیں' بی اے' ایم اے کرتے ہیں۔ پی ایچ ڈی کرتے ہیں' تو اس کے پیچھے ہمارے ذہن کی چھوٹی موٹی سرگرمی ہوتی ہے کہ ہم نے یہ کیریئر اپنانا ہے۔ انجینئر

بننا ہے' ڈاکٹر بننا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق کوئی بیس پچیس سال کی محنت ہم اس مضمون کو دیتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح زندگی میں جس کا انتخاب اللہ ہوتا ہے' وہ اگر سال آدھ یا دو سال عربی کو دے دے' تو بطور زبان یہ سیکھنے اور اخذ کرنے میں زیادہ آسان ہے۔ ہم کم از کم اس چیز پر قادر ہو جاتے ہیں کہ قرآن کو سمجھیں۔ یہ انسان کی محنت اور لگن کے پیٹرن پر ہے کہ وہ کس چیز کو پہلے چاہتا ہے اور کیا اس کا لیول ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم ان لوگوں پر تکیہ کریں' جو ہم سے پہلے سپیشلسٹ ہوئے ہیں۔ جیسے پاکستان و ہندوستان میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر تھے۔ اگر ہم ان کے تراجم ٹھیک سے پڑھیں اور یہ سمجھیں کہ یہ عربی کے اچھے دانشور اور اسکالر تھے یا جیسے کہ آپ کو انگریزی آتی ہو' تو عبداللہ یوسف علی نے اچھا ترجمہ کیا ہے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی رستہ مل جاتا ہے۔

پھر قرآن حکیم کے ترجمے میں بھی کوئی اتفاق نہیں ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ غلطیاں ترجمے میں اس وقت ہوتی ہیں' جب ہم محاورتاً دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ان کا ترجمہ نہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر میں آپ کو ایک ترجمہ بتا رہا ہوں وجعلنا من الماء کل شئی حی ہم نے ہر حیات کو پانی سے پیدا کیا۔ اگر تو آپ اس کو سادہ رکھیں اور ترجمہ کرنے والا آپ کو یہ ترجمہ دے کہ ہم نے حیات کو پانی سے پیدا کیا' تو آپ کو کبھی کنفیوژن نہیں ہو گی۔ مگر جب مترجم یہ کہے کہ آدمی تو پانی سے نہیں پیدا ہوتا۔ وہ شبہ کرے اور ماء کی کوئی اُوٹ پٹانگ سی تعبیر شروع کر دے اور کہے کہ اس سے مراد رحم مادر ہے اور اس سے مراد جینٹک ہیومن ہیں' تو مسئلہ تو ہو گا۔ قرآن کے مخصوص تراجم میں یہ مصیبت پیش آتی ہے۔

مثال کے طور پر اللہ نے فرمایا ثم استوی الی السماء فھی دخان کہ اللہ بلند ہوا آسمانوں پر' وہ دخان تھے۔ اب اصولاً دخان کا ترجمہ شاہ رفیع الدین احمد نے دھواں کر دیا۔ یہ ترجمہ کسی دوسرے مترجم کو ٹھیک نہیں لگا۔ اس نے کہا' وہ دھواں سا لگتا تھا۔ یہ ترجمہ کر دیا۔ یہ چیزیں ہمیں ترجمے سے دُور لے جاتی ہیں۔

بعض ترجمے اتنے مزیدار ہوتے ہیں کہ جیسے خدا نے کہا' یہ یاوہ گوئی کرتے ہیں۔ اب دیکھیں' لفظ یاوہ گوئی ہے۔ مترجم نے لکھا کہ خدا کہتا ہے' یہ لوگ بکواس کرتے ہیں۔ کیا آپ کو ترجمے میں آ کر یہ عجیب نہیں لگتا؟ مترجم نے اپنے ماحول کی' محلے کی ڈور بیچ میں شامل کر دی۔

فضول گفتگو کی بجائے مترجم نے لکھا کہ اللہ نے کہا' یہ بکواس کرتے ہیں۔ بہت عجیب بات لگتی ہے کہ اللہ میاں اس قسم کی بات کیوں کہے گا۔

بعض اوقات مترجم ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں' عالمانہ نظر سے نہیں۔ بلکہ ایک مقامی نظر سے دیکھتے ہوئے ترجمے کو مشکوک کر دیتے ہیں۔ مگر الحمد للہ قرآن حکیم خالی اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ فارسی' انگریزی میں دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم تو قرآن پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اگر میں آپ کو ایک صفحہ دکھا دوں' جو صحیفہ عثمانی ہے' تو آپ اسے ایک اچنبھے کی کارروائی سمجھیں گے' قرآن نہیں سمجھیں گے۔ اللہ اپنے دین کی مدد کسی فاسق و فاجر سے بھی لے لیتا ہے۔ جب مسئلہ غیر اقوام کا پیش آیا' تو حجاج بن یوسف نے اعراب لگوائے۔ چنانچہ اب جو قرآن نصیب ہے' اس سے ہر آدمی قرآن پڑھ سکتا ہے' سمجھ سکتا ہے اور کسی مکمل عالم سے بھی اس کے سمجھنے کے لیے مدد لے سکتا ہے۔ مگر بنیادی بات یہ ہے کہ آپ واقعی خدا کے بارے میں کچھ سمجھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر وہ جذبہ موجود ہو' تو تھوڑی کوشش کے بعد اس مشکل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

میں آپ کو اپنی مثال دیتا ہوں۔ مجھے گھر پر کسی نے ناظرہ قرآن بھی ٹھیک سے نہیں پڑھایا۔ میں قرآن پڑھنے سے بھاگ جاتا تھا۔ پوسٹ گریجوایشن میں لٹریچر پڑھا۔ دنیا جہان کے فلسفوں کا مطالعہ کیا۔ پھر مجھے اللہ کا شوق پیدا ہوا۔ اللہ ہی کے لیے میں نے پہلی مرتبہ قرآن صدق دل سے پڑھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کس قسم کی ہستی ہے۔ اس کو سمجھا' اس کو جانا۔ اللہ کی وجہ سے اس سے تھوڑی بہت انسیت اور محبت پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ انسانی بشری تقاضوں کے باوجود۔ اللہ کی وجہ سے آج میں اس قابل ہوا کہ جو کچھ جانتا ہوں' اس کو آپ تک پہنچا سکوں۔ میرے خیال میں بنیادی شوق اللہ ہی کا ہے۔ یہ کوئی ایسی مشکل نہیں ہے' جس کا آپ تذکرہ کر رہے ہیں۔ یہ کور ہو سکتی ہے۔

جہاں تک عجمی ہونے کا سوال ہے' عجمی کا مطلب اس وقت گونگا مشہور تھا۔ عرب اپنے سوا تمام قوموں کو گونگا کہتے تھے۔ انہیں اپنی زبان پر اس قدر ناز تھا کہ وہ تمام زبانوں کو گھٹیا اور کم تر سمجھتے تھے۔ اپنے آپ کو فصیح و بلیغ کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عربی میں اُترا۔

زبانوں کے حوالے سے ذرا وضاحت ہو جائے۔ اردو زبان فرانسیسی' عربی اور سنسکرت

زبان کا ملغوبہ ہے۔ انگریزی میں چاند کے لیے Moon اور Luna اور سورج کے لیے Sun اور Solar ہے۔ اس کے علاوہ تیسرا کوئی لفظ نہیں ہے۔ اردو زبان میں قمر' چاند' مہ' مہتاب ہے۔ اسی طرح سورج کے متقابل پندرہ لفظ نظر آئیں گے۔ جبکہ عربی اتنی بڑی زبان ہے کہ اونٹ کے پیدا ہونے کے بعد اس کے جوان ہونے تک اس کی زندگی میں ایک سو اڑتیس لفظ ہیں۔ قرآن کو اس لیے خاص طور پر عربی میں اتارا گیا کہ اس کے ترجمے میں سہولت ہے۔ یہ جس زبان میں بھی جائے' اس کو ترجمہ کرنا آسان ہے۔ اس کے پاس اتنی فراخی اور مواد ہے کہ ساری زبانوں میں جتنا بھی کوئی مشکل لفظ ہوگا' وہ کسی نہ کسی ترجمے پر پورا اتر آئے گا۔ یہ بھی ایک کرامت اور معجزۂ قرآن ہے اور ہم عجمیوں کے لیے تحفہ ہے۔

فقہا اور فقہی مسائل

اصل میں امام اعظم کبھی محدث نہیں رہے۔ وہ بنیادی طور پر فقیہہ ہیں۔ ان کو کسی نے بھی تاریخ میں محدث نہیں کہا۔ مگر بالعموم جب ایک تخصیص ہوتی ہے' تو اس کو حاصل کرنے کے لیے بھی ایک معیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ نے امام عاشق سے حدیث پڑھی ہے اور امام عاشق اپنے وقت کے سب سے بڑے فقیہہ اور محدث تھے اور ان کے استادوں میں شامل ہیں۔ کچھ عرصہ حضرت الامام اور حضرت امام مالک کی بھی آپس میں شناسائی رہی ہے۔ ابوحنیفہ نے حدیث کو اتنا استعمال کیا ہے' جتنا کسی فقہ کے لیے ضروری ہے۔ بسا اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ امام اعظم نے کسی کمزور حدیث کو بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ حالانکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی انہوں نے باقی لوگوں کی نسبت زیادہ سختی اور پابندی کا روّیہ اختیار کیا ہے۔

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلے میں ہی حضرت امام اعظم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخری زمانے کی پیروی کی اور زیادہ سختی کا مظاہرہ کیا ہے' جس کی وجہ سے آج ہمیں بڑے مسائل لاحق ہیں۔ پتہ نہیں' اہلسنّت والجماعت کیا کہیں گے' جب ان سے پوچھا جائے کہ آپ کے کتنے آئمہ ہیں' تو وہ بالعموم کہتے ہیں کہ ہمارے چار آئمہ ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ کون کون سے ہیں' تو کہیں گے' حضرت ابوحنیفہ' احمد بن حنبل' انس بن مالک' محمد بن ادریس الشافعی۔ اگر کسی حنفی سے پوچھا جائے کہ ابوحنیفہ کے علاوہ بھی کسی کا فتویٰ مانتے ہو' تو وہ کہے گا'

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ جو اہلسنّت والجماعت کے اندر کشمکش شروع ہے' یہ مختلف فقہاء و آئمہ کے مقلدین کے ذریعے ہے۔ حنابلہ اور شافعیہ میں بہت سارے سوالات کی ہم آہنگی ہے۔ اب آپ اہلسنّت والجماعت سے یہ پوچھیں کہ حنفی تو شافعی کی بات ہی نہیں مانتے' وہ آپ کے امام کیسے ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ امت مسلمہ کے چار فقیہ ہیں۔ لفظ امام اور ٹائٹل ہٹا کے دیکھئے۔ امام سے ذرا نوعیت مختلف ہو جاتی ہے۔ اُمت مسلمہ کو یہ چار فقیہ نصیب ہیں' جو قانون میں اُمت مسلمہ کی آسانی کے لیے قانون کی توجیہہ کر رہے ہیں۔

اب ہوتا کیا ہے کہ نعمان بن ثابت کوفہ میں رہے اور ایک آدمی مدینہ میں رہا۔ اب مدینہ میں انس بن مالک کا فتویٰ چلتا ہے۔ فرض کریں' اس کو اختلاف کی ضرورت پڑ گئی کہ ہم کسی اور فقیہ کی رائے لے لیں' تو اس کو نہیں مل سکتی۔ کیونکہ اس کے پاس گنجائش اور وسائل نہیں ہیں کہ وہ کوفہ پہنچ کر نعمان بن ثابت سے فتویٰ لے لے۔ چنانچہ پرانے زمانے میں ان آئمہ اور فقہا کو شہروں اور علاقوں میں قید ہونا پڑا۔ جیسے مالکیہ کا ایک بندہ اندلس میں چلا گیا' تو اس کی وجہ سے وہاں کی فقہ مالکیہ ہو گئی۔ مدینہ اور مکہ میں انس بن مالک کی فقہ ہے۔ باقی تمام ممالک میں ابوحنفیہ کی فقہ چلتی ہے۔

حضرت علی بن عثمان سیدنا ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ میں باغ دمشق میں سویا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رسولؐ اللہ ایک نحیف و ناتواں شخص کو اٹھائے ہوئے آتے ہیں۔ دوڑ کر قدم بوسہ رسول ہوا۔ میں نے خیال کیا' یہ کون مقدس ہے' جس کو رسولؐ اللہ نے اٹھایا ہوا ہے۔ حضورؐ نے میرے قلب پر آگاہی پائی اور کہا' علی بن عثمان! یہ تیرا اور تیرے لوگوں کا امام ابوحنیفہؒ ہے۔ ابھی حضرت سیدنا بن عثمان ہجویریؒ ہندوستان میں نہیں آئے تھے۔ دوران تربیت میں یہ خواب دیکھا۔ مگر اس کی سچائی دیکھئے کہ کچھ عرصے بعد سید ہجویر کو ہندوستان آنا پڑا اور ولایت ہند کی تہنیت کی گئی۔ وہ اپنے زمانے کے قطب الاقطاب اور ولئ ہند بھی تھے۔ جب ان کو یہ عطا ہوئی' تو ایک عارف نے جس فقہ کو لاگو کرنا تھا' یعنی غزنی سے لے کر راج کماری تک' وہ تمام ہندوستان کی فقہ حنفیہ تھی۔

آج کے زمانے میں مسائل کچھ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ جگہیں مختصر ہو گئی ہیں۔ امریکہ سے بھی ہم ایک پل میں فتویٰ منگوا سکتے ہیں اور ریاض سے بھی۔ اب اصولاً زندگی اتنی پیچیدہ ہو گئی ہے

کہ جس امام نے بھی جس غور و فکر سے مسائل کو سمجھا اور ان پر تقریظ یا توجیہ کی ہے' میرے خیال میں اب ان چاروں آئمہ سے استفادہ کرنا ہمارا حق ہے۔ اب ان چاروں فقیہوں کی رائے کو مدنظر رکھ کر ایک نئی فقہ کو ترتیب دینا ہوگا۔

ہم فقیہ اس کو کہتے ہیں' جو قرآن کی اس آیت کے مصداق ہو **طه ما انزلنا علیک القرآن لتشقی** ہم نے قرآن کو مشقت کے لیے نہیں اتارا۔ اسے چاہیے کہ وہ بندگان خدا پر اسلامی تعلیمات کو آسان کر کے پیش کرے۔ ان کو سانس دے۔ یہ جو ہمارے ہاں مذاہب رائج ہیں' ان کے لیے زندگی چھوڑنی پڑتی ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں جو مذہب تھا' وہ مذہب بھی تھا اور زندگی بھی تھی۔ اب ہمیں معمول سے ہٹنا پڑتا ہے اور یہ مذہب کی غلط توجیہ ہے۔

میں بنیادی طور پر حنفی مسلک میں ہوں۔ مگر میں فتاویٰ حنابلہ اور شافعیہ کے مطابق دیتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے پتہ ہے' لوگوں کا علم نہیں ہے۔ میرے علم میں ایسی احادیث بھی ہیں اور ابن ماجہ کی حدیث بھی موجود ہے کہ وہ ابن عباس کے پاس آئے اور پوچھا۔ ابن عباس! رسولؐ اللہ کے زمانے میں کیا متعدد طلاقیں ایک نہ سمجھی جاتی تھیں؟ فرمایا' ہاں۔ پوچھا کہ ابن عباس! کیا حضرت ابوبکرؓ صدیق کے زمانے میں متعدد طلاقیں ایک نہ سمجھی جاتی تھیں؟ کہاں ہاں۔ پھر پوچھا ابن عباس! زمانہ اقتدار عمرؓ میں متعدد طلاقیں ایک نہ سمجھی جاتی تھیں۔ کہا' ہاں۔ پھر جب عمرؓ نے طلاقیں کثرت سے ہوتی دیکھیں' تو پھر تینوں طلاقوں کو آخری قرار دیا۔ اب دیکھیں' یہ ایک ایڈمنسٹریٹو آرڈر ہے۔ صورتحال خراب ہو رہی تھی۔ لوگ تعلیمات علمی کو الجھا رہے تھے۔ اب ہمیں لازم پڑتا ہے کہ ہم آج کے مسائل کو سمجھیں۔ ہم لوگوں کی تعلیمات اور ان کے انتخاب میں اضافہ کریں۔ جتنے ہمارے انتخاب میں اضافہ ہوگا' ہمارا مذہب زیادہ کشادہ اور زیادہ قابل فہم ہو جائے گا۔

استخارے کا پراسس

ہر شخص یقیناً کرسکتا ہے اور کسی شخص کا استخارہ کوئی دوسرا شخص نہیں کرسکتا۔ میں نے یہ بڑا عجیب و غریب طریق دیار پاکستان میں دیکھا کہ ہم نے مولوی صاحب سے استخارہ کرایا۔ اپنی فلاں پھوپھی سے بڑی نیک ہیں' ان سے استخارہ کرایا۔ بھلا ان کو اس مسئلے سے کیا تعلق ہے' جوان کو استخارے کا جواب آئے گا؟ استخارہ بڑی سادہ سی چھوٹی سی روایت ہے۔ حدیث ہے کہ اس

شخص کو کبھی خسارہ نہیں ہوا' جس نے استخارہ کیا۔ استخارہ کا مطلب یہ ہے کہ کنفیوژن میں دو راستوں میں انتخاب کے لیے آپ اپنی چوائس کی بجائے خدا کی رہنمائی طلب کرتے ہیں۔

استخارے کا سادہ پراسس یہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے دو رکعت نفل ادا کریں اور ہر رکعت میں تین مرتبہ الحمد کے ساتھ سورہ اخلاص پڑھیں۔ پھر بولیں نہیں اور خدا سے آرزو رکھیں کہ اے پروردگار! میں اس مسئلے میں الجھا ہوا ہوں' مجھے رہنمائی عطا فرما۔ جب آپ سوئیں گے' ایک دن' دو دن' تین دن کے اندر آپ کو کسی نہ کسی بڑے واضح اشارے سے ہدایت مل جائے گی۔

نفاق' نماز' شیطان

نفاق عملی نہیں ہوتا۔ عمل میں کوئی نفاق نہیں ہوتا' بلکہ نفاق تقسیم دل کو کہتے ہیں۔ جب آپ کا دل تقسیم ہو جائے۔ خیر و شر میں تفریق نہ کر سکے اور آپ کی جبلی قدروں اور ذاتی خواہشوں کو ان احکام الٰہیہ سے جدا نہ کر سکے' جو حدود ہیں اور جو لازم ہیں' تو آپ کا دل نفاق کا شکار ہوتا ہے۔ جب آدمی کا دل کسی بڑی خطا یا جرم کا ارتکاب کرنے کے لیے ایسے دلائل گھڑے' جو قرآن و حدیث کی اصولی حدود کو ناقص کریں' تو اس وقت آپ کا دل منافق ہوتا ہے۔

جب آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کیوں نماز نہیں پڑھتے ہو' تو اکثر جواب یہ ہوتا ہے کہ کیا پڑھیں؟ نماز میں تو ہر قوت وسوسے آتے رہتے ہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جب نماز پڑھوں' پورے خشوع و خضوع اور اطمینان کے ساتھ پڑھوں۔ میں وساوس والی نماز پڑھنا نہیں چاہتا۔ جب کوئی بہانہ عذر بنا کر یہ کہے کہ میں وساوس والی نماز نہیں پڑھنا چاہتا' تو یہی نفاقِ دل ہے۔

اگر انہوں نے تھوڑا سا قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہوتا' تو نماز کے لیے خدا نے ہمیشہ اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے کہ اس کو قائم ہونا چاہیے۔ آپ کا دل چاہے نہ چاہے' اتنی مدت کی جو آپ نماز پڑھتے ہیں' اس میں یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا کہ ساری زندگی ایک جوش' ایک اخلاص سے کوئی کام کیا جائے۔

کمپیوٹر کیوں ایجاد ہوا؟ اس لیے کہ انسانی یادداشت اپنی ہی کارکردگی کو اتنی ہی تعلیم کے ساتھ بار بار دُہرا نہیں سکتی۔ ایک آدمی جو ایک وقت میں سو نمبر لیتا ہے' دوسرے وقت میں

ہوسکتا ہے' دس نمبر لے۔ انسان نے اپنی استعداد کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے کمپیوٹر ایجاد کیا۔ کیونکہ کمپیوٹر اس معاملے میں خطا نہیں کرتا۔ جو اس نے استعداد ایک مرتبہ دکھائی ہے' ہر مرتبہ بٹن دبانے پر وہی استعداد دکھائے گا۔ یہ کمپیوٹر کا بنیادی راز ہے۔

اب آپ دیکھیں کہ خداوند کریم' جو انسانی ذہن اور انسانی بنیادی مسائل کو سمجھتا ہے' وہ آپ سے کب یہ توقع کرے گا کہ ہر مرتبہ بڑے خلوص' بڑی محبت اور بڑے خشوع وخضوع سے نماز پڑھیں۔ نصیحت تو اس نے کر دی' مگر جیسے مسئلہ آپ کو آج پیش آ رہا ہے' جب اصحابِ رسولؐ نے عرض کیا' یارسولؐ اللہ! نماز میں وساوس بڑے آتے ہیں؟ فرمایا' عین ایمان ہے۔ آپ کو وسوسہ برا لگتا ہے اور نماز چھوڑنے کا بہانہ لگتا ہے' جبکہ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ عین ایمان ہے۔

اب عین ایمان کی وضاحت یہ ہے کہ جب کبھی انسان نماز میں کھڑا ہوتا ہے' تو کوئی اور ایسا مقام نہیں ہے' جہاں شیطان کو انسان اپنے سے جدا لگے۔ بازار میں' گفتگو میں' ہر حرکت میں' ان کی آپس میں بہت بڑی شراکت داری ہے۔ کیوں آپ کو بازار میں جھوٹ بولتے ہوئے تنگ کرے گا؟ آپ اسی کی تو خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ کیوں آپ کو ناقص گفتگو سے منع کرے گا یا وہ کیوں خوش گپیوں میں وقت ضائع کرنے سے آپ کو خبردار کرے گا؟ وہ اس وقت آپ کی مخالفت کرے گا' جب آپ اس سے بالکل ہٹ کے اس عالم کل کے ربِّ کریم کے سامنے اپنی خطا کے نسیان کا ازالہ کرنے کھڑے ہوں گے۔ وہ اس وقت آپ کو ضرور بہکائے گا۔ ضرور وسواس دے گا۔

جب ان وساوس کے باوجود آپ کی نماز نہیں ٹوٹی اور آپ نے آمنت باللہ ورسول بھی کہا کہ میں اپنے اللہ اور رسولؐ پر ایمان لایا اور احکام بجالایا' تو آپ کی نماز کہیں زیادہ بہتر ہے اس سے کہ آپ جتنے بھی خشوع وخضوع سے پڑھیں اور شیطان آپ کی پرواہی نہ کرے۔ آپ بڑے خشوع وخضوع سے پڑھ رہے ہیں اور شیطان کو آپ کی کوئی پروا نہیں۔ کوئی وسوسہ آپ کو نہیں دے رہا' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اچھی طرح پتہ ہے کہ باوجود خشوع وخضوع کے آپ کی اس سے کوئی داخلی مفاہمت ضرور ہے۔

اس لیے نفاقِ دل کے تقسیم ہونے' خرچ ہونے کو کہتے ہیں۔ دل خیر کے لیے ہے۔ اللہ کی یاد اور محبت خداوند کے لیے ہے۔ دل امن اور سکون کی آماجگاہ ہے۔ دل کا اضطراب اور اس کی

بے چینی اس کا نفاق ہے۔ دل کا تقسیم ہونا اور خدا کی یاد سے غافل ہونا اس کا نفاق ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب دلوں کا اطمینان خدا کی یاد میں ہے۔ جب خدا کی یاد نہ ہوگی، تو دل ضرور اپنے آپ کو منافق محسوس کرے گا۔

علم ذریعہ گمراہی

شیطان کو کبھی علم حاصل تھا نہ وہ کبھی عالم کہلایا۔ وہاں بھی اللہ نے پہلی کیٹیگری میں اعمال پر اسے عزت اور برکت دی اور تمام عرصہ وہ جانتا تھا۔ کیونکہ جب ہم شیطان کو واپس پلٹتا دیکھتے ہیں، تو اس کا دعویٰ علم کا قطعاً نہیں ہے۔ علم کا دعویٰ تو آدم کے ساتھ پورا ہوا۔ جب ملائکہ نے ضد لگائی۔ آدم کی تخلیق صلاحیتیں اور اس کی جانچ پرکھ کا علمی شعبہ میں عروج ثابت ہوا، تو باقی ملائکہ کو کوئی شک نہیں رہا۔ مگر جب شیطان نے آدم کی مخالفت کر دی، تو اس نے علمی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ یہ کہا کہ میں تو آگ سے پیدا ہوا ہوں۔ میں نفیس تر مخلوق ہوں اور یہ مٹی سے پیدا ہوا ہے اور غلیظ تر مخلوق ہے۔ اس طرح شیطان جاہلانہ تعصبات کا پہلا بانی ہے۔ اس کو ہم عالم تو کسی صورت نہیں سمجھ سکتے۔ علم کے ساتھ ایک چیز کی اور ضرورت ضرور ہے اور وہ توفیق الٰہی ہے۔

انسانی کلوننگ اور اِسلام

(ڈاکٹر عبدالجلیل خواجہ) میں نے کلوننگ کے بارے میں سب سے پہلے پروفیسر صاحب سے ایک حدیث سنی تھی۔ حضورؐ نے دجال کے بارے میں بات کرتے ہوئے فرمایا کہ دجال کے پاس ایک شخص آئے گا اور سوال کرے گا کہ کیا تو میرے بھائی کو زندہ کرسکتا ہے؟ دجال کہے گا' ہاں کرسکتا ہوں۔ وہ اس کے بھائی کو زندہ کرے گا۔ سوال کیا گیا' کیا یہ وہی شخص ہوگا؟ حضورؐ نے فرمایا' نہیں یہ اس کی مثال ہوگا۔

اب یہ بات یہاں واضح ہوجاتی ہے کہ حضورؐ شخصیت کی بات نہیں کررہے' بلکہ آپ اس جینٹک نقل اور جینٹک کوڈنگ کی بات کررہے ہیں' جو موت کے بعد بظاہر معدوم ہوگئی۔ لیکن اس شخص کے جسم کا کوئی حصہ حاصل کرکے اس کو دوبارہ سے کلون کیا جاسکتا ہے اور ایک یکساں زندہ وجود پیدا کیا جاسکتا ہے۔ سوسائنس کی مدد سے کسی شخص کا مثل تیار کرنا ممکن ہے۔ قرآن یا حدیث اس کی تردید نہیں کرتے۔ بلکہ حدیث نے اس کو پہلے سے تسلیم کیا اور اس کے بارے میں بتادیا کہ ایسا ہوگا۔ وہ تمام کام جن کا خدا دعویٰ کرتا ہے' دجال ان تمام چیزوں کا دعویٰ کرے گا۔ ان کو کرے گا اور یہ تمام اہل ایمان کا امتحان ہوگا۔

بنیادی طور پر ڈی این اے ایک مالیکیول ہے' جس کو خلیہ بولتے ہیں۔ اس کے دو حصے ہیں۔ جیسے آپ دو انگلیوں کو درمیان میں چند چھوٹی چھوٹی چھڑیاں رکھ کر چھوڑ دیں۔ یہ ڈیزائن دو بھائیوں واٹسن اینڈ کرگ غالباً نام تھا' نے دریافت کیا کہ ڈی این اے کا یہ سٹرکچر ہے۔ اس کو

lader کہتے ہیں۔اس کو یہ کھولتے ہیں۔اس کی ایک سائیڈ دوسری سائیڈ کے مماثل ہوتی ہے۔ جب اس کا جوڑ بنایا جاتا ہے' تو وہ ڈی این اے بن جاتا ہے۔یہ عمومی طریق کار ہے۔

اس میں ہم کیا کرتے ہیں؟ ایک سیل نکالتے ہیں۔میں سادہ کر دیتا ہوں کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے' اس میں آدھے کروموسوم ماں سے آتے ہیں' آدھے باپ سے آتے ہیں۔یہ مل کر اڑتالیس بنتے ہیں۔آپس میں یہ پھر تقسیم ہوتے ہیں۔ایک سیل سے دو سیل بنتے ہیں۔لیکن جو کلوننگ ہے' اس میں پورا ڈی این اے لیا جاتا ہے' ڈی کا کوئی بھی سیل لے سکتے ہیں اور اس سیل کو لے کر ہم کسی ایسے ماحول' جو کہ اس کی نقل پر وموٹ کر سکے' میں رکھ دیتے ہیں۔یہ سیل سیکس کے بغیر یا متقابل جرثومے سے ملے بغیر نقل بنتا ہے اور پھر متفرق ہوتا ہے۔ایک سیل سے مختلف قسم کے سیل بنتے ہیں۔وہ سیل جو بظاہر پہچانا نہیں جارہا ہوتا' وہ آٹھ دس قسطوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ایک سیل ہارٹ بناتا ہے۔ایک دل بناتا ہے۔ایک ہڈیاں بناتا ہے۔

اگرچہ یہ سارا کام کرنے میں سائنس کامیاب ہو چکی ہے' مگر وہ اس بات کا جواب دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی کہ ان سیلوں میں فرق اور تفریق کا کنٹرول کیا ہے؟ ایک سیل سے آٹھ سیل بن جاتے ہیں۔لیکن یہ کیونکر ممکن ہوتا ہے کہ وہ آٹھ سیل یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم دو سیل یہ بنائیں گے۔ہم دو ہڈیاں بنائیں گے۔یہ تفریق آج تک سائنس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

جہاں تک اس کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا تعلق ہے' میری رائے میں کوئی بھی ہتھیار یا کوئی تکنیک بذاتِ خود اچھی نہ بُری ہوتی ہے۔اگر ایک صاحب یہ کہتے ہیں کہ میرے جسم کی فلاں چیز کام نہیں کر رہی' تو آپ کسی طرح سے ایک الگ کلوننگ کر کے میرے جسم کا وہ حصہ بنا دیجیے۔وہ حصہ بنانے سے اگر اس شخص کی زندگی بچ جاتی ہے' تو میرے خیال میں یہ فعل احسن ہو جائے گا۔اور اگر آپ اس کو کسی منفی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیں۔ جیسے اس علم سے آپ کوئی ایسا جراثیم یا کوئی بائیو کیمیکل ہتھیار بنالیں' جو کہ صرف لوگوں کے ایک گروہ کو ہٹ کرے' تو یہ درست نہیں۔

جیسا کسی زمانے میں خبر آئی تھی کہ یہودیوں نے ایک ایسا ہتھیار تیار کیا ہے کہ اگر وہ گولے کی شکل میں پھینکیں' تو وہ صرف عربوں کو ہٹ کرے گا۔کیونکہ ان میں ایک خاص جین ہے۔یہ آپ کو شاید بڑی دلچسپ معلومات لگے۔کوئی تعجب نہیں ہوگا' اگر کل کو سائنسدان آپ کو یہ

بتائے کہ ہم ڈی این اے دیکھ کر بتا دیں گے کہ یہ اسلام کا ماننے والا ہے' یا یہ یہودی ہے۔ چنانچہ عربوں کی شناخت جو کہ یہودیوں کی نہیں ہے' اس کے لیے وہ ایک ایسا کیمیکل ایجاد کر چکے ہیں' یا کر رہے ہیں' جو کہ استعمال کی صورت میں صرف ان لوگوں پر اثر انداز ہوگا' جن کے اندر وہ ڈی این اے یا جینز کا عنصر ہوگا۔ میرے خیال میں یہ تکنیک ہے' آپ چاہے خیر کے لیے استعمال کریں' یا شر کے لیے استعمال کریں۔

توہینِ رسالت کا قانون

توہین رسالت کے بارے میں جو قانون پاکستان میں ہے' یہ اجماعِ اُمت نے بنایا ہے اور اجماع کا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ مگر توہین رسالت کی سزا اسلام میں پیغمبرؐ نے نہیں دی' بلکہ خود خدا نے دی۔ اس معاملے میں بنیادی تشویش پیغمبر کی نہیں' رحمت للعالمینؐ ہونے کی حیثیت میں دشمنوں پر آپؐ کی اتنی نوازشیں اور قربانیاں ہیں کہ آپ کے بس میں ہوتا' تو آپ اپنے لیے کسی کو سزا نہ دیتے' مگر یہ جو سزا توہینِ رسالت کی ہمارے مذہب میں آئی ہے' یہ رسولؐ کی نہیں' بلکہ اللہ کی دی ہوئی سزا ہے' جو کسی بھی حالت میں اپنے پیغمبرؐ اپنے محبوبؐ اور دوستؐ کی توہین برداشت نہیں کرتا۔ اگر ہم اسے پیغمبرؐ کے حق میں نافذ نہیں کریں گے' تو پھر خدا کوئی اور صورت خود ہی ڈھونڈ لیتا ہے۔ جیسے کہ اگر حکومت اس پر عملدرآمد نہیں کرے گی' تو پھر خدا غازی علم الدین شہیدؒ کو یہ تقویت دے دیتا ہے کہ وہ توہین رسالت پر عمل کرے۔ جیسے آج بھی ہزاروں مسلمان عزم کیے بیٹھے ہیں کہ کب سلمان رُشدی ہمارے ہاتھ آئے اور کب ہم اس پر سزا کو نافذ کریں۔

توہینِ رسالت کی سزا صرف اس کے لیے نہیں ہے' جو ہمارے رسولؐ کی توہین کرتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی حضرت عیسیٰؑ کی توہین کرتا ہے' تو وہ بھی سزا کا سزاوار ہے۔ یہ تہذیبوں کا دور ہے' جہاں معاشروں کا غلبہ ہے۔ توہین اچانک ایک اتنے بڑے ہنگامے کو جنم دے گی' جس میں ہوسکتا ہے کہ اس میں تمام اہلِ ذمہ کے وجود جل کر خاک ہو جائیں۔ اس لیے سزا بڑی ضروری ہے' اس فرد کو' جس نے مختلف معاشروں کے درمیان اعتماد اور ان کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا۔

فرض کریں' ایک عیسائی توہینِ رسالت کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر آپ ہجوم کو اس عیسائی

کی شکل کیا دکھائیں گے؟ وہ آگے بڑھتے ہوئے عیسائیوں کی پوری کالونی تباہ کر دیتے ہیں۔ تو کیا اس سے بہتر نہیں ہے کہ ان تمام جذبوں کو قابو میں رکھتے ہوئے اس شخص کو سزا ضرور دی جائے' جو انسانوں کی محبوب ترین ہستی کی توہین کرتا ہے۔ مسلمانوں' ہندوؤں اور عیسائیوں میں جو عظیم تر فسادات ہوئے ہیں' وہ اسی بات پر ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ سزا انتہائی جائز ہے اور اگر رسولؐ نہ بھی دیتے' تو مسلمانوں کو یہ سزا دینی چاہیے' کیونکہ اس کے نتیجے میں اتنی بڑی آگ بھڑک سکتی ہے کہ پورا معاشرہ بھسم ہو سکتا ہے۔

ظہار قرآن میں

قرآن میں اس کو ظہار کے معنوں میں تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسے بہت سارے مرد لڑائی جھگڑے میں قسم کھا لیتے ہیں کہ اگر میں تجھے رکھوں' تو جیسے ماں کو رکھوں۔ بہت ساروں سے اکثر اس قسم کی بدتمیزی اور بدتہذیبی ہو جاتی ہے' اس کو ظہار کہتے ہیں۔ جیسے استہزا میں بیوی کو بچہ کہنا۔ اگر تو اس کو طبعی اعتبار سے بچہ کہا جائے اور فرض کریں' وہ بچی ہے' تو شوہر کو مناسب نہیں ہے کہ اس کی بلوغت تک اس سے تعلق رکھے۔

ادائیگی زکوٰۃ اور ریا

جو بات زکوٰۃ کی ادائیگی اور ریا و دکھلاوا کی کہی گئی ہے' اس بارے میں اللہ نے قرآن میں ایک بدترین مثال دی ہے۔ وہ کسی ظاہرہ گناہ کی نہیں دی' بلکہ باطنی گناہ کی دی ہے۔ غیبت اور علم کی مثال دی ہے کہ عالم جو دین کو دنیا کے لیے استعمال کرے' اس کی مثال کتے کی طرح ہے۔ جس کی زبان آدھی باہر اور آدھی اندر ہے۔ اسی طرح اللہ نے غیبت کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔ اگر آپ ان دو باطنی چیزوں سے اجتناب کریں' تو آپ کی ظاہری عادات اور خارجی کیفیات خود بخود درست ہو جاتی ہیں۔ جو کام خارج میں بغیر سوچے سمجھے کیا جائے' وہ قیامت تک محض ایک معمول کی عادت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے کبھی بھی اندرونی اخلاص پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے ملک میں نماز کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔ میں سعودی عرب کے مذہب

کی حمایت نہیں کرتا۔ مگر ایک بات وہاں نظر آتی ہے کہ نماز کے وقت بندہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ بازار اور خرید وفروخت بند ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو صرف ایک ہی سرگرمی جو نظر آتی ہے' وہ نماز ہے۔ سارے لوگ نماز کو چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ملک میں نماز پڑھنے کے لیے' ہمیں عمومیت سے خصوصیت کو جانا پڑتا ہے۔ ایک دفتر سے اٹھنا' وضو کرنا' اپنی میز کو سنبھالنا وغیرہ۔ ایسے حالات میں کوئی بندہ اتنی کثرت سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اسلامی معاشرے میں نماز کے وقت کوئی اور سرگرمی نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ہو' تو ہر آدمی نماز کے لیے جائے گا' کیونکہ اس کے کرنے کے لیے کوئی اور کام نہیں ہے۔ ایسی فضا میں ثواب کمانا کیا برا ہے؟ کچھ کام ہمارے کرنے کے ہیں اور کچھ ہماری حکومت کے کرنے کے ہیں۔

ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس کی خارجی دانشمندی نہیں ہوتی۔ ہر انسان نمود ونمائش کا شائق ہے۔ اپنے آپ کو معزز کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اللہ نے قرآن مجید میں کہا کہ لوگوں سے کیا عزت ڈھونڈنے جاتے ہو فان العزة لله جمیعا تمام عزت تو اللہ کے پاس ہے۔ اس کے لیے صرف قول وفعل کا تضاد ختم کرنا ضروری نہیں ہوتا' بلکہ قول وفعل وفکر تینوں کا تضاد ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تسبیح الٰہی اور اللہ کی طرف توجہ سلسلۂ فکر شروع کر دیتی ہے اور رفتہ رفتہ آپ بہتر انسان بننا شروع کر دیتے ہیں۔

صلہ رحمی کے احکام

جہاں بھی قرآن میں ذکر آیا یسئلونک ماذا ینفقون صرف مسلمانوں میں ہی نہیں واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لاتعبدون الا الله وبالوالدین احسانا و ذی القربی والیتمیٰ والمساکین تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس تمام عرصے میں سب سے پہلا حکم جو اللہ دیتا رہا' وہ صلہ رحمی کا ہے۔ عزیز واقارب سے محبت رکھنے کا حکم ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے مردوں کو مشورہ دیا ہے' عورتوں کو نہیں کہ اگر تمہارا باپ بھائی تمہیں غلط کام کرنے کو کہیں' تو ان کو نہ ماننا' میری ماننا۔ سو حدِ فاصل اللہ کا حکم ہوا۔ اس میں صلہ رحمی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ اللہ کے خلاف بھی ان کی تصدیق کریں۔

اگر کوئی شخص اپنی ماں کے کہنے پر ظلم کرتا ہے' تو اس کی نجات نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ خدا

نے اس سے ضرور پوچھنا ہے' تم نے ظلم کیوں کیا ہے؟ ماں کی جسمانی خدمت کا بہر حال حکم ہے' مگر اس کی ذہنی خدمت کا کوئی حکم نہیں۔ اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ میں عورتوں کو زیادہ جہنم میں دیکھتا ہوں۔ ماں کی خدمت کے لیے تین بار فرمایا کہ ماں کی خدمت کرو۔ اس نے تمہیں جنا اور قرآن بھی یہی کہتا ہے کما ربینی صغیرا جب یہ بوڑھے ہو جائیں' ان کو آسرا دو۔ ان سے سخت لہجے میں گفتگو نہ کرو۔ یہ ان کی خدمات کا حق ہے' لیکن جہاں فیصلہ سازی اور ذہنی اعتقاد' دین اور اخلاق کی بات ہے' وہاں آج کل کے زمانے میں دیکھا گیا ہے کہ اکثر افراد اپنی جبلی اقدار کی طرز پر سوچتے ہیں۔ گھر گھر میں غیبت ہو رہی ہے۔ ساس اور بہو کے جھگڑے ہو رہے ہیں اور ہر مرتبہ مرد کو کسی نہ کسی طرح ناانصافی پر اُکسایا جا رہا ہے۔ وہ اگر آپ مانیں گے' تو ماں آپ کو جہنم سے نہیں چھڑا سکتی' نہ سزا سے بچا سکتی ہے۔

ہر آدمی کی صوابدید اس کا انعام ہے لا تبزرو وازرۃ وزرا اخری وہاں ماں باپ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ذہنی سطح پر ماں باپ کا کوئی دخل نہیں۔ ہاں پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق۔ اگر آپ نے ماں باپ کی بالکل خدمت نہیں کی' تو آپ کو ضرور سزا اور سرزنش ہو گی۔ اس کے لیے آپ پابند ہیں۔ ان کی ذہنی طور پر تقلید کے نہیں۔

یسئلونک عن الخمر والمیسر

موجودہ سائنس اللہ تعالیٰ کے قول کا ٹھیک اعادہ کرتی ہے کہ یسئلونک عن الخمر والمیسر پوچھا گیا کہ شراب اور جوا کیسا ہے؟ قل فیھما اثم کبیرا و منافع للناس فرمایا کہہ دو کہ اس میں لوگوں کے لیے کچھ نفع بھی ہے اور کچھ نقصان بھی و اثمھما اکبر من نفعھما مگر اس کے نقصانات اس کے نفع سے زیادہ ہیں۔ اس لیے خداوند کریم نے اس کا سب سے بڑا نقصان یہ بتایا کہ تمہاری اپنے چاہنے والوں سے دشمنیاں ہو جاتی ہیں۔ جس خدا کی تم پرستش کرنا چاہتے ہو' اسی کے بارے میں تمہیں نہیں پتہ چلتا کہ تم اسے کیا کہہ رہے ہو۔ خمر اور جوئے کی وجہ سے تمہاری آپس میں مخالفتیں اور دشمنیاں ٹھہر جاتی ہیں۔ تم ایک دوسرے کے خلاف قتل و غارت پر اتر آتے ہو۔ خدا کہتا ہے کہ یہ انسانی معاشرے میں اتنا بڑا نقصان پیدا کرتا ہے کہ تمہیں میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیا تم مناسب سمجھو گے کہ کار شیطان اختیار کر دیا

مناسب سمجھو گے کہ میری بات کو سمجھو، جانو اور مانو؟ خدا اس کے بارے میں فیصلہ سنا رہا ہے کہ اس کی برائیاں بھی ہیں اور اچھائیاں بھی ہیں۔ چونکہ اس کی برائیاں اس کی اچھائیوں سے زیادہ ہیں، اس لیے میں اس سے منع کرتا ہوں۔

اب اس میں جو لفظ Judicious استعمال کیا گیا ہے، وہ بڑا مغالطہ آمیز ہے۔ Judicious میں اگر ماہیت اور اس کی فطرت کی تبدیلی شامل ہے، تو اس پر اس کا کوئی فتویٰ نہیں لگتا۔ بہت سی ادویات میں الکوحل ان کا حصہ ہے۔ بچپن میں برانڈی ملتی تھی۔ لوگ اپنے بچوں کو شدید نمونیہ کے لیے پلا دیتے تھے۔ اگر یہ بطور میڈیسن استعمال ہو رہی ہے، تو پھر اجازت ہے، اگرچہ کراہت ہے۔ اگر یہ ذوق و شوق اور خمار اور محبت کے لیے استعمال ہو رہی ہے، تو پھر اس کی اجازت نہیں ہے۔

آپ کا انتخاب ہمیشہ اعلیٰ سطح سے ہے۔ شراب ایک معمولی چیز ہے۔ یہ خدا کی حریف نہیں ہے۔ یہی مسئلہ سور کے گوشت کھانے کا ہے۔ اگر آپ کی خدا اور اس کے احکامات کی محبت اس سے زیادہ ہے، تو آپ نہیں کھائیں گے۔ سور تو بذاتہ کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی حلال و حرام معنی نہیں رکھتا۔ کئی چیزیں جو ہمیں حلال ہیں، بنی اسرائیل کو حرام ہیں۔ خدا کا حکم اگر اچھا لگتا ہے، تو مان لیجیے۔ اگر آپ اس کی اطاعت مناسب طور پر نہیں کرتے، تو نہ مانئے۔ ہر جگہ اور ہر لمحہ، جو آپ کا سانس جاری ہے، یہ مقابلہ رہتا ہے۔ آپ کو ترجیحات طے کرنی پڑتی ہیں۔ اسی لیے پروردگار نے کہا لن تنالو البر حتی تنفقو مما تحبون تم کبھی مجھے نہیں پا سکتے، جب تک تم میرے لیے وہ چیز قربان نہ کرو، جس سے تمہیں محبت ہے۔

یہ محبت کا سوال ہے۔ ہر وقت کے تعلق کا مسئلہ ہے۔ بنابریں عمر خیام نے کہا کہ محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تم اس کے لیے دیتے کیا ہو؟ کوئی اشارہ، کوئی کلمہ، کوئی چھوٹی سی چیز اور کوئی ایسا بھی ہے، جو اپنی زندگی قربان کر دیتا ہے۔ شہید کیوں بڑا ہے؟ اس وجہ سے کہ وہ ایک لمحہ کے فیصلے میں خدا کے لیے زندگی دے دیتا ہے۔ اس کا چوائس بڑا ہے۔

منصوبہ بندی اور عزل

خداوند کریم نے اس حکم کو مخصوص کیا ہے قتل کے ساتھ اور آج کے تمام جدید انسان

جانتے ہیں کہ سنگل سیل کبھی بھی تخلیق کا باعث نہیں رہا۔اس کے علاوہ ہمارے پاس دو احادیث موجود ہیں، جن میں اصحاب رسولؐ نے عزل کی اجازت مانگی، جو انسانی نطفہ کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔حضورؐ نے ان کے بارے میں صرف اتنا کہا کہ پھر جس نے آنا ہے، اس نے آنا ہے۔تمام پیٹرن مل کر ہمیں صرف اتنی بات بتاتے ہیں کہ خدا یہ حکم صرف اس وقت لگاتا ہے جب آپ کو یقین ہو کہ بچہ بن چکا ہے۔جب یہ ثابت ہو جائے کہ دونوں سیل مل گئے ہیں، تو پھر زندگی کا اطلاق ہوتا ہے۔زندگی ہے اور اس وقت اس کو ضائع کرنا یقیناً خدا کے اس حکم کے برابر ہے کہ اپنی اولاد کو رزق کی تنگی کے خوف سے قتل نہ کرو۔

نماز قطبین پر

نمازوں کا چونکہ پانچ وقت مقرر ہے۔ جو لوگ شمال یا جنوب میں جائیں' وہ کیسے نماز پڑھیں' سوال ہے۔ آپ اپنے ذہن رسا کو نارسا کر رہے ہیں فسبحن اللہ حین تمسون وحین تصبحون وعشی حین تظھرون یہاں تو چار مقام واضح ہیں۔ اگر آپ ہمیشہ اندازے سے کام لے کر جتنا بھی وقت آپ کو قطبین پر نصیب ہے۔ چھ ماہ ہیں' تو ان کو پہلے مہینوں میں تقسیم کریں۔ مہینے ہیں' تو انہیں دنوں میں تقسیم کیجیے۔ جب آپ دنوں میں ڈھال لیں گے' تو پھر آپ وقفہ نماز کو متعین کر لیں گے۔ یہ آپ کی نقل و حرکت مزاجاً ہے۔ یہ نہ ہو کہ صبح و شام آپ ایک ہی نماز پڑھنا شروع کریں اور وہی ختم نہ ہو۔

قطبین پر پہلے بھی لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ اب اسکیموز ایک ایسی سوسائٹی ہے' جو پچھلے پانچ ہزار سال سے بالکل تنہا ہے۔ اس میں کسی دوسری سوسائٹی نے دخل نہیں دیا اور یہ جو خدا قرآن میں کہتا ہے کہ پہلے سب موحد تھے۔ جب شروع شروع میں اسکیموز کا سراغ ملا' تو پتہ چلا کہ وہ سادہ سی سوسائٹی ہے۔ وہ زمانوں میں اس طرح رہی ہے کہ اس میں آمیزش نہیں ہوئی۔ جب اسکیموز سے پوچھا گیا کہ تم کسی کو اپنے علاوہ بھی مانتے ہو؟ انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا کہ اس نیلگوں آسمان میں ایک ایسی طاقت ہے کہ جب ہم دُعا مانگ کے چلتے ہیں' تو ہمیں سیل (مچھلی) زیادہ دیتی ہے۔ جب ہم دعا نہیں مانگتے' تو ہمارا تجربہ ہے کہ ہمیں سیل کم ملتی ہے۔

بعض اوقات قرآنِ حکیم کی چھوٹی سی آیت کے لیے آپ کو بہت بڑے مطالعہ کی

ضرورت ہوتی ہے۔ خدا یہ کہتا ہے کہ شروع میں سب موحد تھے۔ جب ہم تاریخ میں پیچھے جاتے ہیں، تو ہمیں ماقبل تاریخ میں ساری میتھالوجی نظر آتی ہے، آدمی خیال کرتا ہے کہ تاریخ کے پیچھے تو اصنام پرستی ہے۔ مگر اگر آپ تھوڑا سا اور پیچھے چلے جائیں، تو حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ میتھالوجی کے پیچھے ایک خدا ہے۔

یونانی میتھالوجی میں ذیوس کی حفظ مراتب شروع ہوئی۔ Aphrodite `Hephastus Appolo `Hirmis یہ جُملہ خدا، ایک Cronus کی پیداوار ہیں۔ اسی طرح دیوتا اور دیویوں کے انڈیا میں جو ڈھیر لگے ہیں، لیکن وہاں بنیادی طور پر دو طرح مورتیاں ہیں۔ تمام اصنام کو مختصر کرتے جائیں، تو یہ سارے بت پیچھے ہٹتے ہٹتے تین تین بتوں تک آتے ہیں اور جب ان سے بھی پیچھے آئیں، تو دوسری تری مورتی برہما، شیوا اور وشنو کی ہیں۔ اس سے پیچھے آئیں تو پہلی تری مورتی اندرا، متھرا اور ارونا کی ہیں۔ یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ جب آرین ہندوستان میں داخل ہوئے، تو ان کا صرف ایک خدا تھا، اور وہ اندرا تھا۔ آج بھی اندرا کی تعریف گاڈ آف تھنڈر اور گاڈ آف سورگ ہے۔ یعنی جنت کا خدا اور قہر و غضب کا خدا۔

کافر کے ساتھ تجارت

کافر کے ساتھ تجارت جائز ہے۔ اس لیے آپ ان باتوں کی کبھی بھی دلیل نہیں بنا سکتے۔ ہماری تجارت کے بنیادی مراکز ہی باہر ہیں۔ ہمیں مشینیں ان سے لینی ہیں۔ آپ کا توازن تجارت اس لیے بگڑا پڑا ہے کہ آپ کو ہر بہتر چیز کے بنانے کے لیے یورپ، امریکہ اور دوسری جگہوں سے بھاری مشینیں درآمد کرنی پڑتی ہیں۔ اگر آج یہ ٹائی یہاں کے کسی نے بنائی ہوگی، مگر میرا خیال ہے کہ آپ کے کپڑے کا ایک ایک ریشہ کسی خارجی مشین سے ہی بنا ہوگا۔ اس لیے تجارت عین جائز ہے۔ اس میں کسی قسم کا مسئلہ نہیں۔ آپ ایک اچھی چیز کو کہاں سے لیتے ہیں؟ جیسے حکمت میراث مومن ہے۔ جہاں سے ملتی ہے، اٹھا لو، ایسے ہی کوئی خوبصورت پہناوا، شے اور کوئی اچھی خوراک حرام و حلال کے فلسفے سے آگے ہوتے ہوئے آپ کو کسی جگہ سے ملتی ہے، ضرور لیں اور کھائیں۔ بدخشاں کا لعل مشہور ہے۔ یمن کا عقیق مشہور ہے۔ ہوسکتا ہے، اٹلی کا پیزا مشہور ہو۔

قبروں پر سنگ مرمر

کسی بڑے زلزلے میں قبر بھی گر جاتی ہے اور ایک مکان بھی گر جاتا ہے۔ یہ میں نہیں مانتا کہ پکی قبر کرنے سے گناہ وثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں اس معاملے میں عبدالوہاب کے اس پروگرام کو بھی نہیں مانتا کہ انہوں نے جنت البقیع اور ان مقابر کو اس خوف سے گرا دیا کہ یہاں پرستش ہوگی۔ میرے خیال میں چھوٹے کی کم پرستش ہوتی ہے، بڑے کی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے اصول کی بات ہے کہ انہیں سب سے پہلے آقا و رسولؐ کا مقبرہ گرانا چاہیے تھا۔ جب وہ رسول ہاشمیؐ کے مقبرۂ عالیہ کی طرف بڑھے، تو مدینے کے سارے لوگ سر بکف ہو کر نکل آئے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو صاحب! ہم نے پہلے تو کوئی تعرض نہیں کیا۔ مگر اب ہم قتل ہو جائیں گے، یہ کام آپ کو نہیں کرنے دیں گے۔ پھر انہوں نے مقبرۂ رسولؐ کو نہیں چھیڑا۔ مصلحت حکومت مصلحت دین پر غالب آ گئی۔ اس لیے اگر مقبرہ بنانا منع ہے، تو سب سے پہلے اسی مقبرے کو ڈھانا ہوگا، جو بنا ہوا ہے۔ مگر اس کو اب تمام مذاہب کے گروہوں اور تمام اہل فکر نے قبول کیا ہوا ہے۔

الزام اب کسی بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث کو نہیں جاتا۔ کیونکہ جو لوگ وہاں پر حکمران ہیں، وہ ان تینوں سے متشدد ہیں۔ اگر انہوں نے مقبروں کے حوالے سے بات برداشت کی ہوئی ہے، تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک جائز ہے اور دوسری یہ کہ پبلک پریشر ہے۔ اگر پبلک پریشر کے تحت انہوں نے اجازت دی ہوئی ہے، تو ان پر نفاق کا حکم لگتا ہے اور اگر دین میں اجازت ہے، تو باقیوں کو بھی اعتراض نہیں ہے۔

(علامہ ساجد نقوی) اس ساری گفتگو میں شاید نبی اکرمؐ کا فرمان مدِ نظر نہیں رکھا گیا، جس میں آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ وہ ایک خاص مقدار سے بڑی قبروں کو ہموار کر دیں اور ان کو گرا دیں۔ اس واضح حکم پر عمل کیا گیا تھا۔ جہاں تک نبی اکرمؐ کے روضہ مُقدسہ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ اندر سے قبر اسی طرح ہے۔ اس پر کوئی عمارت نہیں بنائی گئی۔ اس کو محفوظ کرنے کے لیے اس کے اردگرد عمارت بنائی گئی۔ اس کا بھی ایک خاص تاریخی پس منظر ہے۔

مشہور ہے کہ نورالدین زنگی کے زمانے میں کسی نے گستاخی کرنے کی کوشش کی تھی۔

چنانچہ حفاظت کے لیے اردگرد اس کے دیواریں بنائی گئی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور نبی کریمؐ کی قبریں اندر سے کچی ہیں۔ بعض اوقات مصلحت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کی ایک بڑی مثال نبی اکرمؐ کا یہ فرمان ہے، جس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کو آپؐ نے فرمایا تھا کہ اگر مصلحت سامنے نہ ہوتی، تو میں حطیم، جو کعبے سے باہر نکلا ہوا حصہ ہے، کو کعبے کے اندر شامل کرتا۔ اسے گرا کر اس کی تعمیر نو کرتا۔ ان بنیادوں پر کھڑا کرتا، جن بنیادوں پر حضرت ابراہیمؑ نے کھڑا کیا تھا۔ لیکن مصلحت اس کا تقاضا نہیں کرتی۔ اس لیے منافقت کا اتنی جلدی فتویٰ نہیں لگانا چاہیے۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ ہم اتنے اچھے دوست رہے ہیں اور میں آپ کی ہر بات مانتا ہوں۔ مگر یہ بات دل کو لگی نہیں ہے۔ کیونکہ مسئلہ مقبرے کا تھا، قبر کا نہیں تھا۔ حضورؐ کے مزار مبارک میں جو کچھ تعمیر ہے، اس کو مقبرۂ رسولؐ ہی کہیں گے۔ مگر بعض باتیں ہیں، جیسے آپ نے ابھی مصلحت کی طرف اشارہ کیا، تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر کچھ اور باتوں پر بھی مصلحتاً شدت کم ہونی چاہیے اور سب سے بڑی مصلحت یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے دل ایک دوسرے سے جڑے رہیں۔

ایصالِ ثواب اور اعزہ

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ کچھ بڑے کچھ چھوٹے۔ جو جنت میں جائے گا، وہ دیکھے گا کہ اس کا باپ ادھر جل رہا ہے، تو پھر خدا سے دعا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے تو تُو نے اتنا سکون میں رکھا ہے اور قبلہ محترمہ والدہ صاحبہ کو ادھر پھینکا ہوا ہے۔ اس طرح تو میں یہاں بھی ناخوش رہوں گا۔ اللہ اس اچھے بیٹے کی خاطر اس کی بوڑھی ماں کو بھی بخش دے گا۔ اسی طرح ایک اچھے باپ کی قرآن مثال دیتا ہے۔ حضرت خضرؑ کے معاملے میں، جب وہ دیوار بنا رہے تھے، تو خضرؑ نے کہا کہ بھائی بات یہ ہے کہ بچوں کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس کی نیکی پسند تھی۔ اللہ نے چاہا کہ بچوں پر اس نیک آدمی کے توسط سے احسان فرمائے اور ان کو ان کا حق اور خزانہ ملے۔

اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ کی والدہ وفات پا گئیں۔ وہ مدینے سے باہر تھے۔ واپس آئے۔ یہ بخاری میں باب صدقات کی چار پانچ مفصل اور متصل احادیث ہیں۔ جب واپس

پلٹے تو سیدھے نبی اکرمؐ کے ہاں حاضر ہوئے۔ یارسولؐ اللہ! میری ماں مرگئی ہے اور اس کے مرنے پر میں حاضر نہ تھا۔ لوگوں نے اسے دفنا دیا۔ اب اگر میں اس کے لیے کوئی صدقہ و خیرات کروں تو کیا اسے پہنچے گا؟ فرمایا' نعم! ہاں۔ فرمایا' یارسولؐ اللہ! گواہ رہیئے گا کہ میں نے فلاں باغ اپنی ماں کے لیے صدقہ کر دیا۔

ایک اور ماں خواہش حج کر کے مرگئی۔ بیٹا حضورؐ کے پاس پہنچا اور پوچھا یارسولؐ اللہ! میری ماں نے حج کی نیت کی تھی۔ وہ مرگئی۔ اب اگر میں حج کر کے ثواب اپنی ماں کو دے دوں' تو اس کو اس حج اور اس کی نیت کا ثواب پہنچ جائے گا؟ فرمایا' اگر تیرے باپ پر قرض ہوتا اور وہ مرجاتا اور تو بعد میں اس کا قرض ادا کر دیتا' تو اس کا قرض ادا ہوتا کہ نہ ہوتا؟ فرمایا' یارسولؐ اللہ! ہوجاتا۔ فرمایا' تمہارے حج کا ثواب جو تو اپنی ماں کے لیے کرے گا' اس کا ثواب اسے پہنچے گا۔ اس کا ثواب اسے قبر میں پہنچے گا۔ برزخ میں پہنچے گا۔ آخرت میں پہنچے گا۔

بظاہر انسان کی یہ ساری چیزیں مفروضہ اور وہمہ رہ جاتی ہیں۔ قبر بھی وہم رہ جاتی ہے۔ جب ہم مر گئے' تو مر گئے۔ جیسے اہلِ کفر کہا کرتے تھے کہ بھلا بوسیدہ ہڈیوں میں بھی جان پڑے گی۔ یا تو آپ بڑے معروضی اور سائنٹفک ہو جائیں۔ مگر غیر مرئی اور ان تمام باتوں کا' جن کا آپ کو پتہ نہیں۔ جو پردۂ غیاب اور پردۂ اسرار میں ہیں' ان سب باتوں کا تعلق صرف اللہ کے ساتھ ہے۔ باقی باتیں کم تر ترجیح ہیں۔ قبر کوئی معانی نہیں رکھتی۔ عذابِ قبر اور ملائیکہ کوئی معانی نہیں رکھتے۔ یہ تمام چیزیں معانی ایک خدا ہی سے پاتی ہیں۔ اگر آپ اس پر یقین رکھتے ہیں' تو پھر دیگر باتوں میں یقین کرتے ہیں۔ اگر آپ اس میں ایمان نہیں رکھتے' تو پھر آپ کو ان ساری چیزوں کو ماننے کی کیا ضرورت ہے۔

پھر اگر خدا سے محبت اور دوستی کا رشتہ قائم ہے' تو ان سے ہمیں کیا لینا۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی وجہ سے محمد رسولؐ اللہ پیدا ہوسکتے ہیں اور حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا ہوں۔ یعنی پوری تیرہ نسلیں قریش کی گذرنے کے بعد اگر حضور گرامیؐ ایک بہت پہلے گذرے ہوئے باپ اور پیغمبر کی دعا کا نتیجہ ہیں' تو آپ کا کیا خیال ہے کہ ہمارا ارواح سے تعلق قائم نہیں رہ سکتا؟

اللہ تعالیٰ نے جیسے سوچ رکھا ہے کہ جنت والوں کو دُکھ نہیں ہونا چاہیے۔ سو جب ایسے

لوگ جہنم میں جائیں گے اور دوسرے جنت میں جائیں گے۔ اگر ان میں کتاب کا فرق ہے' تو اللہ ان کے دل سے یہ غم محو کر دے گا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ آذر کے لیے دعا کی تھی' تو اللہ نے کہا کہ یہ دعا میں قبول نہ کروں گا۔ حضرت ابراہیمؑ کو تھوڑا سا رنج ہوا۔ اللہ نے فرمایا' دیکھ تیرا باپ' تیرا باپ نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ ایک لتھڑا ہوا کالا بجو سا ہے' جو ان کے پاؤں میں لٹک رہا ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی حضرت ابراہیمؑ نے دوبارہ اس کے لیے دعا نہیں کی۔ خدا وہ صدمہ اٹھا لیتا ہے۔

دیگر پیغمبروں کی طرح نبی کریمؐ کی زندگی مبارکہ ہم پر شہادت ہے۔ جو رسولؐ نے فرمایا کہ پیغمبروں کی بلا سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ صدمہ جو کسی اُمت کے بندے کو پہنچا' وہ رسولؐ کو ضرور پہنچا ہوا ہے۔ اگر ان کا کوئی عزیز جہنم میں گیا' تو رسولؐ کے بھی بڑے عزیز جہنم میں ہیں۔ اگر ان کو کوئی زخم پہنچے' تو رسولؐ نے بھی زخم کھائے ہیں۔ اُمت کا کوئی ایسا عذاب نہیں ہے' جو رسولؐ خود نہیں سہتے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ پیغمبروں کی بلا سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔

سب سے بہترین ثواب' جو آپ اپنے بزرگوں کو دے سکتے ہیں۔ جو ان کی قبر کی تلخیاں بھی کم کرتے ہیں اور اگر وہ نیک ہیں' تو ان کے مدارج میں اضافہ کرتے ہیں' وہ تسبیحات کے ثواب ہیں' لیکن یہ کام نہ کیا کریں کہ ٹیم بلوا کے اور چاولوں پر بٹھا کے ان سے کیا کچھ پڑھواتے ہیں۔ وہ کیا پڑھ رہے ہوتے ہیں اور کیا کچھ نہیں پڑھ رہے ہوتے۔ قرآن ختم کرانے کے یہ طریقے نہیں۔ تھوڑا سا خود پڑھ لیجیے۔ جتنا شوق اور محبت سے ہو سکے' اس سے انہیں بخشئے۔ اللہ تعالیٰ وہ ثواب ان کو پہنچا دے گا۔

عورت' قبرستان' ہیجڑہ

ناجائز کا لفظ تو میرے خیال میں بڑا اُدورکا ہے' عورتوں کو قبرستان جانے کی پہلے ممانعت ضرور تھی اور اس کی وجہ بھی موجود تھی' لیکن میرے خیال میں کوئی خاتون اکیلے محرم کے ساتھ قبر پر جائے اور وہاں دعا و سلام کہے' تو ایسی کوئی رکاوٹ کسی مذہب میں موجود نہیں ہے۔ عمومی طور پر جہاں رش اور ہجوم ہو۔ مرد اور عورت کا وصال ہو' وہاں زمین فتنہ کی ہوتی ہے۔ اللہ اور رسولؐ تو یہی کوشش کرتے ہیں کہ عورتیں اور مرد فتنے سے دُور رہیں۔

حدیث مبارک کے مطابق مدحت خلق کو خدا کا انعام سمجھو۔ کسی شخص کے ظاہر و باطن میں تفاوت نہیں پاتے' تو اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اصحابِ رسولؐ کے بارے میں اُمتہ وسطا لتکونوشھداء علی الناس کہا گیا۔ جیسے ایک جنازہ گذرا۔ اصحابؓ نے کہا' یارسولؐ اللہ! یہ اپنی قوم کا نیک آدمی ہے۔ پھر ایک جنازہ گذرا تو کہا' یہ اپنی قوم کا برا آدمی ہے۔ تو نیک لوگوں کی شہادت بذاتہٗ اللہ کا ایک فیصلہ ہے۔

جہاں تک ہیجڑے کا تعلق ہے' اللہ اس فعل پر کسی کو سزا نہیں دیتا' جو کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ ہیجڑے کی وراثت اور ہیجڑے کا جنازہ علامتی طور پر پڑھا جاتا ہے۔ حضورؐ کی حدیث اس پر ناطق ہے کہ اگر اس پر عورت کا گمان ہوگا' تو عورت کی طرح اور مرد کا گمان ہوگا' تو مرد کی طرح۔

دل اور مصنوعی دل

مصنوعی دل ہو یا اصلی' دل کی کیفیت ایک پورے نفسیاتی مزاج کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ آج سے بہت پہلے سائنسدانوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ چھوٹا سا لوتھڑا' جو انسان کے سینے میں دل کے عنوان سے ہے' اس میں سوچ و وچ کوئی نہیں۔ یہ ایک سادہ گوشت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں کسی قسم کی ذمہ داری نہیں ہے۔ لوگ غلط کہتے ہیں کہ دل سوچتا ہے۔ دل بھاگتا ہے۔ دل ڈرتا ہے۔ دل یہ کرتا ہے' وہ کرتا ہے۔ یہ غلط العام ہے۔

مگر آج کی آراء کچھ مختلف ہیں۔ سالز تجربات میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ دل واقعی سوچتا ہے۔ مگر اس کے اندھے سگنل ہیں۔ اس کے پاس زبان نہیں ہے۔ یہ احساس کی ایک نفیس ترین کیفیت ہے کہ سب سے پہلے ہر چیز اور ہر لفظ کا شاک دل پر ہوتا ہے۔ دل آدھے سیکنڈ میں سگنل دماغ کو بھیجتا ہے۔ اس کیفیت کو دماغ لفظ اور رنگ دیتا ہے۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ دماغ کمپیوٹر ہے اور سگنل دل سے جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے' کچھ عرصے بعد دل ہی مالک کائنات نکل آئے اور انسان کا یہ تضاد لفظی اور معنوی ختم ہو جائے۔

میڈیا یلغار میں چوائس

اس سوال کی ٹیکنالوجی میں تھوڑا سا فرق ہے۔ٹی وی پر اگر کچھ یلغار غیر موزوں سی نظر آتی ہے' تو اس کا کبھی مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ٹی وی کو ختم کر دیا جائے' یا گھر والوں سے اسے بچا کے رکھا جائے۔اس لیے کہ ٹی وی ایک انٹرنیٹ ہے' جو آپ کی قوم' یا آپ کے معاشرے کی ہدایات پر کام کرتا ہے۔اس کا کوئی تعلق اس چیز سے نہیں ہوتا' جس کو یہ بطور انسٹرومنٹ پیش کر رہا ہوتا ہے۔

مگر اگر آپ کو ایک چوائس دیا جائے کہ آپ اپنے بچوں کو کیا چوائس دیں گے؟ مسلم کا یا جہالت کا چوائس؟ آپ ان سے جدید ترین سہولتیں چھین کر اور ان پر پابندی اور رکاوٹیں لگا کے ان کو یہ کہیں کہ ہم نے آپ پر یہ چیزیں اس لیے بند کر دی ہیں کہ یہ فحش اور خراب ہیں' تو کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے بچے یا ابھرتی ہوئی نسلیں آپ کا ساتھ دیں گی؟ وہ یقیناً آپ کے گھروں سے نکل کر بازار' گلی کوچوں میں' جہاں کہیں ان کو یہ مظاہر نظر آئیں گے' ان سے لطف اندوز ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنوں میں ماں باپ کے خلاف ایک تعصب بھی ابھرے گا کہ جس کی ہر فرد کو اجازت ہے' ان کے لیے کیوں نہیں ہے۔وہ اسے ظلم وستم کی ایک نئی کیفیت سمجھیں گے۔

دنیا میں تین قسم کا جبر رائج ہے۔ بقول مغربی مفکرین کے' ایک تو اللہ کا جبر ہے' جو ہر صورت پر قائم ہے۔دوسرا مذہب کا جبر ہے' جو چھوٹی چھوٹی رسومات کی شکل میں ہے اور تیسرا جبر والدِ محترم کا ہے' جو اولاد پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔شاید لوگ باقی جبر کے خلاف کوئی جنگ نہ کر سکیں' مگر

بچے بڑی مہارت اور استقلال کے ساتھ ماں باپ کے اس جبر کے خلاف اس وقت جدوجہد کرتے ہیں' جب ان کو اپنی مرضی کی چیزیں نہیں ملتیں۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ ماں باپ اتنی فراست سے کام لیں کہ دوسرا خطرہ مول لینے کی کوشش کریں۔ اللہ کے رسولؐ کے ارشاد کے مطابق بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں۔ آپ یقین رکھیں کہ اگر آپ انہیں بہتر اقدار دیں گے۔ گھر میں سچ بولیں گے۔ مہربان ہوں گے۔ اسلام کی سختی کی نہیں' عمومی اقدار کا لحاظ رکھیں گے' تو آپ کے بچے یہ محسوس کریں گے کہ ہمارے ماں باپ ہمارے بہترین دوست ہیں۔ وہ کبھی بھی آپ کے پیٹرن سے بغاوت نہیں کریں گے۔

اس مسئلے کا یہ حل نہیں ہے کہ آپ دورِ حاضر کی ایجادات سے قطع تعلق کرلیں۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہم جو ماں باپ' چچا یا بھائی بہنیں ہیں۔ اپنے اندر ایسی خوبصورت قدریں پیدا کریں' جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے توسط سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے کبھی ایسا شخص بور طبیعت کا نہیں دیکھا' جو اللہ پر ایمان اور اپنے پیغمبرؐ سے محبت رکھتا ہو۔ دنیا میں اس سے زیادہ حسین اور اس سے بڑا بہتر انسان نہیں ہوتا۔

تمام بچے حسن و خوبصورتی کو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو کسی نہ کسی احساس جمال سے نوازا ہے۔ آپ گھروں میں اعتدال' امن' محبت اور انس کی خوبیاں پیدا کریں۔

میڈیا' بچے اور مستقبل

یہ والدین کی ذمہ داری ہے۔ انہیں بچوں کو ناظرہ قرآن شریف تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ مذہبی معلومات تک محدود کردینا اور یہ سوچنا کہ ہم کارہائے نمایاں سرانجام دے چکے ہیں' درست نہیں ہے۔ یہ والدین کی اپنی کوتاہی ہے۔ بچوں کی اس میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر کچھ بھی نہ کریں' صرف دو دو چار چار چھوٹے چھوٹے مذہبی اصول' طور طریقوں اور روّیوں کے بچوں کو سکھاتے چلے جائیں' تو بچہ دس پندرہ بیس سال تک بہت کچھ اسلامی ذہن پا جاتا ہے۔ ابھی آپ جو ہٹ دھرمی اور ضد دیکھ رہے ہیں اور جو آپ بے لوث بچے دیکھ رہے ہیں۔ بے شمار بگڑیاں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو جنونیوں کی طرح مذہب کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ رہے ہیں' اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اپنی ججمنٹ کی سنس بچوں کو عطا نہیں کرتے اور پھر کوئی بھی

باہر سے انہیں ترغیب دے کر اپنے ساتھ لگا لیتا ہے۔ یہ بہت خطرناک بات ہے کہ ہم انتہا پسندوں کی گرفت میں ہیں۔ ہر عالم اور دانشور اپنے مقاصد کے لیے ان نوجوانوں کو استعمال کرتا ہے۔ اصولاً اگر ان کو گھر سے تھوڑی تھوڑی تعلیم ملتی رہے' تو ان کی سنس آف ججمنٹ اور تنقیدی نظر بیدار رہتی ہے۔ وہ آسانی سے کسی کے دام فریب میں نہیں آتے۔

ڈش کہاں تک خطرناک

(مستنصر حسین تارڑ) اوورآل میڈیا بالخصوص ٹیلیویژن بہت ڈیموکریٹک میڈیا ہے۔ یہ قطعی طور پر آپ کو مجبور نہیں کرتا کہ آپ اسے دیکھیں۔ آپ پہلے 20' 25 ہزار روپے کا کلر ٹیلی ویژن بازار سے اٹھا کر لاتے ہیں۔ پھر دس ہزار کی ایک ڈش اپنے گھر کے اوپر نصب کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ سراسر آپ کا اپنا فیصلہ ہے۔ اب اس لمحے آپ نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا آپ کو ٹیلی ویژن یا ڈش چاہیے؟ زبردستی آپ کو ڈش کوئی بھی نہیں دکھا سکتا۔ اس کے پروگرام آپ دیکھ سکتے ہیں' تو لے آیئے' سو بسم اللہ! لیکن آپ یہ نہیں کر سکتے کہ اسے پورے معاشرے میں ممنوع قرار دیں۔ یہ کہیں بھی ممکن نہیں ہے۔ جیسے آپ ریڈیو پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ بی بی سی کے خلاف مہم چلی' ناکام رہی۔ اسی طرح وی سی آر کے خلاف مہم چلتی رہی۔ ہم کسی جزیرے میں نہیں رہتے۔ یہ گلوبل ولیج کا تصور ہے۔ اس میں یہ سوچ کہ ڈش پر پابندی لگ جائے گی' ناممکن بات ہے۔ عین ممکن ہے کہ ہماری اخلاقیات اس کی زد میں آتی ہوں' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ کوئی اور میرے راستے بدلتا ہے۔ جب تک آپ کو اپنے تعین پر اختیار نہیں' آپ کو دوسروں کی اخلاقیات قبول کرنی پڑیں گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ٹیلی ویژن آن کرتے ہیں' تو گویا آپ پھر اپنا جمہوری حق ہاں یا نہیں کا استعمال کرتے ہوئے عمل کرتے ہیں۔ آپ کی اپنی پسند ہے کہ ڈش یا نارمل پی ٹی وی کا کوئی اسٹیشن آن کرتے ہیں۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ ڈش پر رقص وسرود وغیرہ ہوتا ہے۔ تو اگر آپ ایک ایسی جگہ جائیں' جہاں کام ہی یہ ہو رہا ہو اور کہیں کہ یہاں رقص وسرود کیوں ہوتا ہے' تو یہ اعتراض بے جا ہے۔ یہ آپ کی اپنی چوائس ہے۔ آپ کی اپنی پسند ناپسند ہے کہ آپ کون سا پروگرام دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

آخری بات، جس پر بہت گفتگو ہو سکتی ہے۔ یہ ہے کہ تبدیلیاں آپ کی مرضی سے نہیں آتیں۔ وہ تبدیلیاں معاشرے میں ہر جگہ آ رہی ہیں۔ آپ کے پاس واحد حل اب یہ رہ جاتا ہے کہ آپ اپنی اولاد کی تربیت اس طور کریں کہ وہ جو چیزیں دیکھتے ہیں، ان کو دیکھیں۔ لیکن ان کے منفی اثرات کو قبول نہ کریں۔ ان کی آپ تربیت کریں گے، ان کو اس سے ہٹا نہیں سکتے۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) کیا یہ ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم اپنے بچوں کو آگہی سے ناآشنا رکھیں؟ کیا ہمارے یا کسی بھی معاشرے میں کوئی بچہ اپنے گرد و پیش سے لاتعلق رہ سکتا ہے؟ وہ اپنے گھر میں ڈش نہیں دیکھے گا، تو بازار میں کہیں دیکھ آئے گا۔ اس کے ساتھ اس میں ایک اور بُری عادت پروان چڑھے گی۔ وہ گھر سے بھاگے گا۔ کہیں اور سے چانس لے گا۔ بچہ آپ سے بہت زیادہ متجسس ہے۔ وہ دیکھنے کا جوش و خروش رکھتا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی گھٹیا کام ہو، آپ نے ایک چانس اپنے ذہن میں لینا ہے۔ میں نے وہ لیا ہے۔ آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ میں چاہتا ہوں، میرے بچے علم سے فیصلہ کریں، لاعلمی سے تباہ نہ ہوں۔ میرا فیصلہ اپنے بچوں کے حق میں یہ ہے کہ میں ان کے علم کے نقائص برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر ان میں لاعلمی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میرے پاس ٹی وی ہے۔ میں نے انہیں ٹی وی دکھایا۔ شروع میں بڑا ہیجان رہا۔ اب بمشکل کوئی اس قسم کا جوش و خروش ظاہر کرتا ہے۔

شروع میں ڈش کا بڑا رولا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں نے بڑی غلطی کی ہے۔ میں نے بچوں کو چوائس دیا۔ رفتہ رفتہ دو چار دس دن انہوں نے گانے سنے۔ چڑچڑے باپ کی طرح ان کو روکا نہیں۔ میں ان کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہی میں آپ سے کہوں گا کہ ان پر سے نظر نہ ہٹائیے۔ خبرداری کے ساتھ غیر متحرک رہیں۔ آپ والدین ہیں۔ اپنے بچوں میں رو پذیر ہر تبدیلی پر نظر رکھیں۔ میں اس وقت اپنے آپ اور اپنے بچوں کو محفوظ سمجھتا ہوں۔ میں اپنے بچوں کے بارے میں پروا نہیں کرتا۔ مجھے پتہ ہے کہ ان پر امیج اور اثرات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

مگر جو بات بچوں میں پیدا ہوتی ہے، وہ ایک اصولی مؤقف میں استحکام ہے۔ ان میں ایک سیکھنے کا عمل پیدا ہوا ہے۔ یہ جوان میں انتخابی اور اصولی صلاحیت آئی ہے، اس کے بعد میرا تجربہ کامیاب ہے۔ اسلام ان پر پابندی نہیں لگاتا۔ اسلام کس پس منظر میں اٹھا ہے؟ اس کے اٹھنے، بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے تمام عرصے میں جب تک خدا نے حکم نہیں دیا، خانۂ کعبہ کے گرد

ننگے ڈانس ہوتے تھے۔ جب تک قرآن میں ممانعت نہیں آئی' اس معاشرے میں کعبۂ معظمہ کے گرد مرد اور عورتیں ننگے طواف کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ کو اپنے گھر کے تقدس کا خیال آیا اور حکم دیا کہ اب کوئی شخص کعبے کا ننگے وجود طواف نہیں کر سکتا۔

ڈش کے بارے میں شریعت کے اعتبار سے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں بنتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپ کی بینائی کا ضیاع یا فریب نظر ہے۔ یہ فقہی گناہ نہیں بنتا۔ اگر آپ خواب میں کوئی ایسی چیز دیکھ لیں' تو کیا کوئی آدمی صبح اپنے آپ کو شرعی سزا تو نہیں دیتا۔ شطرنج' تاش وغیرہ تمام چیزوں پر یہی حکم لاگو ہوتا ہے۔ اگر یہ چیزیں آپ کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کر رہیں۔ نماز سے لاپروائی برتنے کی طرف نہیں لا رہیں' تو ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر غفلت کا ارتکاب ہے' تو پھر یہ لہو ولعب ہے۔

موسیقی سننے کی اجازت

ہر چیز نیکی یا برائی کی طرف جانے کا ذریعہ ہے۔ جہاں وہ آلات صرف اور صرف غلط مقاصد یا جبلت کے ہیجان کے لیے استعمال ہوتے ہیں' ان سے یقیناً منع کیا گیا اور جہاں ایک انسٹرومنٹ لوکل ہے۔ جیسے شادیوں پر عورتیں دف بجاتی ہیں اور نغمے' گیت گاتی ہیں' حضورؐ نے اس کی اجازت بھی دی اور ان کو سنا بھی۔ ان کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ جیسے تاش ہے یا کوئی بھی چیز ہو' جو آپ کی توجہ کو ہٹاتی ہے یا اور طرف کھینچ لیتی ہے۔ آپ فرائض اور عبادات سے غافل ہو جاتے ہیں اور وہ چیز یا طلب اللہ کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے' تو وہ مردود اور حرام ہے۔ اور جو چیز اللہ سے غافل نہ کرے' بقدر ظرف اس کا کوئی حرج نہیں ہے۔

موسیقی' شاعری' قوالی

موسیقی کی ایک یا دوسری صنف پر تو قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ البتہ موسیقی آپ کو خدا کی یاد سے غافل کر دے' تو وہ واقعی آپ کے لیے لعنت اور مصیبت ہے۔ اگر آپ موسیقی کے ہوتے ہوئے بھی احکام خداوندی کی متابعت کرتے ہیں اور اس میں آپ کی دلچسپی آپ کے بنیادی تعلق کو مجروح نہیں کرتی' تو میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی اتنا بڑا حرج نہیں ہے۔ ویسے بھی حضور گرامی

مرتبتؐ کے زمانے میں دف بجائی گئی۔ گانے والیاں تھیں۔ بلکہ حضورؐ کی ایک غلام کی شادی تھی اوراُم المومنین عائشہ صدیقہؓ کے پاس حضورؐ آئے' تو فرمایا اے عائشہؓ! اس کے ساتھ گانے والیاں نہیں بھیجیں؟ اُم المومنینؓ نے کہا کہ میں سمجھی' آپؐ برا منائیں گے۔ فرمایا' یہ تو ان کا رسم ورواج ہے۔ اس سے کم ازکم ایک شہادت تو ملتی ہے کہ لوک موسیقی پر ایسی کوئی قید نہیں۔

یہی حکم بعینہٖ شاعری پر لاگو ہوتا ہے۔ شاعری اچھی بھی ہے' بری بھی ہے۔ چونکہ شاعری پر حضورؐ نے حتمی رائے دے دی ہے' اس لیے تمام جمالیاتی شعبوں میں یہ رائے جائے گی کہ موسیقی اچھی بھی ہے' بری بھی ہے۔ تصوف میں موسیقی کو بحیثیت ایک آلہ استعمال کیا گیا۔ اہل چشت جب ہندوستان میں آئے' تو انہوں نے دیکھا کہ ہندوستانیوں کی جمالیات بہت زوروں پر ہے۔ لوگ بنیادی طور پر جذباتی ہیں اور وہ موسیقی میں دُکھ' درد اور غم بھلا لیتے ہیں۔ انہوں نے قوالی کی اختراع کی۔ اجازت نکلی' حتیٰ کہ موسیقی میں بڑا راگ بھی ایک بڑے صوفی کا ہی ہے۔ امیر خسرو نے راگ کو دریافت کیا یا ایجاد کیا۔

لیکن جو پڑھے لکھے صوفی ہیں' وہ موسیقی کو آسرا اور ایک مقامی انحصار سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کے دل پر آزردگی ہے اور آپ ایک گانا سُن کے اس آزردگی کو دُور کر لیتے ہیں' تو یہ آپ کی عادت کی تشکیل بن جائے گی۔ جب بھی آپ کو کوئی ذہنی کوفت ہوئی اور پریشانی محسوس ہوئی' تو آپ بغیر کوئی بہتر طریقہ استعمال کیے' موسیقی سننے چلے جائیں گے۔ شیخ سیدنا ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ میرے دل پر اضطراب تھا۔ میں اپنے شیخ کے حضور گیا اور کہا کہ سماع کا بندوبست کیجیے۔ میرے شیخ نے میرے لیے سماع کا بندوبست کیا۔ جب مجھے قرار آیا' تو میں اٹھ کے چلا۔ میرے شیخ نے پیچھے سے آواز دی کہ اے علی بن عثمان! ایک وقت آئے گا کہ تجھے سماع اور کوے کی آواز میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔

اگر آپ اپنی ذات اور اضطراب کو چھوٹی چھوٹی چیزوں میں نہیں ڈالیں گے' تو آپ اس کے نتیجے میں اپنے کو ایک بہتر اور مکمل انسانیت کی طرف حرکت کرتا محسوس کریں گے۔ آپ کی میچورٹی بڑھ جائے گی۔ اگر آپ ادھر ہی رُک گئے اور موسیقی میں ہی دفن ہو گئے اور اسی کے ریکارڈ سن سن کر سر دُھنتے رہے' تو یہ یقینی بات ہے کہ اگلا شعوری مرحلہ آپ کبھی طے نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے بڑے صوفیا سماع کو زیادہ تجویز نہیں کرتے۔ عام صوفیاء اسے اختیار کرتے اور اس کو سنتے بھی

ہیں۔ معاملات دونوں طرف ایک جیسے ہیں۔ اس لیے میری رائے میں موسیقی اچھی اور بُری دونوں ہی ہیں۔ اگر آپ کی توجہ کا غالب حصہ یہ لے جائے تو یہ بری چیز ہے اور اگر یہ آپ کے وقتی ٹمپر کی بازگشت ہے تو پھر او کے۔ نو پرابلم۔

پتھروں کا استعمال

میں نے پتھروں کی تخصیص کا علم حاصل کیا اور بہت سارے پتھر دیکھے اور ان کے بارے میں سنا۔ اس رائے میں، میں خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے بہت اتفاق کرتا ہوں۔ خواجہ نظامؒ جب عبادات سے بور ہو جاتے۔ لگتا تو ایسے ہی ہے کہ جب عبادت گزاری یکسانیت کا شکار ہو جاتی، تو ان کے بارے میں خواجہ سجزی لکھتے ہیں کہ حضرت نظامؒ پتھروں پر نظر کیا کرتے تھے۔ پتھروں کا اس سے بڑا مقصد مجھے کوئی نظر نہیں آیا کہ آپ اپنی بوریت اور یکسانیت کو خوش نما رنگوں سے تازہ کر سکتے ہیں۔ پتھر خوش نما ہیں اور پتھر عبادت گزار بھی ہیں ثم قست قلوبکم بعض دل پتھروں سے زیادہ سخت ہیں۔ بعض پتھر خدا کے خوف سے پھٹ جاتے ہیں۔ بعض پتھروں کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ ایسے پتھر انسانوں سے یقیناً بہتر مقام کے مالک ہیں جب کہ قساوتِ قلبی میں بعض انسان پتھروں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ مگر ایسا کوئی تصور نہیں کہ وہ آپ کی عبادت اور روزی میں معاون ہوں۔

تصویر اور مجسمہ سازی

قیامت کے دن مجسمہ سازی کے حوالے سے بڑی مشکل پڑے گی۔ وہاں اس سے کہا جائے گا کہ جو صورت بنائی ہے، اس میں جان بھی ڈالو۔ درخت وغیرہ میں تو کچھ آسانی رہے گی۔ مجسمہ سازی میں بڑی تکلیف ہوگی۔ میں ایک جگہ گیا، تو دیکھا کہ لوگ بدھا کے بت بنا رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آج بدھا زندہ ہوتا، تو وہ سب سے زیادہ نفرت اس بات سے کرتا کہ لوگ اس کے بت بنا رہے ہیں۔ اللہ کے اس بندے نے اپنی تمام زندگی جو تعلیم دی، وہ تمام بت پرستی کے خلاف تھی۔ اس کے گروپ میں آج بھی ہنایان مہایان کا فرقہ ان کو ایک استاد کی طرح مانتا ہے۔ ہندو راجہ اشوک تھا، جس نے بدنیتی سے کام لے کر ایک فرقے کی بنیاد رکھی اور بت

بنانے شروع کر دیئے۔

ایک زیادتی اشوک کر گیا۔ دوسرا ایک مسلمان کر گیا۔ تصاویر کی حد تک اجازت ہے' لیکن بت بنانے کے حوالے سے اگر بُت پرستی کے پلٹاؤ کا خدشہ نہ ہو' تو ایسے میں شاید اس کی ممانعت نہیں۔ مگر جیسے رسول اللہؐ کے زمانے میں منقش پردے لگائے گئے' تو حضور گرامی مرتبتؐ نے اس لیے اتروا دیئے کہ لوگ اس وقت کسی بھی چیز کی پرستش کرتے تھے۔ آپؐ نے سمجھا' ایسا نہ ہو کہ انہی پردوں کی نسبت سے پرستش شروع ہو جائے' اتروا دیئے۔ جب بت پرستی کا شبہ' ڈر اور خوف نہ ہو' تو ایسے میں ان چیزوں میں کوئی حرج نہیں۔

حضورؐ کی شبیہ

یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے بہت سارے لوگوں نے حضورؐ کی شبیہ تیار کی۔ کوشش کی' بنائیں۔ ہم پر لازم تو نہیں ہے کہ ہم ان شبیہات پر ایمان لے آئیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں اور انہوں نے کوئی شبیہ یا کوئی مماثلت تخلیق کی ہے' تو ہمیں وہ مجبور تو نہیں کر رہے کہ ہم ان کی شبیہ کو واقعی انہی کی شبیہ مان لیں۔ مسلمانوں کی جانب سے اس قسم کا رویّہ سیدھا سادا غیر تعلیمی ہے۔ آپ امریکی حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ انہوں نے شبیہ مبارک بنا کر ہماری ذلت و آزاری کی ہے اور جو عملاً وہ آپ کے دین کا مطلق ستیاناس کر رہے ہیں' آپ کو اپنا سسٹم اور خیال دے کر آپ کے دین کی جڑیں کاٹ رہے ہیں' اس میں آپ کو ان سے بڑی ہمدردی ہے۔ یہ عجیب سی بات لگتی ہے۔

جہاں تک سلمان رُشدی کی طرف سے غلط باتیں حضورؐ سے منسوب کرنے کا تعلق ہے' یقیناً اس کی تاریخ کمزور ہے۔ اس کا علم کمزور ہے۔ اس قدر جاہل مطلق کی باتیں تو ویسے بھی درخورِ اعتنا نہیں ہو سکتیں۔ مسلمانوں کو غصہ آیا۔ وہ بہت جائز تھا۔ اس کے قتل کا فتویٰ بھی جائز تھا۔ سلمان رشدی کے لیے غلط باتوں کی یہ سزا کافی ہے کہ اس کا ایک دن بھی موت کے خوف کے بغیر نہیں گذرا ہوگا۔

اسبابِ زوالِ اُمت

مذہب کی بنیادی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کیا یہ نظام حکومت یا نظام تعلیم ہوتا ہے؟ یا شاید ان دونوں باتوں سے بڑھ کر اسے کائناتی اور مابعد الطبیعیاتی حیثیت سے دیکھا جائے' کیا اللہ تعالیٰ نے کسی نظام کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ وہ حکومت قائم کرے؟ کوئی ایک نظام استوار کرے یا اسے آزمائش کے لیے بھیجا؟ اسے کہا' تمہیں عقل دے دی' اب پیغام دے رہا ہوں۔ چاہے' تو مان لو۔ چاہے' تو نہ مانو۔ خدا کی طرف سے دیکھتے ہوئے حکومت قطعاً کسی مذہب کا حصہ نہیں بنتی۔ مگر جب اللہ نے یہ کہہ دیا کہ جو میری تابعداری کریں گے' انہیں نہ صرف میں خلیفۃ اللہ فی الآسمان رکھوں گا' بلکہ خلیفۃ اللہ فی الارض بھی رکھوں گا۔ ان کو حکومت بھی دوں گا' عزت بھی دوں گا۔

پوری حیات انسانی کا ایک رول نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خواہ وہ عیسائی ہے۔ کافر یا مسلمان ہے' وہ مجموعی طور پر ایک چیز کا حامل ہے' جو سب میں مشترک ہے' وہ عقل انساں ہے۔ شعور اور فکر ہے۔ اس شعور کو مدد دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ اس تصور کی استعانت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قوموں کی تہذیب وتمدن اور ان کے عروج وزوال کی داستانیں دیں۔

قرآن کہتا ہے سیروافی الارض کیا تم نے دیکھا نہیں! کتنی بستیاں اوندھی پڑی ہیں! کتنے کنویں خشک پڑے ہیں! کیا تو نے اجاڑ اور ویران نشان نہیں دیکھے؟ آج کا ماہر آثار قدیمہ ان آثار کو دیکھنے جاتا ہے' تو وہ عبرت کے لیے نہیں دیکھتا' بلکہ وہ اسے تاریخ کا ایک تسلسل سمجھتا ہے۔ وہ یہ کبھی بھی نہیں کہے گا کہ یہاں ایک قوم آباد تھی' جس نے خدا کی نافرمانی کی اور خدا

نے اسے اجاڑ کر رکھ دیا۔ یہ کسی محقق نے نہیں لکھا۔ مگر اللہ کی طرف سے دیکھیں' تو ان قوموں کے آثار کے مطالعے کا واحد مقصد یہ ہونا چاہیے کہ تم غور کرو۔ سوچو سمجھو۔ اپنے آپ کو کہیں بریکیں لگاؤ۔

جب ایک بہت بڑا استاد پیدا ہوتا ہے' تو وہ اکیڈمی آف لیٹرز میں جاتا ہے۔ نبی کریمؐ سا میں نے کوئی استاد زمانے میں نہیں دیکھا۔ ان کے طریقۂ تعلیم سے کیا شاگرد تیار ہوئے۔ بلال حبشیؓ پتھر کوٹتا کوٹتا یمن کا گورنر بھی بن سکتا ہے۔ صہیبؓ غلام ہے' مگر اسے آپ کوئی بھی کمانڈ دے دیں۔ کوئی سینڈھرسٹ نہیں پڑھا۔ اکیڈمی میں تعلیم نہیں پایا۔ مگر جب اسامہؓ چودہ سال کا نکلتا ہے' تو ایک فاتح لشکر کا سپہ سالار بن کر نکلتا ہے۔ چودہ سال کے لڑکوں کو کیا ہوش ہوسکتا ہے؟ اس نے کون سی تکنیک سیکھ رکھی تھی؟

اس طرح خالد مشہور جرنیل تو نہیں تھا۔ بہادر آدمی سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب واپس پلٹتا ہے' تو سیف اللہ کہلاتا تھا۔ یعنی اللہ کی تلوار! یہ اللہ کے رسولؐ کے وقت تھا اور لوگوں کو انہوں نے ذاتی طور پر ترغیب دی۔ آج بھی میں اس تبلیغ اور دوسرے مشن کے صرف ایک وجہ سے خلاف ہوں کہ وہ دوسرے آدمی کو تبدیلی کے لیے مناسب وقت نہیں دیتے۔ تین یا سات دن کا آپ جتنی مرضی چلہ لگا لیں۔ اس اُمت کو بائیس سال پوری تربیت کے دَور سے گزرنے چاہئیں۔ ایک کتاب پڑھانے کے لیے ایک استاد نے تبلیغ' ہدایت اور رشد کے لیے بائیس سال لگائے اور بائیس سال کے بعد ایک ایسی جماعت تخلیق ہوئی کہ اس جماعت پر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رضو عنہ کہتے ہوئے ناز کیا گیا۔

یہ لوگ عجیب وغریب اور اعلیٰ ترین کلاس تخلیق ہوئے۔ اگر خدانخواستہ کبھی آمنے سامنے بھی ہو گئے' تو ایک دوسرے کو تعلیم یاد دلا دی۔ اگر جمل کی جنگ میں طلحہ اور زبیر علی کے سامنے آئے۔ تلوار بکف ہوئے' تو ایک دوسرے کا رستہ چھوڑ گئے۔ انہیں پتہ لگا کہ ہم وہ لوگ نہیں' جو آپس میں لڑنے والے ہیں۔ ہمارے نصیب میں ایک دوسرے سے جنگ نہیں۔ پھر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حضور حضرت علیؓ جنگ جمل کے بعد پہنچتے ہیں' تو وہ سلوک بھی تاریخ کو یاد ہوگا۔ سو رسولؐ اللہ کے جو تعلیمی مقاصد تھے' ان کے فوری نتائج شاگردوں تک مکمل پورے ہوئے۔

حضورؐ نے فرمایا' سب سے بہترین زمانہ میرا ہے۔ اس کے بعد کا ثم الذین یلونهم

زمانہ بالواسطہ تعلیم کا ہے۔اب لوگوں نے اصحاب سے سیکھنا ہے۔کچھ نہ کچھ اہمیت بڑے استاد کی گم ہوجاتی ہے۔پھر آپؐ نے فرمایاثم الـذین یلونھم میرے زمانے کے بعد میرے اصحاب کا زمانہ ہے۔پھر تابعین کا زمانہ ہے۔یہ بہتر زمانے ہیں۔پھر تبع تابعین کا زمانہ ہے۔پھر فرمایا' فتنہ ہی فتنہ ہے۔یہ تبع تابعین حکومت کے لحاظ سے اہم نہیں ہیں' پیغام کے لحاظ سے اہم ہیں۔وہ پیغام' جس کے تحت پہلی مرتبہ پانچ ہزار اصحاب بیعت رضوان میں شریک تھے۔خدا کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔بخشے ہوئے لوگ تھے۔اتنی بڑی تعداد میں کوئی استاد زمین پر خدا کے بندے پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔وہ کلاس گئی' تو پھر دوسرے آئے۔یہ بہت زیادہ لوگ تھے۔مگر اتنی آگہی اور شعور ان میں نہ تھا' جتنا اصحاب میں تھا۔پھر تیسری کلاس آئی۔

یہ تو ہے پیغام کے لحاظ سے۔اس کے بعد کیا ہوا؟ جنہیں آپ صوفیاء اور اولیاء اللہ العزیز کہتے ہیں' عموماً اعتقادی ہمارے ساتھ لڑ پڑتے ہیں۔وہ کہتے ہیں' یہ عجیب سی چیز ہے۔ تصوف یہ ہے' وہ ہے۔اصل میں ایسا نہیں ہے۔جب مجموعی طور پر بڑی کلاسز تک وہ پیغام ختم ہوگیا' تو انفرادی سطح پر دو دو چار چار افراد نے اسی سبق کو سنبھالے رکھا۔یہ وہ افراد تھے' جن میں محمد بن اسماعیل البخاری بھی شامل ہیں۔مسلم بن حجاج' نووی اور بیضاوی بھی شامل ہیں۔جہاں بعد میں امام ابوحنیفہؒ بھی شامل ہوئے۔محمد بن ادریس الشافعی اور احمد بن حنبل بھی ہیں۔

پھر اس دَور سے گذرتے ہوئے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ آتے ہیں۔جنہوں نے واپس اسی پیغام کو رجعت کی اور اسے ہر حال میں سنبھالنے کی کوشش کی۔خدا نے ان کو بھی عزت وتوقیر سے نوازا۔ان کا پورا ساتھ دیا' جیسے پہلے اپنے دوستوں کا ساتھ دیا تھا۔پہلے تو بہت بڑی تعداد تھی۔ پانچ ہزار اور کہاں اب پانچ پھر پانچ بھی نہ رہے۔ظاہر ہے' جس جس زمانے میں ایک ایک خدا کا دوست ہوتا رہا' تو خدا زمانہ ہی اس کے نام کردیتا تھا۔مگر آج برصغیر میں کم از کم چھپن کروڑ مسلمان ہیں۔یہ بے تحاشا آبادی جو مسلمانوں کی تھی۔اسلام کا پیغام نہ ہوتا' تو یہ کہاں سے ہوتی؟ اسلام سے ہی ہوئی۔البتہ اب یہاں میل ملاپ جو ہوگیا ہے۔ہر تصوّف کے ساتھ ہندوانہ طاقتیں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ہندوستانی بنیادی طور پر بُت پرست تھے۔ان کی اتنی طویل تاریخ تھی کہ ہر زمانے میں ہندوؤں نے صاف ستھری تہذیب کو اپنا ایک دیوتا بنالیا۔جین آیا' تو جینا وترا کردیا۔ بدھ آیا تو بدھستا وترا کردیا۔صرف ایک اسلام بچا ہے۔

''انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن'' کا یہ جملہ مجھے بڑا پسند ہے کہ اسلام میں خدا کی وحدانیت کے متعلق اتنا ٹھیک اور بلاکم وکاست بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی میتھالوجی ممکن نہیں تھی۔ اوپر سے ہٹ کے کچھ نہیں ہوا۔ نیچے انہوں نے سب کچھ تہہ وبالا کر دیا۔ بارہ سو سالہ مسلمانوں کی مسلسل حکومت رہی۔ حتیٰ کہ سولہویں صدی میں تاریخ عالم میں صرف تین بادشاہ تھے۔ باقی چھوٹے چھوٹے اور بونے بادشاہ تھے۔ یہی حال یورپ کے بادشاہوں کا تھا۔ مگر جو دنیا پر حقیقی بادشاہ تھے ان میں سلطان سلیمان ذی شان ہے۔ ادھر ایران اور ماوراالنہر میں عباس اعظم تھے۔ دوسری طرف ہندوستان میں سلطان جلال الدین محمد اکبر تھے۔ ان بڑے بادشاہوں کے مقابلے میں آپ یورپ میں کسی بادشاہ کا نام ہی نہیں جانتے۔ صرف الزبتھ کا نام جانتے ہیں۔

جلال الدین اکبر کے زمانے میں جب الزبتھ کے ایلچی آئے اور انہوں نے بڑی لمبی چوڑی داستان پیش کی اور ملکہ بحر وبر اور یہ وہ کہانیاں پیش کیں، تو اکبر نے اپنے وزیر ابوالفضل سے پوچھا کہ ایں جزیرہ نما چرا است' کہ یہ اتنی بڑی ملکہ رہتی کہاں ہے؟ اس وقت انگلینڈ کتنا درخور اعتنا تھا' آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سترہویں صدی تک آپ کے شہر مقدس شہروں کی طرح سمجھے جاتے تھے۔ یورپ میں ان کی داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ نیپلز کے بچوں میں اس قسم کے تصوّرات تھے۔ اس کے مقابلے میں شان الیزے میں اس وقت گھٹنے گھٹنے کیچڑ کھڑا ہوتا' جب ستر ہزار حمام قرطبہ میں صبح وشام جاری ہوتے تھے اور ہر جگہ سٹریٹ لائٹس لگی ہوتی تھیں۔

زیادہ وقت نہیں گذرا۔ ایک سو سال کے وقفے کے بعد بھی اسلام کو کوئی شکست نہیں ہوئی۔ نااہل قیادتوں کی وجہ سے اس پر ادبار ضرور آیا' لیکن وہ اس کے باوجود بہت اچھی طرح لڑتا رہا۔ سوائے موجودہ وقت کے اسلام پر کبھی سخت وقت نہیں آیا۔ اسلام نظریاتی طاقت کی بنیاد پر ہی لڑتا رہا ہے۔ کیونکہ اسلام میں دو اہلیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سائنس کے کبھی خلاف نہیں تھا۔ بلکہ ہر وقت سائنس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموات و الارض بار بار غور وفکر پر آمادہ کرنے والا یہ مذہب سائنس کو نظر انداز تو نہیں کر سکتا۔ حوصلہ افزائی کرتا رہا۔

دوسری طرف اگر آپ نے کبھی پہلا انگریزی کا ناول پڑھا ہو' اس میں اس کی ہیروئن اپنے باپ کو کہتی ہے کہ انگلینڈ اور فرانس کا معاشرہ بڑا جارحانہ معاشرہ ہے۔ اس میں تو ہمیں کوئی

پنپنے نہیں دیتا۔ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ جو بھی چار پیسے ہوتے ہیں' چھین لیتے ہیں۔ آؤ مراکش چلے چلیں۔ وہاں کے مسلمان حکمران بڑے نیک' روادار اور عادل ہیں۔ وہاں ہم سے کوئی ہمارا مال نہیں چھین سکتا۔ تب بھی اس وقت مسلم معاشرہ زیادہ روادار اور برداشت کرنے والا معاشرہ تھا۔ یہ بات لین پول نے اپنی کتاب میں لکھی ہے کہ فتح کے عالم میں جتنا روادار صلاح الدین محمد ایوبی نکلا' تاریخ عالم میں کوئی ایسا بادشاہ نہیں ہے۔ شکست میں وہ بہت اچھی طرح لڑتے' جبکہ فتح میں وہ بڑے ہی روادار بادشاہ تھے۔ انہوں نے جبراً کسی کو مسلمان نہیں کیا۔ تاریخ دنیا میں سب سے بڑی مسلمان حکومت انڈونیشیا میں ایک فوجی نہیں اترا اور وہ آج مسلمانوں کی سب سے سرکردہ ریاست ہے۔

اگر آپ آج دیکھتے ہیں' تو ہمارا میچ بڑا ہی سخت پڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں ہم سے ایک بڑی حماقت ہوئی۔ فتح کا نشہ ایسا چڑھا کہ ہم علم سے بے خبر ہو گئے۔ ہمیں بڑا واضح بحران سلطان سلیمان ذی شان کے بعد نظر آتا ہے۔ وہ ہنگری' بوڈاپسٹ اور یوگوسلاویہ کو روندتا ہوا نکل گیا۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت کی حکمت عملی اور آلات جنگ متقابل قوتوں سے بہت بہتر تھے۔ یورپ کے متحدہ بحری بیڑے کے مقابلے میں سلطان سلیمان ذی شان نے خیرالدین باربروسا کو بحری بیڑہ بنانے کا حکم دیا۔

یہ تاریخ کے حقائق ہیں' جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ امیر خیرالدین باربروسا نے بحیرۂ روم ان کے لیے مکمل طور پر سیل کر دیا تھا۔ بحیرۂ روم میں پرتگال' سپین' انگلینڈ اور فرانس کا کوئی جہاز نصف صدی تک کراس نہیں کر سکتا تھا۔ اٹلی میں خیرالدین باربروسا کے ایک شاگرد نے تین مہینے تک روم پر حکومت کی اور خراج لیتا رہا۔ مگر اس کے پاس فوج ہی نہیں تھی کہ نیچے اترتا اور سسلی کی فتح سب کو معلوم ہے۔ صقلیہ میں تین سو سال پر مسلمان قابض رہے۔

اب ہوا یہ کہ فتح کے اس غرور نے مسلمانوں کو علم سے غافل کر دیا۔ علم ایسا گیا کہ ان کے آلات بوسیدہ ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے مقابلے میں احیائے علوم اور تحریک اصلاح مذہب کی وجہ سے اہل یورپ علم کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے۔ یہ قومیں اتنی تیزی سے آگے بڑھیں کہ مسلمان پسماندگی سے دوچار ہونا شروع ہو گئے۔ اہلِ یورپ کی عقل اور علم میں اضافہ ہوا اور قرطبہ کے پڑھے ہوئے سبق انہوں نے ہم پر استعمال کیے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں دو سو سال تک قرطبہ کے نصاب'

جاری رہے اور فلاسفی کا باپ جسے ڈیکارٹ کہتے ہیں' حجتہ الاسلام غزالی کے لفظ نقل کرتا ہے اور مانتا نہیں' کہاں سے لیے۔ پوری کی پوری مثال ''تحافتہ الفلاسفہ'' کی نقل کرتا ہے اور مانتا نہیں ہے کہ میں نے غزالی سے لی۔ یہ اتنے بے دید نقل گر ہیں۔

ابھی تک تو تاریخ عالم یہ بتاتی ہے کہ فتح علم کی' علم و دانش کی رہی ہے۔ جس کے پاس عقل و معرفت کے غلبے ہوئے ہیں' وہی حکمران ہوئے ہیں۔ آلاتی فتح کسی کی بھی نہیں ہوئی۔ آج کے دَور میں ایک چیز بڑی واضح ہے کہ سب سے بڑا حملہ ہمارے دین پر ہو رہا ہے۔ حربی لحاظ سے نہیں۔ ہمیں اس بات کی پروا نہیں کہ امریکہ مسلمانوں کا قتل عام کر رہا ہے۔ ہم ایک ارب سے زیادہ ہیں۔ وہ سارے ایٹم بم استعمال کر کے بھی مسلمان قوم کو ختم نہیں کر سکتا۔

مگر مسلمان کا ذہنی طور پر مغلوب ہو جانا ایک بدترین بات ہے۔ ہم دو چیزوں سے یورپی ممالک کے مقابلے میں محروم ہوئے۔ ایک تو ہم ترجیحات کے احساس کو بالکل کھو بیٹھے ہیں۔ جہاں اللہ ایک وجود غالب ہمارے مسلمانوں کے دلوں میں تھا' اب وہ ایک ایسے مذہب کا سربراہ ہو گیا ہے' جو بالکل علامتی ہے اور جس کی حیثیت مذہب میں کوئی نہیں ہے۔ علم کی کمی اور اس کا بحران ہے۔ علم تبدیل ہوتا گیا۔ سب سے پہلے مذہبی لوگوں نے دنیاوی اور دینی علوم کو تقسیم کر دیا۔ تبلیغ والے کسی دکان پر جاتے ہیں کہ تم نے دنیا تو بہت کمالی' اب اللہ کی طرف چلو۔ کسی طالب علم کے پاس جاتے ہیں' یار سائنس تو تم پڑھتے رہے' اب اللہ کا علم پڑھو۔ آپ یہ تفریق کیسے قائم اور برقرار رکھے ہوئے ہیں؟ کون سا علم ہے' جو اللہ کا نہیں ہے؟ کیا علم ہے' جو خدا کی شناخت کو راہنمائی نہیں کرتا؟ کیا آئن سٹائن کی کائنات کی توسیع کی تھیوری خدا کی طرف راہنمائی نہیں کرتی؟ جب تک میں نے آئن سٹائن کو نہیں پڑھا تھا' مجھے **انا الموسعون** کا لفظ ہی سمجھ نہیں آ رہا تھا **والسماء بنینھا باید یھم** ہم نے آسمانوں کو اپنے زور بازو سے بنایا **وانا الموسعون** اور ہم ان کو وسیع تر کر رہے ہیں۔ آپ کو آئن سٹائن کے سوا کون اس آیت کا مطلب سمجھا سکتا ہے؟ وہ علم سے ناآگہی' علم کی تقسیم' شناخت کی تقسیم اور حصول علم میں سست ہونا کسی مسلمان کی فکرمندی نہیں۔ میں نے یورپ میں اور ادھر بھی دیکھا کہ خدا کی شناخت مسلمان کے پیش نظر نہیں۔ یہ سب زندگی کی سہولتوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

جب رسم و رواج خداوند جاہلوں کے ہاتھوں میں آئے گا' تو وہ اسی قسم کی باتیں کریں

گے۔ خدا نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ کسی نے خدا کے رسولؐ سے کہا کہ ہم تو صرف دنیا مانگیں گے۔ کسی نے کہا کہ ہم صرف آخرت مانگیں گے۔ اللہ نے کہا تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو ربنا اتنافی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار اس میں کچھ آپ کا بھی قصور ہے۔ آپ کا بہت بڑا قصور ہے کہ آپ نے عالم و بالغ ہونے کے باوجود قرآن و حدیث کو اُن پڑھ کے حوالے کر دیا۔ یہ آپ کا اور میرا قصور ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا قصور ہے۔ جو شخص میٹرک نہیں پاس کر سکا اور جس کے باپ نے اسے روٹی کھلانے کا واحد ذریعہ یہ سمجھا کہ اس کو حفظ کرا دیا جائے۔ آپ لوگ اپنی شناخت اور اپنے اعلیٰ ظرف تعقل کو تمام تر دنیا کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

آپ نے قطعاً قرآن، حدیث یا تفسیر کو وقت نہیں دیا۔ کوئی براہ راست مطالعہ ہے نہ کوئی وژن ہے۔ آپ کی مجبوری اب یہ ہوگی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی رسم کرانے کے لیے اس جاہل کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس نے آپ کو کیا دینا ہے؟ یہ آپ کی ذمہ داری تھی، جس کو آپ نے نظر انداز کیا۔ اس کو پتہ ہے کہ علم والا کون ہے، کون نہیں ہے۔ اگر آپ پڑھ لکھ کر کوئی بات کریں گے، تو اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ آپ کی تردید کر سکے۔ جب تک آپ خود نہیں پڑھتے، اس کی عمل داری اور سیادت قائم ہے۔ جب آپ خود پڑھیں گے اور اپنے بچوں کو خود علم دیں گے، تلقین کریں گے، تو اسلام میں کوئی چرچ نہیں اور ہمیں کسی چرچ کی ضرورت بھی نہیں۔ کیا دنیا میں اسماء الرجال سے بڑا علم کہیں موجود ہے؟

دس لاکھ انسانوں کے شجرۂ نسب اور ان کی تعلیمی غرض و غایت صرف اور صرف اسلام میں ہے۔ یہ ایک سلسلہ تحقیق موجود ہے، کیونکہ وہ لوگ بڑے سادہ سے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹیاں نہیں قائم کیں۔ تعلیم و جستجو اور ایک حدیث کی اصلاح کے لیے وہ ہزاروں دن کے سفر کرتے تھے۔ تین تین ہزار میل کا سفر امام بخاریؒ نے کیا ہے۔ آج بھی آپ دیکھ لیں کہ جو ذہانت ابوحنیفہ کی موجود ہے، موجودہ قانون دان میں وہ موجود نہیں ہے۔ وہ تعقل میں کسی سے کم نہیں تھے۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ آپ کا ایک چھوٹا سا سائنسدان آپ کو اسی رستے پر ڈال دیتا ہے، جس پر دنیا کا کوئی ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دماغ کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

خدا کا قانون اور مسلمان

یہ قرآن کی اس آیت کی تفسیر ہے کہ مکـروا و مکر الله و الله خیر الماکرین خدا آپ مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے۔ آپ اس سے مکر رہے ہیں۔ آپ کی ترجیحات کچھ اور ہیں۔ آپ اسے ایک ایسی حیثیت دیتے ہیں' جس میں آپ تمام دنیاوی طریقے پورے کرتے ہیں۔ پوری کوشش کرتے ہیں۔ جب کوئی اور طریقہ پورا نہ ہوا' ذہن میں آیا کہ ایک اللہ ہے' اس کو بھی آزمالو۔ ہم نے اسے بھی آزمالیا۔ کام ہوگیا' تو کہا' حیرت ہے' اللہ تو ہے۔ اگر کامیابی نہ ہوئی' تو کہا' اللہ دوی دیکھ لیا۔

پروردگار عالم آپ کے مکروفریب کو اچھی طرح جانتا ہے اور اس کو اچھی طرح علم ہے کہ میں اس وقت مسلمانوں میں ترجیح اوّل نہیں۔ خدا کا قانون تھرڈ ڈگری پر پڑا ہوا ہے۔ مسلمان کی کمٹمنٹ قطعاً خدا کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر آپ نے اللہ کو محض کسی ادارے کے رسمی سربراہ کے طور پر جانتا ہے' تو انی اعلم ماتبدون و ما تکتمون اس کو آپ دھوکہ نہیں دے سکتے۔ آپ اس کے ساتھ مکرودغا کرتے ہیں' تو وہ آپ کے ساتھ مکرو ذلت کر جاتا ہے۔ اس میں ہمارا قصور ہے' اللہ کا کوئی قصور نہیں۔ جس دن' ایک صاف ستھری کمٹمنٹ کے ساتھ مسلمان خدا کو پلٹے گا' اس دن دنیا کی کوئی طاقت مسلمان کو ذلت و رسوائی سے آشنا نہیں کرسکتی۔

اپنے آپ سے دُوری

کیا میں ان حالات سے مطمئن ہوں؟ خدا جانتا ہے کہ میں مطمئن نہیں ہوں۔ مسلمان کی توہین پر میں مطمئن نہیں ہوں۔ مسلمانوں کے زوال پر سخت مطمئن ہوں۔ ان کو جو مار پڑ رہی ہے' اس سے میرا دل باغ باغ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ حالات اور واقعات نہ ہوں' تو رسولؐ اللہ کا وعدہ مبارک ہم تک نہیں پہنچے گا۔ اگر ہم اس قسم کے حالات' عصر دجال' ذلت و رسوائی اسلام اور مسلمانوں کی دولت دنیا کے سراب سے نہ گزریں' تو ہم تک وہ وعدہ مبارک نہیں پہنچتا' جو رسولؐ اللہ نے ہمیں عطا فرمایا اور وہ وعدہ یہ ہے کہ میری اُمت رومیوں سے جنگ لڑے گی اور ان پر غالب آئے گی۔ ایرانیوں سے جنگ لڑے گی اور ان پر غالب آئے گی۔ میری اُمت ڈھال

والے چہروں سے جنگ کرے گی اور ان پر غالب آئے گی اور زمانہ آخر میں میری اُمت دجال سے جنگ کرے گی اور اس پر غالب آئے گی۔ تو مجھے آخر سے دلچسپی ہے۔ مجھے حالات کے بہاؤ سے دلچسپی نہیں ہے۔

اگر آپ چاہتے ہوں کہ رواں صورتحال مختصر ہو جائے۔ ذلت و رسوائی مسلمان کم ہو جائے' تو پھر عادات مسلمان اپنا لیجیے۔ آپ کو کون مسلمان کہے گا؟ ذرا ارد گرد اپنی عادات دیکھ لیجیے۔ یہ تو اللہ کے دوستانہ طریقے ہیں۔ دو اِدھر سے دو اُدھر سے مار پیٹ کر کے آپ کو سمجھانا چاہتا ہے۔ واپس لانا چاہتا ہے۔ کعبہ اور حقیقت کعبہ کو موڑنا چاہتا ہے۔ محمد رسول اللہ کی طرف پلٹانا چاہتا ہے۔ آپ پلٹتے ہی نہیں ہو۔ اللہ نے کہا ہے' تم نہیں پلٹو گے' میں نہیں پلٹوں گا۔ تم لوٹ آؤ گے' میں لوٹ آؤں گا۔ قرآن تو آپ نے بھی پڑھا ہے۔ لوٹو گے' تو لوٹے گا اور تم وہ لوگ نہیں ہو' جو آرام سے لوٹ پڑو۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم وہ لوگ نہیں ہیں' جو آرام سے لوٹ پڑیں۔ ہم تو اللہ کو سمجھتے ہی کچھ نہیں ہیں۔ جھوٹ بولنے میں' خیانت میں' بددیانتی میں' زمین کے غصب کرنے میں نہ حرام کھانے میں اللہ ہے۔ اللہ تو کھڑا ہی کہیں نہیں۔ پھر آپ کیا سمجھتے ہو' اس ایمان کو لے کے ان سچے کافروں سے جنگ کرو گے؟

کافر تو ہر چیز میں سچا ہے۔ کافر اپنے حقائق میں' آلات جنگ میں سچا ہے۔ اپنی تیاری میں اور حکومت میں سچا ہے۔ آپ امریکہ اور برطانیہ کی حکومت دیکھ لیں۔ ٹھیک ہے' ان کے باپ دادا کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ان میں شادیاں کوئی نہیں کرتا۔ وہ اسے گناہ نہیں سمجھتے' گناہ اس کو آپ سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے سسٹم میں سچے ہیں۔ اپنے سسٹم کی حفاظت کرتے ہیں۔ ٹیکس چوری نہیں کرتے۔ غریب کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے حقائق کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ حملہ آور ہونے سے پہلے ایک ایک تفصیل جمع کرتے ہیں۔ وہ حقائق کے علوم کے ماہرین ہیں۔

آپ کے پاس کیا ہے؟ مسلمان ہونا؟ یہ نام کی مسلمانی آپ کو اتنا طعنہ دے رہی ہے کہ آپ خدا سے بار بار فتح کی آرزو کرتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ اصلی بن جائیں گے' تو کیا ہو گا؟ ابھی نام کے مسلمان ہیں اور ہمارا یہ طعنہ ہے کہ روز مسلمان خدا سے گلہ کرتا ہے' کیا ہم اُمت رسول اللہ نہیں ہیں؟ ہمیں کیوں مار پڑ رہی ہے؟ ہم کیا مسلمان نہیں ہیں؟ تو کافر کو کیوں فتح دے رہا ہے؟ تھوڑا سا گریبان میں جھانکنے کی بات ہے۔ تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ گناہ رکھو' جیسے ہیں۔

خطا رکھیں۔ خطا کار کی توجہ اللہ کو بڑی عزیز ہے۔ ایک ہی کام پکڑ لو۔ رسم و رواج میں سے ہی خرابی دُور کر دیں۔ صرف اللہ کے لیے اور کسی دن اللہ کے لیے ایک لقمہ چھوڑ دیں۔ اللہ تیرے لیے آج ایک لقمہ چھوڑ رہا ہوں۔ کسی کو ایک لقمہ کھلا دیں۔ اللہ تیرے لیے ایک لقمہ کھلا رہا ہوں۔ کچھ عادات' کچھ عادات کا سوال محض اور محض خدا کے لیے کر دیں۔

ہر چیز اصل کو پلٹتی ہے اور مسلمان ابھی اصل کو نہیں پلٹ رہا۔ اقبالؒ ایک شعر میں کہہ گیا تھا کہ مسلمان بڑی عظیم قوم ہے۔ اس کی مثال ان پرندوں کی طرح ہے' جو روز دانا دنکا چگنے کے لیے دُور صحراؤں میں نکل جاتے ہیں۔ جب شام پڑی۔ عمر گریزاں ہوئی۔ خوف و خطر سے سامنا ہوا۔ شکاری جال لیے کھڑے نظر آئے اور یہ واپس پلٹے اپنے گھونسلوں کی تلاش میں۔ پھر پلٹے مدینہ اور مکہ کی تلاش میں۔ فرمایا کہ مسلمانوں کا عالم پلٹنے کا یہ ہے ؎

چو آں مرغے کہ صحرا ہر شام
کشائد پردۂ فکر آشیانہ

اس پرندے کی طرح جو شام کو اپنے آشیانے کی فکر کرتا ہے' پلٹتا ہے۔ ابھی میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمان اپنے آشیانے کی فکر نہیں کر رہا۔ بلکہ حال یہ ہے کہ ہمارے حکمران اپنے آشیانے دیارِ غیر میں بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس اُمت کو کیا اللہ میاں کی طرف پلٹنا ہے ہی نہیں؟

ان کے دو تعلیمی نظام ہیں۔ انگریزی طرز تعلیم میں ان کو پتہ نہیں کیا کیا انگریزی داستانیں اور قصے سنائے جاتے ہیں۔ ان کی تو ٹیوننگ ہی اور ہو گئی ہوتی ہے۔ ان کے مسائل مختلف ہو جاتے ہیں۔ وہ انگریزی بولتے ہوئے کہاں پنجابیوں اور پوٹھواریوں میں آ ملتے ہیں۔ ان میں شروع سے ہی احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں سسٹم آپس میں مل ہی نہیں سکتے۔ یہ سسٹم کام نہیں کر سکتے۔ ان کے ہاں کمٹمنٹ ہی ایک ہے کہ پڑھو لکھو' باہر جاؤ۔ کوئی ماں باپ ایسے نہیں ہیں' جو بچوں کو اس لیے یورپی سکولوں میں نہ پڑھاتے ہوں کہ پڑھیں گے۔ لکھیں گے۔ بڑی اچھی تعلیم حاصل کریں گے۔ ان شاءاللہ او لیول' اے لیول کرنے کے بعد اپنے ماں باپ کے ملک پہنچ جائیں گے۔ کوئی امریکہ چلا جائے گا۔ کوئی انگلینڈ چلا جائے گا۔ اللہ اللہ خیر سلا!

میں اداروں پر تنقید نہیں کر رہا۔ میں آپ کو سادہ سی بات بتا رہا ہوں کہ یہ ادارے آپ کو کوئی کمٹمنٹ نہیں دیتے۔ خدا کی نہ رسولؐ کی نہ بنیادی انسان ہونے کی۔ ان کے معیار اور

ان کی کمٹمنٹس ساری درآمد شدہ ہیں۔ وہ آپ کی نہیں ہیں۔ آپ کا اور ان کا کلچر اور ہے۔ آپ کے دو مبادیات ہیں' جو اس طریقۂ تعلیم میں موجود نہیں ہیں۔ آپ کا اور تمام مسلمانوں کا پہلا اور آخری عقیدہ خدائے واحد پر یقین ہے اور دوسرا بنیادی عقیدہ رسول اللہ سے اپنی جان سے زیادہ محبت ہے۔

آپ کے بدن سے روح محمدؐ نکالی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف غبی' کودن' اَن پڑھ ملائی نظام کا نمائندہ ہے' جس نے اَن پڑھ رہنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ جس نے جہالت سے عہد استوار باندھا ہے۔ اس کا نکاح ہی حماقت کے ساتھ ہے اور دوسری طرف پڑھا لکھا کہ جو کسی حال میں بھی آپ کا یہ سسٹم قبول نہیں کر سکتا۔ یہ مغائرت' یہ جدائی اور فتنہ و فساد اس ملک کے نظام تعلیم میں ہے اور یہ جب تک نہ سنورے گا۔ جب تک اس میں بہتر خیال' بہتر دلیل اور آپ کی کمٹمنٹ کے سبق نہ آئیں گے' اس نظام تعلیم میں کوئی خلا پر نہیں ہوگا۔ کوئی ایوبی پیدا نہیں ہوگا۔ اس میں وہی لوگ پیدا ہوں گے' جو کتوں کے منہ چاٹیں گے۔ بوتلوں کے ڈھکن اتار دیں گے اور نشوں میں قوموں کے فیصلے کریں گے۔

نظاموں میں فرق

سعودیہ میں بھی بنیادی طور پر مذہب کی قبائلی تعبیر ہے۔ جب ان کے مفاد اور قبائلی اغراض و مقاصد آ جاتے ہیں' تو وہ اس وقت مذہبی انصاف کو بے دریغ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر افغانستان میں مذہب ایک طرح سعودیہ ہی کا پرتو تھا۔ سعودیہ ہی کے زیر اثر ایک نیا تصور مذہب پروان چڑھ رہا تھا۔ سعودیہ میں پہلی دفعہ جو مذہبی مؤقف اختیار کیا گیا' اس میں محمد بن عبدالوہاب النجدی کی تحریک شامل تھی۔ اس کی نسبت اب وہاں زیادہ معقول روّیے ہیں۔ مگر اب بھی ان کی سوچ کا بڑا اٹھان اور پراسیس وہی ہے' جو آج سے پہلی حکومت کے وقت سعودی گورنمنٹ نے لیا تھا۔

ہمیں سعودی مذہب کے تصور کا دفاع کرتے ہوئے اب بھی مشکل محسوس ہوتی ہے۔ وہ بے پناہ وسائل کے مالک رہے ہیں۔ وہاں سے کوئی ایسا خصوصی انس باقی مسلم اُمہ کے لیے نہیں اٹھا۔ بلکہ بعض اوقات یہ ہوا کہ دانستہ امریکہ کے کہنے پر انہوں نے پاکستان کے ساتھ اپنے

تعلقات توڑے۔ ہمارے لوگوں کو بھی وہاں سے نکالا۔ غور کریں کہ ایک حقارت کی نظر ان کی باقی مسلمانوں پر ہے' جو ان سے مدد کے طلب گار رہتے ہیں۔ ان کا خلوص بھی کوئی ایسا نہیں نظر آتا کہ وہ اسلامی خلوص ہو۔ البتہ ایک قبیلہ ہے' جو حکمرانی کر رہا ہے۔ جس کی سہولت اسلام میں ہے۔

دہشت گرد' بنیاد پرست

مغرب کو سب سے بڑا خوف مسلمانوں سے یہ ہے کہ ان کی رواں بقا' دواں کلچر اور ترقی کا عظیم سلسلہ مسلمانوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ سب سے زیادہ بنیاد پرستانہ روّیہ ہمیں یورپ میں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یورپ کے نظام کا ایک عنصر جمہوریت ہے۔ مگر جمہوریت بھی ایک ایسا نظام ہے' جسے لوگ قبول کریں گے' تو نافذ کریں گے۔ فرض کیجیے' پاکستان کے بارہ کروڑ عوام مل کر یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جمہوریت نہیں چاہیے۔ ہم اسلام قبول کریں گے۔ یورپ آپ کو اس لیے بنیاد پرست کہے گا کہ آپ کی کیا مجال کہ آپ ہمارے سسٹم کو قبول نہ کریں۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ ضد اور سرکشی زیادہ ان لوگوں کے نظام میں ہے' جو اپنے آپ کو زیادہ مہذب کہتے ہیں۔

پڑھی لکھی ماؤں کے بچے زیادہ خراب ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مائیں اپنے پڑھے لکھے سنس اور تقابلی معیار سے اپنے معصوم بچوں پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈال دیتی ہیں۔ وہ اپنے مؤقف میں اتنی پکی ہو جاتی ہیں کہ اگر بچہ اتنی پراگریس شو نہ کرے' تو وہ قابل فہم طور پر ناراض ہوتی ہیں کہ میں اتنی زیادہ عقلمند اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تم میری بات نہیں سن رہے۔

یہی حال یورپ کے بنیاد پرستوں کا ہے۔ وہ نالائق اس بات پر اڑے ہوتے ہیں کہ یہ نالائق ہماری بات کیوں نہیں مانتے؟ یہ جمہوریت کو کیوں نہیں خدائی نظام سمجھتے؟ وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ جیسے انڈونیشیا یا کسی اور مسلم ملک کا سربراہ واشنگٹن جائے' تو وہ بڑے احترام سے امریکی صدر کو کہے' جناب! آپ تو ہمارے لیے سوغات ہیں۔ خدا کا بڑا کرم ہے کہ آپ پیدا ہوئے۔ آپ امریکہ کے صدر ہوئے۔ آپ نے ہمیں جمہوریت دی۔ ہم اس خوشی میں کہ آپ نے ہمیں جمہوریت دی' اسلام کے نظام کو نیست و نابود کر دیں گے کہ وہ تو بنیاد پرستانہ واہیات نظام ہے۔ اس پر سارے کا سارا یورپ کہ آپ نے ان کی انا کی تسکین کر دی' آپ سے خوش ہو جائے گا۔ ان

پڑھ کی انا اتنی مضبوط نہیں ہوتی، جتنی ایک پڑھے لکھے کی ہوتی ہے۔ تمام یورپ اپنے تمرد، سرکشی اور اپنی انا کا شکار ہے۔ ان کی خواندگی میں رواداری اور ان کی جمہوریت میں کوئی برداشت نہیں۔ اس لیے وہ آپ کو بنیاد پرست کہتے ہیں۔

مگر دوسری طرف ہم لوگ واقعی بنیاد پرست بھی ہیں۔ ہمارے جدید طبقے اور مذہبی افراد میں واضح طور پر اپروچ کا فرق ہے۔ اگر بازار میں جدید اور ایک نئی ایجاد آ گئی ہے، تو عام آدمی کو اس کے خریدنے میں کوئی حجاب نہیں۔ جیسے ڈسک یا ڈش ہے۔ عام آدمی اسے خریدنے میں کوئی تامل نہیں کرے گا۔ اس کے مقابلے میں مذہبی آدمی اسے برا بھلا کہے گا، جھٹلائے گا۔ دس سال اس کی مزاحمت کرے گا اور اس کے بعد اسے قبول کرے گا۔ برصغیر میں اس کی برمحل مثال لاؤڈ سپیکر کی ہے۔

اس قسم کے روّیے کو ہم یقیناً بنیاد پرستانہ روّیہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ علمائے کرام کی شان نہیں تھی۔ جبکہ ہمارے ہاں ایسے ایسے محقق گزرے ہیں، جیسے علامہ ابوریحان البیرونی، جو بارہ سال ہندومت اور جین کے مندر میں رہے اور تاریخ تحقیق ہند لکھی۔ ان مسلم اسکالرز کو دیکھیں کہ انہوں نے کتنا کتنا سفر ایک چھوٹے سے مسئلے کی خاطر کیا۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری نے تین ہزار میل کا سفر کیا۔ وہ سیکھنے کی انتہا، خواہش اور آرزو تھی کہ حضور گرامیؐ نے فرمایا، علم اگر اوج ثریا پر بھی ہوگا، تو ایک عجمی اسے اتارے گا۔ اب یہ حال ہے کہ علم گھر کی دہلیز پر رسوا ہو رہا ہے۔ سسک رہا ہے اور اسے کوئی اٹھا کے گلے سے نہیں لگاتا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے، تو کچھ یورپین ہمارے بارے میں رائے قائم کرنے میں اتنے غلط بھی نہیں ہیں۔ ہم میں بنیاد پرستانہ روّیہ موجود ہے، اگرچہ وہ ہم سے بڑے بنیاد پرست ہیں۔ وہ انائے علمیہ کے بنیاد پرست اور ہم انائے جاہلیہ کے بنیاد پرست ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہمیشہ دس، بیس، تیس سال مغربیوں کے مقابلے میں پیچھے ہیں۔ اگر ہمارا روّیہ صحیح ہو، تو ذہانت اور عقل پر گرفت کے اعتبار سے ہمارا مسلمان کسی حال میں بھی اہل مغرب سے پیچھے نہیں۔

ایک مثال دیتا ہوں کہ وہ لوگ جو جنیٹک میں کراس بریڈ نہیں ہوتے، وہ ان سے ہمیشہ کم تر ہوتے ہیں، جو کراس بریڈ ہوتے ہیں۔ برصغیر کا مائنڈ کراس بریڈ ہے۔ اس میں اعلیٰ ترین نسلوں نے آپس میں مکس کیا ہے۔ بنو حام، بنو سام اور بنو یافث یہاں ہیں۔ عقل و معرفت کے

حصول کا اعلیٰ ترین کمیشن اور بہترین دماغ یہاں پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارا روّیہ یہ ہے کہ ہمارا بنیادی عالم سیکھنے کی بجائے ذہنی پسماندگی کو رجوع کرتا ہے کل شی یرجع الی اصلہ کہ ہر چیز اپنے اصل کو رجوع کرتی ہے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ چونکہ ہماری اصل جہالت ہے' ہمیں اس طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حالانکہ ہمارا تعلق اس پیغمبر کے ساتھ ہے' جس نے کہا تھا کہ **طلب العلم ولو کان بالصین** جس نے کہا تھا **طالب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمات** حدیث تو یہ کہتی ہے' مگر افغانستان میں طالبان کے دَور میں اس کے برعکس لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی۔ خود سوچیے کہ بنیاد پرست کون ہے؟

دہشت گردی اور مسلمان

میرا یقین ہے کہ یہ ملا عبدالرحمٰن کے لوگ ہی ہوں گے۔ جس زمانے میں اس کی تذلیل ہوئی۔ رمزی کو ان کے ٹاورز کے نیچے لے جایا گیا۔ دونوں ٹاور دکھائے اور پھر اسے گالی دیتے ہوئے کہا کہ اے باسٹرڈ دیکھو! تم انہیں تباہ کرنے کے لیے آئے تھے' وہ ابھی تک قائم ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میرے پاس بارود تھوڑا تھا۔ اگلی مرتبہ شاید زیادہ ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت سے لوگوں نے ادھار لیا ہوا تھا۔ اسامہ نے ضرور بندوبست کیا ہو گا۔

دہشت گردی کے حوالے سے ناسٹرڈیمس نے بہت پہلے لکھ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ سفید پگڑی والا دہشت گرد ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔ اسامہ کو تو وہ پہلے سے بیان کر گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ پگڑی بھی سفید ہی پہنتا ہے۔ ناسٹرڈیمس نے بہت عرصہ پہلے یہ کہا تھا کہ مشرق کا وہ دہشت گرد ہے' جو سفید پگڑی اور عبا پہنے گا۔ مزے کی بات ہے کہ اس نے اس کا نام ہی دہشت گرد رکھا۔ ناسٹرڈیمس نے دونوں ٹاورز کی بھی بات کی۔

دہشت گرد اور مسلمان میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ ہم ایک قوم' ایک ملت کی طرح زندہ ہیں۔ غلطی سے ایک دفعہ حسین احمد مدنی نے کہا تھا کہ قومیں وطنیت سے بنتی ہیں' دین سے نہیں بنتیں۔ علامہ اقبالؒ کو اتنا شدید غصہ آیا کہ انہوں نے تین شعروں کی ایک غزل لکھی اور آخر میں کہا ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

کہ مسلمان ہو اور مصطفیٰؐ تک نہ پہنچے!

تو وہ جو عہد ہے' اس کے تمام معاملات میں مسلمانوں کی دو مبادیات ہیں۔ ایک مبادی تو ان کے پاس ہے' دوسری نہیں ہے۔ پوری دنیا کی مطبوعات دیکھ لیں کہ ایک مبادی تو تمام مسلمانوں میں مشترک ہے کہ وہ ایک خدا میں یقین رکھتے ہیں۔ مگر جو دوسرا فنڈامنٹل محبت رسولؐ ہے' اس کی جھلک مجھے پاکستان سے باہر نظر نہیں آتی۔ یہ کتنا ضروری ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ فاروق سے پوچھا' مجھ سے تمہیں کتنی محبت ہے؟ بخاری و مسلم کی حدیث ہے۔ فرمایا' یارسولؐ اللہ! آپ میری جان سے کم ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ فرمایا' عمرؓ ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک میں مسلمان کو اس کی جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔ فرمایا' یارسولؐ اللہ! آج کے بعد آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔

یہ دوسرا فنڈامنٹل صرف اس جگہ موجود ہے۔ جب میں باہر کے ماحول میں دوسرے اداروں کو دیکھتا ہوں' تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر پیغمبرؐ کی شان گھٹا کر پیش کر رہے ہیں۔ ہم الحمدللہ ہر دو مبادیات پر پورا اترتے ہیں۔ اس میں مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ چاہے زمانہ اِدھر یا اُدھر کا ہو' برصغیر کے مسلمانوں کی فتح یابی کے بارے میں حدیث رسولؐ ضرور پوری ہو گی۔

اسامہ اور خودکش حملے

اگر آپ اسامہ کے اثرات دیکھیں' تو اس کے بدترین اثرات قریباً تمام مسلمان ملکوں پر پڑے ہیں۔ یہ بن لادن کی بات نہیں۔ کوئی بھی شخص ایسے اقدامات کرے' جس سے جملہ مسلمین اور مومنین پر آفت آ جائے' تو اس کو کم از کم اسلام اپنا ہیرو نہیں سمجھتا۔ صرف افغانستان' پاکستان' عراق ہی نہیں' جہاں جہاں بھی اس شخص کے اثرات گئے ہیں' مسلمان جو کام آسانی سے کر رہے تھے' یا جو تھوڑا سا وقت مسلمان ملکوں کو چاہیے تھا اپنی تیاریوں کے لیے' وہ ایک دَم سے منجمد ہو گیا ہے۔ ہم مغرب کی کڑی نگرانی میں آ گئے ہیں۔ ایک امن سے جو کام ہم نے کرنا تھا' جسے ہو سکتا ہے' آپ اسے کریڈٹ دیں کہ اب وہی کام ہم ایمرجنسی میں کریں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس میں رئیسیت اور مال و دولت کی جو صفات بیان کی جاتی ہیں' ہو سکتا ہے' وہ کسی مسلمان ملک کے کسی ایسے سربراہ کے پاس آتا کہ تم سربراہ مملکت اسلامیہ ہو۔ میں تمہاری مدد کر دیتا ہوں کہ تم اس قابل ہو جاؤ' کوئی بڑی چیز بنا لو۔ میں نہیں سمجھتا کہ اسامہ بن لادن کی انفرادی وجاہت نے کسی بھی مسلمان ملک کو کوئی فائدہ پہنچایا ہے۔ ویسے بھی اسلام کا یہ قاعدہ نہیں ہے۔ اسلام کا القاعدہ نہیں ہے' بلکہ اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ انقلاب پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ اسلام ایک ارتقائی عمل کا نام ہے۔ اصحابِ رسول کو تیار کرنے میں اور ایک حکومت دنیا سنبھالنے میں بائیس برس لگے ہیں۔

اب فرض کیجیے' میرے گلی کوچوں سے ہزاروں آدمی نکلتے ہیں۔ ان کو دین کا کوئی پتہ

نہیں ہوتا۔ صرف ایک جہاد کی بنیاد کے عنوان پر انہیں استعمال کیا جا رہا ہے۔ مگر جہاد کیا ہے؟ رسولؐ نے فرمایا' جب سے میری اُمت میں جہاد شروع ہوا ہے۔ جب تک کہ میری اُمت کا ایک فرد یا گروہ دجال سے نہ لڑے گا اور فتح یاب نہ ہوگا۔ جب تک ظالم کا ظلم میری اُمت کا وہ فرد یا گروہ ختم نہ کرے گا اور جب تک انصاف نہ کرنے والوں کو انصاف پر آمادہ نہ کرے گا' یہ قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ حضورؐ کی حدیث جہاد کے متعلق ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ایک فتویٰ ہے کہ ہر وہ کوشش' جو اسلام یا اُمت مسلمہ کو خطرے میں ڈال دے' حرام ہے۔ خودکش حملے اسلامی نہیں ہیں۔ مگر ان کی وجوہ بجا ہیں۔ یہ مذہب کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتیں۔ تذلیل' نفرت و رسوائی اور اس استحصال کے تحت خودکش حملے ہو رہے ہیں' اسلام کے تحت نہیں ہو رہے۔ اسلام کسی دوسرے فاسق کو مانتا ہے نہ اپنے فاسق کو مانتا ہے۔ اس لیے اس قسم کی کوئی خودکشی اسلام کے ضمن میں نہیں آتی۔ مگر جب آپ ایک آدمی کو مارتے ہی جاؤ گے' تو زمانہ آئے گا' رسولؐ نے فرمایا' قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ پوچھا گیا' یا رسولؐ اللہ! مقتول کیوں؟ فرمایا' اس کے بس میں ہوتا' تو وہ بھی اسے مار دیتا۔

اب برصغیر میں سارا مسئلہ ٹینشن کا پڑا ہوا ہے۔ کسی ایک خودکش حملے کی وجہ سے ہے۔ اس قسم کے مسلمانوں کی کون تعریف کرے گا کہ خود تو اس نے مرنا ہی تھا' پیچھے پوری کی پوری قوم کو لے ڈوبے گا۔ اگر اس ایک حملے کی وجہ سے ایٹمی جنگ برصغیر میں چھڑ جائے اور ڈھائی کروڑ بندے مر جائیں' تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ سربیا کے ایک شہزادے کے قتل کے باعث دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور ہٹلر نے اس کا بہانہ بنا کر اتنی طویل جنگ چھیڑ دی۔

چنانچہ میرا خیال نہیں کہ اس کی سفارش کی جانی چاہیے۔ قومیں قوموں سے لڑتی ہیں اور ملتیں ملتوں سے لڑتی ہیں۔ ہم بھی لڑیں گے ان شاءاللہ تعالیٰ العزیز۔ ہمارے پاس بھی نبی اکرمؐ کے پیغامات موجود ہیں۔ مگر اس قسم کے لوگ ہماری ملت کی آگہی اور ترقی کو گھٹا رہے ہیں' بڑھا نہیں رہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہر آدمی خوفزدہ ہے۔ ہر شخص کی عزت نفس کو مجروح کیا جا رہا ہے۔ ہم میں سے ہر آدمی عدم تحفظ اور شک و شبہ کے احساس میں مبتلا ہے اور یہ صرف ان لوگوں کی وجہ سے ہو رہا ہے' جن کو مذہبی اور اخلاقی طور پر درست نہیں کہا جا سکتا۔

خودکش حملے، شرعی حیثیت

میرے نزدیک دہشت گرد خودکشی نہیں کرتا۔ دہشت گرد تکنیکی اعتبار سے اذیت پسند ہے، جو دوسرے کو اذیت دے کر اپنی کسی جبلی قتل و غارت کی حس کی تسکین کرتا ہے۔ وہ ایسے نہیں تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے، ایسے نہیں تھے۔ ان میں اذیت پسندی کا وہ عنصر پایا نہیں جاتا۔ مگر بلاشبہ اسلام کے پاس اس قسم کے اقدام سے بھی بہتر رستے ہیں۔ قوم پرستانہ توہین کے مراتب سے گذرتے ہوئے ان لوگوں کو اپنی قومی، ملی یا ذاتی ایسی توہین کا احساس ہوا کہ اس کے ردِعمل میں دشمن کو زک اور رنج دینے میں ہی انہوں نے اپنے توازن کو مناسب سمجھا اور اس میں اس نے اپنی جان دینے سے بھی گریز نہ کیا۔

بہرحال ہمارے پاس کوئی ایسی وجہ نہیں، جس سے ہم انہیں دہشت گرد کہہ سکیں۔ کیونکہ اس واقعہ کی اصل بنیاد وہ بے شمار دہشت گردی کے واقعات ہیں، جو ان کی یادداشت میں، انکی عزت و زندگی اور ان کے بال بچوں کے ناتے سے ان کی جگہ و مقام میں اتنے ہو چکے تھے کہ جس مرحلے پر آ کر انہوں نے اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ باقی مذہبی حوالے سے ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ میں اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

جہاد کے چند اصول

میں جہاد کا مطلق قائل ہوں۔ ہر لحہ زندگی کو جہاد سمجھتا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ ہر سانس جہاد ہے اور ذرا سی انگلی ہلانا بھی جہاد ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جب ہمیں ایک معروضی حقیقت سے واسطہ پڑتا ہے، تو میں ضرور کہتا ہوں کہ مجھے معجزوں کی توقع ہے۔ میں بھی آپ کی طرح خواب دیکھنے والا ہوں۔ محبت کے خواب۔ کرم اس کی بے پناہ اعانت اور فتح کے خواب۔

مگر جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ خدا نے اپنے انعام و اکرام کے لیے بھی چند اصول بنا رکھے ہیں۔ اگر ایک مسلمان قوم ان اصولوں سے روگردانی کرے گی، تو وہ ان پر اہل کفر کو مسلط کر دے گا۔ ایسے اہل کفر، جو اہل ایمان نہیں ہیں۔ لوٹ مار نہیں کرتے۔ آپس میں صلہ رحمی کرتے ہیں۔ جو ایک دوسرے کا دکھ سکھ بٹاتے ہیں، وہ اس مسلمان سے بہتر ہیں۔

جب منگولوں نے بغداد پر چڑھائی کی' تو اس وقت کے صوفی شیخ نجم الدین کبریٰ زندہ تھے۔ جب قتل وغارت اور تباہ کاری شروع ہوئی' تو لوگ ان کے پاس گئے اور کہا' شیخ! آپ کی دُعا کیوں نہیں قبول ہوئی؟ آپ امام زمانہ ہیں' ولی دوراں ہیں۔ آپ کی دعا کیوں نہیں قبول ہو رہی؟ فرمایا' میں نے ملائیکہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اے کافرو! مارو ان منافق مسلمانوں کو۔ یعنی ایک منافق مسلمان سے تقسیم کار میں ایک کافر بہتر ہے' جو چند اصولوں کا پابند ہے۔ جو کسی دیانت والا ہے۔ مگر منافق مسلمان خدا کا ہے نہ گھر کا' دھوبیوں کا ہو سکتا ہے۔

اب اس کی دوسری صورت سورۃ بقرہ میں ہے۔ ''خدا کی راہ میں نکلو خواہ ہلکے ہو یا بھاری'' ہلکے اور بھاری کی بات اسلحہ پر آئی ہے۔ چاہے آپ کے پاس ایک خنجر ہے۔ آپ کے پاس گھوڑا نہیں ہے۔ بدر اور اُحد میں ایسی صورتحال پیش آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ہلکے اور بھاری کی تخصیص فرمائی۔ بعض مسلمانوں کے پاس چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی صرف تلواریں تھیں۔ بعض مسلمانوں کے پاس گھوڑے تھے اور بھاری ہتھیار بھی تھے۔ دو آدمیوں کے پاس پوری زرہ بکتر سمیت سارا اسلحہ تھا۔ جبکہ باقی تمام مسلمان کسی نہ کسی اسلحہ کی کمی کا شکار تھے۔ کسی کے پاس تیر نہیں تھے۔ حتیٰ کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس جب تیر ختم ہو گئے' تو انہوں نے لکڑیاں لے لے کر ان کی نوکیں تراشیں اور وہی کافروں کے مارنی شروع کر دیں۔ سو ہلکے اور بھاری کا لفظ جو یہاں استعمال ہوا ہے' وہ سوار اور پیدل پر ہے۔

کشمیر اور جہاد

یہ انفرادی شخص پر جہاد کا فتویٰ لگے گا' کون کس نیت سے جہاد کر رہا ہے۔ کیونکہ بظاہر کسی بھی جماعت نے وہاں جہاد کا اس طرح اعلان نہیں کیا۔ کچھ لوگ قوم پرستانہ طریق سے لڑ رہے ہیں۔ کچھ صرف ہندو کی مخالفت یا کچھ لوگ مخصوص فوائد کی وجہ سے لڑ رہے ہیں۔ ان میں کوئی گروہ ضرور ہوگا' جو اللہ کی رضا کے لیے بھی لڑ رہا ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ کے پاس ہے کہ کون مجاہد ہے اور کون نہیں۔

شہید کی اقسام

شہید کی کوئی اقسام نہیں۔ ویسے شہادت کی اقسام ہیں۔ وہی شہید ہے' جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا شمشیر و سناں کے ساتھ شہید ہو جائے۔ البتہ شہادت کا اطلاق اور حیثیتوں پر بھی ہوتا ہے' جو بظاہر جنگ وجدل سے ماورا ہوتی ہیں۔ جیسے وہ آدمی' جو جہاد بالنفس کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ میدان قتال میں نہیں مرتے' ان کو بھی شہید کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح فقہ میں سات آٹھ قسمیں ایسی آئی ہیں' جیسے کوئی بیماری سے مرا۔ طاعون سے مرا' وغیرہ۔ ان پر بھی شہادت کا اطلاق ہوتا ہے۔ مگر جسے ہم شہید کہتے ہیں' عام طور پر وہی جانا جاتا ہے' جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا مارا جائے۔

قتال اور صحابہؓ

فیصلہ تو جج نے دینا ہے۔ خلافت راشدہ سے لے کر جو بھی آگے آیا' انکی نیات خلوص' ان کے معاملات اور ان کی زندگی کے واقعات پر میں توجہ نہیں ہوں۔ مگر آپ تاریخ میں ایک سند بھی نہیں نکال سکتے کہ کسی صحابیؓ نے کسی دوسرے صحابیؓ کو قتل کیا ہو۔ اگر کوئی واقعہ حادثاً ہو گیا ہو' تو میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن دانستہ کسی نے ایسا نہیں کیا۔ جو لوگ حقیقی مسلمان اور مذہبی ہیں' وہ ایسا نہیں کرتے۔ بہت سارے اس وقت کے لوگ اسلام کو گلہ دیتے ہیں کہ وہ آپس میں لڑے تھے۔ یہ بتایئے کہ کتنے لوگ رسولؐ اللہ کے زمانے میں تربیت حاصل کر پائے؟ جب بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے مسلمان ہونا شروع کیا' تو ان میں سے کتنوں کو وقت ملا تھا کہ وہ اسلام کی اقدار سے شناسائی اختیار کرتے؟ وہ صرف زبانی جمع خرچ والے مسلمان تھے۔ ان کی جبلتیں استوار نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے اخلاق و کردار ابھی اسلام کے سانچے میں نہیں ڈھلے تھے۔ ان لوگوں نے کیا بلند اخلاقی کا مظاہرہ کرنا تھا؟

مگر اصحاب رسولؐ نے ہر دور میں جب تک وہ زندہ رہے' اسی اخلاقِ کریمانہ کا مظاہرہ کیا' جیسے حضورؐ سے انہوں نے سیکھا تھا۔ حتیٰ کہ جنگ کے دو مخالف فریقین جب آپس میں ملتے ہیں۔ اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ اور علی کرم اللہ وجہہ' تو انتہائی احترام سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اجازت لے کر اُم المومنین کے حودج تک جاتے ہیں' جو کہ میدانِ جنگ میں بڑی عجیب بات ہے۔ یہ ساری ان کی خوبیاں تھیں۔ خرابیاں ہم جیسے مسلمانوں کی وجہ سے آئی ہیں۔

مسلمانانِ برصغیر، نسل خاص

دراصل میرے احساس میں یہ ہے کہ یہ ملغوبہ اذہان ہے۔ یہ دنیا کے بہترین اذہان کی آماجگاہ ہے۔ اس میں تاتاریوں کی سفاکی، آریان کی وجاہت طلبی اور عرب سیمرین خون بھی ہے۔ ایسا علاقہ جیسے پاکستان ہے، تحقیق کے مطابق اس میں تمام بڑی اقوام کے جینز موجودہ مغربی جنیٹک آرڈر سے کہیں طاقتور ہیں۔ جیسے تھارو بریڈ ہارس بڑا قیمتی گھوڑا ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ نے علم میں کوئی خاص ترقی نہیں کی، صرف ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے۔ اگر آپ کو ہنری شرڈ نے روشنی کی رفتار کا ایک قانون دیا تھا، یعنی بجلی کا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے، ہم اسے ڈسکوری نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ آلات کی ترقی ہے۔ ایک چیز جیسے لیزر کسی نے دریافت کی۔ اس پر کسی نے بہت کچھ تعمیر کیا۔ اس کو ہم علم نہیں کہیں گے۔

سو ٹیکنالوجی اور بنیادی علم میں بڑا فرق ہے۔ علم کا تو یہ حال ہے کہ ایک وقت تھا، جب آئن سٹائن نے آپ کو $E=MC^2$ دے دیا اور مادے سے توانائی کی تبدیلی کا نظریہ دیا۔ اس کا ایک حصہ تو تھوڑے دنوں میں پورا ہو گیا۔ دوسرا حصہ فیوژن والا آج تک ویسے ہی ہے۔ حالانکہ آئن سٹائن کو گذرے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ علم تو رینگتا ہے۔ ایک ایک اصول خدا کی مرضی سے کسی کے دل و دماغ پر پورا اترتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ مسلمان سائنسدان اور کسی دوسرے سائنسدان میں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہر چیز ویسی کی ویسی رہے اور ہم صحیح کمٹمنٹ والے ہوں۔ ہم اللہ کے

بندے ہوں۔ اس سے اپنی آگہی اور جستجو طلب کریں اور یہ چاہیں کہ خدا ہمیں دوسروں سے آگے بڑھائے اور اس کے سوا ہم کسی اور سے یہ طلب نہ کریں' تو ہمارا دماغ بھی ہے اور اللہ کی مدد بھی شامل ہو جائے' تو وہ یہ وعدہ کرتا ہے ولا تھنو کہ تم سستی نہ کرو لا تحزنو غم نہ کرو۔ کیونکہ یہ ڈیپریشن اور احساس کمتری کی سرزمین ہے وانتم الاعلون یقیناً تم کو غالب کروں گا ان کنتم مومنین اگر تم ایمان والے ہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہم قیادت کرنے والے لوگ ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا' جب ہندوستان میں مسلمان جہاد سے فارغ ہوں گے' تو شام میں مہدی کا ساتھ دیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں نہ صرف یہاں لڑنا ہے' ہمیں کہیں اور جگہ بھی جا کر جنگ کرنی ہے۔ ہم اللہ کے فضل و کرم سے لڑیں گے۔ ہم احمقوں اور اَن پڑھوں کی طرح نہیں لڑیں گے۔ ہم اپنے ذہن سے لڑیں گے۔ جسمانی اعتبار سے ہمارا ان کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ دو یا پانچ کروڑ یورپی ہمارا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ ہم ایک ارب مسلمان ہیں۔ اب اصول بدل گئے ہیں۔ کبھی ایک جنگ تھی' جو پہلے خندقوں کی جنگ ہوا کرتی تھی۔ اس کو رومیل نے متعارف کرایا۔ ایک تیز رفتار جنگ' ٹینکوں والی جنگ اور دشمن کی صفوں سے اس طرف لے جانے کے اصول دیئے' تو وہ تاریخ جنگ میں ایک معرکے کی طرح رہ گئے۔

اس کے بعد آئزن ہاور جیسے لوگ آئے' جنھوں نے میٹریل کی جنگ دی۔ بدقسمتی سے آپ اسامہ بن لادن کو ایک کریڈٹ دے سکتے ہیں کہ انہوں نے میٹریل کی جنگ میں انسانوں کی جنگ کو متعارف کروایا۔ اتنے بڑے بڑے ان کے کمپلیکس کھڑے ہیں اور ایک آدمی بم باندھ کر چلا جائے اور وہ انہیں اڑا دیتا ہے۔ یہ ایک بات اس کی وجہ سے ضرور ہوئی ہے۔ لیکن میں جو صاف ستھری جنگ اللہ کی مدد سے میدان میں جیتنا چاہتا ہوں' اسے میں اس قسم کے بم دھماکوں میں کیوں ڈھونڈوں۔ میں ان کے ذہن در ذہن اور دل در دل جنگ چاہتا ہوں۔ میں ایسی جنگ کیوں کروں' جس میں کروڑوں مسلمان ذلت اور رسوائی کی چادر میں سمٹ جائیں۔ ابھی ہم اس قابل نہیں ہوئے۔ ان کے ایک عمل کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑ رہی ہے۔

سب سے پہلے پاکستان

یہ سیکولر طرز فکر ہے۔ ہم مسلمانوں میں کوئی دوسرا نظریہ موثر اس لیے نہیں ہوسکتا کہ

بنیادی کمٹمنٹ جب آنز نہیں کی جاتی، تو کوئی دوسری کمٹمنٹ اتنی قابل لحاظ نہیں رہتی ۔ ہم معاشرے میں اگر دیکھیں، تو جو غیر اقوام ہم میں بستی ہیں ۔ مثلاً سکھ، ہندو، عیسائی وغیرہ، انہیں میں اپنے لوگوں سے زیادہ کام میں دیانتدار پاتا ہوں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کی جوابدہی بنیادی طور پر اللہ کے ساتھ نہیں ہے ۔ جب اللہ کے سامنے جوابدہی نہیں ہے، تو پھر ہم کسی کے سامنے بھی جوابدہ نہیں ہیں ۔ میں نے آج تک وہ ذہن، اچھا ذہن نہیں دیکھا، جو زمین کے ساتھ وابستہ ہو جائے یا درخت کے ساتھ وابستہ ہو جائے ۔ ہمیں وابستگی کے لیے نظریہ چاہیے اور وہ نظریہ ہمارے پیش نظر کم از کم اس وقت اسلام نہیں ہے ۔

پاکستان، آئندہ ہدف

نہیں ایسا نہیں ہوگا، ان شاء اللہ! پاکستان پر تحفظ اور امریکہ کی آنکھوں پر اندھے پن کی چادر ہے ۔ یہ نہیں ہوگا ۔ پاکستان اس لحاظ سے بڑا عجیب وغریب ملک ہے کہ جب بھی کسی تباہی کے بالکل کنارے پہنچتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کوئی عجیب وغریب بین الاقوامی صورتحال پیدا کر دیتا ہے اور پاکستان پھر سنور جاتا ہے، سنبھل جاتا ہے ۔

پروفیسر احمد رفیق اختر